معارف القرآن



14

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور



سورۃ القلم۔ تا۔۔ سورۃ المرسلات

جلد 14

تصنیف

استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبرز 0300-0321-9458876



☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ہال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ⑭

اپنی بات، از: مولانا محمود الرشید حدوٹی	٦	القارعہ اور الطاغیہ کا مفہوم	٥٥
القلم	٩	بے قابو طوفانی ہوا کی سرکشی	٥٧
نون اور قلم سے کیا مراد ہے؟	٩	قوم عاد، قوم ثمود، فرعون کا انجام	٥٩
آپ ﷺ مجنون نہیں	١٨	طوفان نوح علیہ السلام	٦٥
آپ ﷺ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر	٢١	قیامت کا ہولناک منظر	٦٧
نبی کریم ﷺ کے عالی اخلاق	٢٢	حاملین عرش کی تعداد	٦٨
اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فیصلہ	٢٥	قیامت کے دن پیشی	٦٩
غلط کار سے متأثر ہونے کی ضرورت نہیں	٢٧	جس کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملیگا	٧٠
کثرت مال واولاد پر گھمنڈ کی مذمت	٣٢	بد نصیب کا نامہ اعمال	٧٩
باغ والوں کا عبرت ناک قصہ	٣٤	جہنم میں ڈالنے کا حکم	٧٩
اُخروی باغات کے اصل حقدار	٣٩	جہنمی جہنم میں کیوں ڈالے جائیں گے؟	٨٢
منکرین سے چبھتا ہوا سوال	٤٠	دوستی یاری کا فقدان ہوگا	٨٢
جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی	٤١	عظمت قرآن کریم	٨٣
کافروں کو ڈھیل اور پھر شکنجہ سخت	٤٣	المعارج	٨٦
تبلیغ کا معاوضہ نہیں تو مخالفت کیوں؟	٤٤	مطالبہ عذاب اور یوم الحشر کی مقدار	٨٦
دعوت وتبلیغ پر صبر کی تلقین	٤٥	روز محشر قریب یا بعید	٩١
نظر بد کی تاثیر	٤٧	ہولناک دن، خوفناک منظر	٩٢
الحاقہ	٥٣	نمازیوں کی عمدہ صفات	٩٦
قیامت ایک حقیقت ہے	٥٣	کافروں کا طرز عمل اور جنت کا لالچ	١٠٠

اللہ قادر ہے عاجز نہیں	۱۰۲	جنات کیسے سر چڑھے؟	۱۳۷
سرکشوں کے لیے ڈھیل	۱۰۴	بعثت سے کیا مراد ہے؟	۱۳۹
نوح	۱۰۶	جنات آسمانوں سے خبریں نہیں لاسکتے	۱۴۰
عبادت، تقویٰ اور اطاعت کا فائدہ	۱۰۶	جنات غیب دان نہیں، مسلمان یا کافر؟	۱۴۳
دعوت نوح اور اس کا سخت ترین رد عمل	۱۰۷	اللہ کو کوئی عاجز نہیں کر سکتا	۱۴۵
توبہ اور استغفار کے فوائد	۱۰۸	مسلمان اور ظالم کا انجام	۱۴۷
اللہ کی عظمت سے بے خوفی	۱۰۹	سیدھی راہ چلنے کا فائدہ، نہ چلنے کا نقصان	۱۴۹
تخلیق انسانی کے مختلف مراحل	۱۱۲	مسجدوں میں غیر اللہ کو نہ پکارو	۱۵۴
آسمانوں، سورج اور چاند کی تخلیق	۱۱۳	علم الغیب، اطلاع غیب	۱۶۵
بعث بعد الموت تک کے مراحل	۱۱۵	المزمل	۱۸۵
فرش زمین بچھانے کا مقصد	۱۱۶	چادر اوڑھنے والے	۱۸۵
عصر نوح میں پنجتن کی پوجا	۱۱۷	نماز تہجد اور ترتیل قرآن کا حکم	۱۹۰
ودبت کا تذکرہ	۱۲۲	المدثر	۲۵۲
سواع، یغوث، یعوق بت کا ذکر	۱۲۳	تاج رسالت	۲۵۲
قوم نوح کو سزا کیوں دی گئی؟	۱۲۴	القیامہ:::::::قسم وجواب قسم	۲۹۳
دعائے نوح اور قوم کی ہلاکت	۱۲۵	الانسان	۳۲۶
کن لوگوں کے خلاف دعا جائز ہے؟	۱۲۸	اے انسان ذرا اپنے فرائض پہچان	۳۲۶
الجن	۱۳۴	المرسلات	۳۳۶
جب جنات نے قرآن کریم سنا	۱۳۴	فرشتوں اور ہواؤں کی قسمیں	۳۳۶

اپنی بات

قارئین محترم! بندہ عاجز و مسکین (حدوٹی) کی طرف سے اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں پیش کی جانے والی سوالی جوابی تفسیر کی یہ چودھویں جلد ہے، واقفان حال کا کہنا ہے کہ فی الحال روئے زمین پر اردو زبان میں اس اسلوب نگارش میں پیش کی جانے والی یہ اپنی نوعیت کی منفرد اور اکلوتی تفسیر ہے، متقدمین میں سے کسی نے یہ اسلوب اختیار نہیں کیا اور اس گئے گزرے دور میں اس فقیر کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بخشی ہے، گویا کہ سوالی جوابی شکل میں یہ پہلی تفسیر ہے۔

جب یہ بات نوک قلم سے تحریر کی جاتی ہے کہ یہ تفسیر اپنے اسلوب نگارش کے لحاظ سے منفرد و یگانہ ہے تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں، واللہ باللہ تاللہ علی اللہ اس کا مقصد یہ بالکل نہیں کہ راقم اثیم نے کہیں مجتہدانہ تفسیر تحریر کرنا شروع کی ہے، نہ بالکل نہیں، اس کی سطر سطر، اس کا صفحہ صفحہ بولتا ہے بلکہ چیخ چیخ کر دہائی دیتا ہے کہ یہ جو کچھ آپ کی خدمت عالیہ میں بصد ادب واحترام پیش کیا جاتا ہے۔

یہ انہی اکابرین کے دروازوں سے ملنے والی علمی خیرات ہے، یہ انہی کے صحن چمن سے ملنے والے پھول ہیں، یہ انہی کی آہ سحر گائیوں کا ثمرہ ہے، یہ انہی کی کاوشوں اور جانفشانیوں کا صلہ ہے جو انہوں نے اپنی ساری زندگیاں قرآن وسنت کے لیے کھپا کر ہماری آغوش فقر میں منتقل کیں، اس میں اپنے مجتہدانہ خیالات اور میری رائے کی گردان بالکل نہیں ہے، اس میں راقم نے جو بھی جملہ لکھا ہے تو یہی عرض کیا کہ میرے فلاں بزرگ نے یوں لکھا ہے، میرے فلاں حضرت نے یوں تحریر فرمایا ہے، حوالے ساتھ ساتھ موجود ہیں، جہاں سے چیز اٹھائی گئی اس جگہ اور مقام کا نام بھی بصد ادب عرض کر دیا گیا ہے۔

اس وقت میری ڈی جیٹل لائبریری میں وہ تمام تفاسیر دستیاب ہیں جو عربی زبان میں اہل علم و کمال نے تحریر کیں، اسی طرح اردو جیسی لشکری زبان میں لکھی جانے والی تقریباً تمامی تفاسیر میری لائبریری

میں موجود ہیں، اس لحاظ سے میرا دامن علمی ذخیرے سے مالا مال ہے، میں ان سب اہل علم و کمال کا خوشہ چین ہوں، ان کے دستر خوان علم کا ریزہ چین ہوں، ان کے لیے دعائیں ہر بن مو سے نکل رہی ہیں، جنہوں نے ہمارے دامن کو علمی سوغات سے سیر اب کیا۔

اس تفسیر کے نقوش مرتب کرنے میں اس عاجز و مسکین بندے نے عربی کی بڑی بڑی تفاسیر کی زیارت کرلی ہے، اردو زبان میں زیور طباعت سے آراستہ ہونے والی تفاسیر کو دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا رہا ہے، اپنے جلیل القدر مفسرین کرام کی نگارشات سے مستفید اور لطف اندوز ہونے کی سعادتیں سمیٹی ہیں۔ وللہ الحمد

اگست ۲۰۱۵ء میں اس سفر سعادت کا آغاز ہوا تھا، اسی سال اس کی پہلی جلد پایہ تکمیل کو پہنچی تھی، پھر ۲۰۱۶ء میں تین جلدیں پیش کی گئیں، اسی طرح ۲۰۱۷ء میں بھی تین جلدیں پیش کی گئیں، ۲۰۱۸ء کے چوتھے مہینے میں تفسیر کی آٹھویں جلد پایہ تکمیل کو پہنچی، دسمبر ۲۰۱۸ء کے اختتام تک معارف الفرقان کی بارہ جلدیں مکمل ہوئیں اور زیور طباعت سے بھی آراستہ ہو گئیں، الحمد للہ علی ذالک۔

اس وقت میرے کرم فرماؤں کے سامنے معارف الفرقان کی چودھویں جلد ہے، جو سابقہ جلدوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مواد سمیٹے ہوئے ہے، گزشتہ کے مقابلے میں اس کے صفحات بھی زیادہ ہیں۔

میں اپنی تفسیر اور اپنی تحریریں پڑھنے والے سعادت مند بہن بھائیوں سے ایک عاجزانہ، برادرانہ، دوستانہ درخواست تو کر ہی سکتا ہوں اور یہ میرا حق بھی ہے کہ وہ اپنی نیک دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں، چونکہ میں نے اپنی زندگی کا نشیب و فراز، اوڑھنا بچھونا اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر شبانہ روز ایک کرنے کو قرار دیا ہے، اتنا بڑا فیصلہ عملی جامہ کیسے پہنائے گا ادعیہ صالحہ کے بغیر۔

رب تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں مجھے یقین ہے کہ وہ اس فقیر کے دست حقیر سے تحریر کی گئی اس متواضع تفسیر کو قبول فرما کر اس کی فلاح دنیوی واخروی کا ذریعہ بنائے گا، اس کی بارگاہ میں مایوسی تو ہے

ہی نہیں کیونکہ وہ گبر وتر سا پر رحم کرتا ہے اور انہیں ہدایت کی دولت دے کر ابد الآباد کی جنت کا حقدار بنادیتا ہے۔

میرے خیالات اور ارادوں کی جلد تکمیل ہو جاتی تو یہ تفسیر ایک سال پہلے تکمیل کے مراحل طے کرلیتی، مگر میرے قادروقدیر ومقتدر رب کی چاہت شاید ابھی اس کی تکمیل نہیں کررہی تھی، چونکہ اسباب ووسائل کی دستیابی کے باوجود اس کے علاوہ بھی کچھ خیر ونیکی کے کام میری ذمہ داریوں میں شامل ہیں، جمعۃ المبارک کا خطبہ، مدرسہ کی ہلکی پھلکی ذمہ داریاں، دینی پروگراموں میں کہیں کہیں شرکت، اس کے علاوہ باقاعدگی سے ماہ نامہ آب حیات، ماہ نامہ تحفہ خواتین، ماہ نامہ شاندار اور ماہ نامہ صدائے جمعیت کی اشاعت بھی ہے، ان رسائل کی ادارت، طباعت، نشر واشاعت یہ سب اس فقیر کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، پھر تفسیر کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی وقت میں برکت دینے والا ہے۔

خادم اسلام

محمود الرشید عفا اللہ عنہ حدوٹی

حال وارد حدوٹ، مری

۱۷ اگست ۲۰۱۹ء بروز بدھ، بوقت ساڑھے ۴ بجے وقت الفجر

القلم

نون اور قلم سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قلم سے لکھتے ہیں ان سے کون مراد ہیں؟

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ{۱} القلم.

جواب ترجمہ: ن (اے پیغمبر) قسم ہے قلم کی، اور اس چیز کی جو وہ لکھ رہے ہیں۔

سورۃ القلم کے شروع میں حرف "ن" ہے، یہ حرف حروف مقطعات میں سے ہے، حروف مقطعات کئی سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اپنے اپنے انداز میں ان پر بحث کی ہے۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حُوتٌ عَظِيمٌ عَلَى تَيَّارِ الْمَاءِ الْعَظِيمِ الْمُحِيطِ، وَهُوَ حَامِلٌ لِلْأَرَضِينَ السَّبْعِ یہاں "ن" سے مراد وہ بڑی مچھلی ہے جو ایک محیط عالم پانی پر ہے جو ساتوں زمینوں کو اٹھائے ہوئے ہے۔ (ابو جعفر بن جریر)

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ قَالَ: اُكْتُبْ. قَالَ: وَمَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَجَرَى بِمَا يَكُونُ مِنْ ذَلِكَ الْيَوْمِ إِلَى يَوْمِ قِيَامِ السَّاعَةِ. ثُمَّ خَلَقَ "النُّونَ" وَرَفَعَ بُخَارَ الْمَاءِ، فَفُتِقَتْ مِنْهُ السَّمَاءُ، وَبُسِطَتِ الْأَرْضُ عَلَى ظَهْرِ النُّونِ، فَاضْطَرَبَ النُّونُ فَمَادَتِ الْأَرْضُ، فَأُثْبِتَتْ بِالْجِبَالِ، فَإِنَّهَا لَتَفْخَرُ عَلَى الْأَرْضِ (طبری ج۹ ص۲۹، تفسیر ابن کثیر)

سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ لکھ اس نے عرض کیا کیا لکھوں؟ فرمایا

تقدیر لکھ، پس اس دن سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس پر قلم جاری ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے مچھلی پیدا کی اور پانی کے بخارات بلند کئے، جس سے آسمان بنے اور زمین کو اس مچھلی کی پیٹھ پر رکھا مچھلی نے حرکت کی جس سے زمین بھی ہلنے لگی پھر زمین پر پہاڑ گاڑ کر اسے مضبوط اور ساکن کر دیا، پہاڑ زمین پر فخر کرتے رہیں گے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ن والقلم ومایسطرون کی تلاوت فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں "ن" سے مراد یہ مچھلی ہے۔

تفسیر طبری اور ابن جریر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَ رَبِّي، عَزَّ وَجَلَّ، الْقَلَمُ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: اكْتُبْ. فَكَتَبَ مَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ. ثُمَّ خَلَقَ "النُّونَ" فَوْقَ الْمَاءِ، ثُمَّ كَبَسَ الأرض عليه (تفسیر طبری، ابن کثیر) سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا پھر اسے حکم دیا کہ لکھ، پھر اس نے قیامت تک ہونے والی چیزیں لکھیں، پھر مچھلی کو پانی پر پیدا کیا، پھر زمین کو مچھلی پر رکھ دیا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سورۃ کی پہلی آیت تلاوت کی، پس نون سے مراد یہ مچھلی ہے اور قلم سے مراد یہ قلم ہے۔

طبرانی کی معجم کبیر میں ایک مرفوع روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمُ وَالْحُوتُ، قَالَ لِلْقَلَمِ: اكْتُبْ، قَالَ: مَا أَكْتُبُ، قَالَ: كُلَّ شَيْءٍ كَائِنٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ". ثُمَّ قَرَأَ: {ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ} فَالنُّونُ: الْحُوتُ. وَالْقَلَمُ: الْقَلَمُ (معجم کبیر طبرانی) سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم اور مچھلی کو پیدا فرمایا، پھر قلم کو حکم دیا کہ لکھ، اس نے پوچھا کہ کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت تک ہونے والی ہر چیز لکھ، پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ن والقلم ومایسطرون تلاوت کی، پس یہاں "ن" سے مراد مچھلی ہے اور قلم سے مراد قلم ہی ہے۔

ابن عساکر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے

إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ الْقَلَمَ، ثُمَّ خَلَقَ "النُّونَ" وَهِيَ: الدَّوَاةُ. ثُمَّ قَالَ لَهُ: اكْتُبْ. قَالَ وَمَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: اكْتُبْ مَا يَكُونُ أَوْ: مَا هُوَ كَائِنٌ مِنْ عَمَلٍ أَوْ رِزْقٍ أَوْ أَثَرٍ أَوْ أَجَلٍ. فَكَتَبَ ذٰلِكَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ: {ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ} ثُمَّ خَتَمَ عَلَى الْقَلَمِ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ خَلَقَ الْعَقْلَ وَقَالَ: وَعِزَّتِي لَأُكَمِّلَنَّكَ فِيمَنْ أَحْبَبْتُ، وَلَأُنْقِصَنَّكَ مِمَّنْ أَبْغَضْتُ (ابن عساکر، تاریخ دمشق ج۷۱ص ۴۹۲، اتحاف السادۃ المتقین لحکیم ترمذی ج۱ص ۴۵۴، ابن کثیر)

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا پھر نون یعنی دوات کو، پھر قلم سے فرمایا لکھ اس نے پوچھا کیا لکھوں؟ فرمایا جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے عمل، رزق عمر، موت وغیرہ، پس قلم نے سب کچھ لکھ لیا۔ اس آیت میں یہی مراد ہے، پھر قلم پر مہر لگا دی اب وہ قیامت تک نہ چلے گا، پھر عقل کو پیدا کیا اور فرمایا مجھے اپنی عزت کی قسم! اپنے دوستوں میں تو میں تجھے کمال تک پہنچاؤں گا اور اپنے دشمنوں میں تجھے ناقص رکھوں گا۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ "ن" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ كَانَ يُقَالُ: النُّونُ: الْحُوتُ [الْعَظِيمُ] الَّذِي تَحْتَ الْأَرْضِ السَّابِعَةِ یہ مشہور تھا کہ "نون" سے مراد وہ بڑی مچھلی ہے جو ساتویں زمین کے نیچے ہے۔

مفسر قرآن امام بغوی رحمہ اللہ اور حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ

إِنَّ عَلَى ظَهْرِ هٰذَا الْحُوتِ صَخْرَةً سمكها كغلظ السموات وَالْأَرْضِ، وَعَلَى ظَهْرِهَا ثَوْرٌ لَهُ أَرْبَعُونَ أَلْفَ قَرْنٍ، وَعَلَى مَتْنِهِ الْأَرَضُونَ السَّبْعُ وَمَا فِيهِنَّ وَمَا بَيْنَهُنَّ (معالم التنزیل)

اس مچھلی کی پیٹھ پر ایک چٹان ہے جس کی موٹائی آسمان وزمین کے برابر ہے اس پر ایک بیل ہے جس کے چالیس ہزار سینگ ہیں اس کی پیٹھ پر ساتوں زمینیں اور ان پر تمام مخلوق ہے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں یہ روایت نقل فرمائی ہے، پھر اس کے آخر میں واللہ اعلم فرمایا ہے، مگر اس روایت پر تفسیر ابن کثیر کے حاشیہ میں بحث کی گئی ہے، اسے اسرائیلیات میں سے بتایا گیا ہے، اس روایت کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے اور موضوعات میں سے ہے، محدثین نے اس طرح کی روایات پر کلام کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تعجب تو یہ ہے کہ ان بعض مفسرین رحمہم اللہ نے اس حدیث کو بھی اسی معنیٰ پر محمول کیا ہے جو مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ جب حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آگئے ہیں تو وہ آپ کے پاس آئے اور بہت کچھ سوالات کئے کہا کہ میں وہ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جنہیں نبیوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا بتایئے قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ اور جنتیوں کا پہلا کھانا کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ کبھی بچہ اپنے باپ کی صورت میں ہوتا ہے کبھی ماں کی صورت پر؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ باتیں ابھی ابھی جبریل نے مجھے بتادیں، ابن سلام کہنے لگے فرشتوں میں سے یہی فرشتہ ہے جو یہودیوں کا دشمن ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو! قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ کا نکلنا ہے جو لوگوں کو مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف لے جائے گی اور جنتیوں کا پہلا کھانا مچھلی کی کلیجی کی زیادتی ہے اور مرد کا پانی عورت کے پانی پر سابق آجائے تو لڑکا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت کر جائے تو وہی کھینچ لیتی ہے۔

دوسری حدیث میں اتنی زیادتی ہے کہ پوچھا جنتیوں کے اس کھانے کے بعد انہیں کیا ملے گا فرمایا جنتی بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت میں چرتا چگتا رہا تھا، پوچھا انہیں پانی کونسا ملے گا؟ فرمایا سلسبیل نامی نہر کا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد "ن" سے نور کی تختی ہے۔

ایک مرسل غریب حدیث میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ لَوْحٌ مِنْ نُورٍ، وَقَلَمٌ مِنْ نُورٍ، يَجْرِي بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اس سے مراد نور کی تختی اور نور کا قلم

ہے جو قیامت تک کے حال پر چل چکا ہے۔

علامہ ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں أُخْبِرْتُ أَنَّ ذَلِكَ الْقَلَمَ مِنْ نُورٍ طُولُهُ مِائَةُ عَامٍ، مجھے خبر دی گئی ہے کہ یہ نورانی قلم سو سال کی طولانی رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "ن" سے مراد دوات ہے اور قلم سے مراد قلم ہے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔(ابن کثیر) ایک بہت ہی غریب مرفوع حدیث میں بھی یہ مروی ہے جو ابن ابی حاتم میں ہے کہ اللہ نے نون کو پیدا کیا اور وہ دوات ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نون یعنی دوات کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا، پھر فرمایا "لکھ" اس نے پوچھا "کیا لکھوں؟" فرمایا "لکھ" اس نے پوچھا "کیا لکھوں؟" جو قیامت تک ہونے والا ہے، اعمال خواہ نیک ہوں خواہ بد، روزی خواہ حلال ہو خواہ حرام، پھر یہ بھی کہ کونسی چیز دنیا میں کب جائے گی کس قدر رہے گی، کیسے نکلے گی، پھر اللہ تعالیٰ نے بندوں پر محافظ فرشتے مقرر کئے اور کتاب پر داروغے مقرر کئے، محافظ فرشتے ہر دن ان کے عمل خازن فرشتوں سے دریافت کر کے لکھ لیتے ہیں جب رزق ختم ہو جاتا ہے عمر پوری ہو جاتی ہے اجل آ پہنچتی ہے تو محافظ فرشتے داروغہ فرشتوں کے پاس آ کر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ آج کے دن کیا سامان ہے؟ وہ کہتے ہیں بس اس شخص کے لئے ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا یہ سن کر یہ فرشتے نیچے اترتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ مر گیا اس بیان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم تو عرب ہو کیا تم نے قرآن میں محافظ فرشتوں کی بابت یہ نہیں پڑھا {إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ} [الْجَاثِيَةِ: ۲۹] مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے اعمال کو اصل سے نقل کر لیا کرتے تھے۔

بظاہر مراد یہاں عام قلم ہے جس سے لکھا جاتا ہے جیسے اور جگہ فرمان عالیشان ہے، (الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق: ۴) یعنی اس اللہ نے قلم سے لکھنا سکھایا، پس اس کی قسم کھا کر اس بات پر آگاہی کی جاتی ہے کہ مخلوق پر میری ایک نعمت یہ بھی ہے کہ میں نے انہیں لکھنا سکھایا جس سے علوم

تک ان کی رسائی ہو سکے، اس لئے اس کے بعد فرمایا نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (القلم :۱) یعنی اس چیز کی قسم جو لکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَمَا يَكْتُبُوْنَ یسطرون سے مراد یہ ہے جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یسطرون کا معنیٰ یعملون بھی بیان ہوا ہے، جس کا معنیٰ ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں يَعْنِي الْمَلَائِكَةَ وَمَا تَكْتُبُ مِنْ أَعْمَالِ الْعِبَادِ اس سے مراد فرشتوں کا لکھنا ہے جو بندوں کے اعمال لکھتے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین کرام رحمہم اللہ کہتے ہیں، بَلِ الْمُرَادُ هَاهُنَا بِالْقَلَمِ الَّذِي أَجْرَاهُ اللّٰهُ بِالْقَدَرِ حِينَ كَتَبَ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبلَ أَن يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرَضِينَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ. اس سے مراد وہ قلم ہے جو قدرتی طور پر چلا اور تقدیریں لکھیں آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے اور اس قول کی دلیل میں یہ جماعت وہ حدیثیں لائی ہے جو قلم کے ذکر میں مروی ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر لکھا گیا۔

قلم کی اہمیت وافادیت: قلم کی اہمیت سے کسی دور میں بھی انکار نہیں کیا گیا، قلم علم ودانش اور تہذیب انسانی کے ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ جنگلوں اور غاروں میں بسنے والا انسان قلم ہی کی بدولت وحشیانہ زندگی کے خول سے نکل کر مہذب دور میں داخل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی پہلی وحی کے اندر قلم کا ذکر فرما کر اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ پہلی وحی کی پہلی آیت میں ارشاد ہے ”جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا“ صرف یہی نہیں بلکہ یہاں سورۃ ن والقلم میں تو قسم کھا کر قلم کی اہمیت وعظمت کو چار چاند لگائے گئے ہیں۔ قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں۔

قرآن کریم جب نازل ہوا تو اس کو قلم کے ذریعے لکھ کر ہی محفوظ کیا گیا۔ رب تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا، پھر اس کی حفاظت کے لیے اس نے ایک تو انسانی قلوب اور دوسری طرف

قلم کو ذریعہ بنایا، انسانوں نے جدوجہد کرتے ہوئے، مشقت اٹھاتے ہوئے، دن رات اسے یاد کیا اور قلم ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود قرآن مجید آج بھی اسی حالت میں موجود ہے جس حالت میں یہ نازل ہوا تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں بڑے بڑے بادشاہوں کو قلم کے استعمال سے ہی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ قلم نے ہی قلم کار پیدا کیے جو قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں، قلم کار ہی کی بدولت تاریخ زندہ ہے۔ معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اٹھا ہوا قلم قوموں کی تقدیر بدلنے میں کردار ادا کر سکتا ہے۔ قلم کو جہاد کے ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

لغوی اعتبار سے ''قلم'' کا معنی کاٹنا یا تراشنا ہے۔ اور یہ بات عمومی تجربات میں آئی ہے کہ تراشنے، کاٹنے اور سنوارنے سے ہی کوئی چیز قابل استعمال ہوتی ہے اور حسن و جمال کا روپ دھارتی ہے۔

علوم انسانی بھی پانچ حواس سے حاصل شدہ معلومات، مشاہدات اور تجزیات کی تراشیدہ شکلوں سے معرض وجود میں آتے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے قابل فہم ہو کر بہتر انسانی زندگی کی ضمانت بن سکتے ہیں۔

حاصل شدہ معلومات، مشاہدے اور تجزیے کو بعد میں دوسرے انسانوں کے پڑھنے کے لائق بنانے کے لیے ہم انسان لسانی، تکنیکی اور ابلاغی مہارتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ زبان بیانی، حسابی علم، ڈرائنگ وغیرہ ایسی ہی مہارتیں ہیں۔ لہٰذا ''قلم'' اس کامل اور قابلِ فہم تجزیاتی صلاحیت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی مادی یا غیر مادی شے کے منفی یا مثبت پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے اور قلم اس مادی شے کا بھی نام ہے، جس سے عموماً لفظوں کو تحریری شکل دی جاتی ہے۔

بھارتی راجدھانی سے ایک سہ روزہ اخبار "دعوت" کے نام سے شائع ہوتا ہے، جس میں قلم کی حرمت اور اہمیت سے متعلق چند سال پہلے ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں بڑے کام کی باتیں بیان

کی گئی ہیں، جی چاہتا ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں بلا کم وکاست پیش کر دوں، لیجیے مطالعہ فرمایئے، اس مضمون کا آغاز پاکستان کے مشہور صحافی جناب شورش کاشمیری مرحوم کے اشعار سے ہوتا ہے

کانپتے ہیں اس کی ہیبت سے سلاطین زمن دبدبہ فرمان رواؤں پر بٹھاتا ہے قلم
صفحہ کاغذ پر جب موتی لٹاتا ہے قلم نُدرت افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم

محمد سلیم ندوی بلگامی قلم کی کہانی قلم کی زبانی لکھتے ہیں کہ ”میرا نام قلم ہے، مجھے ہر انسان اپنی بولی اور زبان میں جدا جدا الفاظ سے یاد کرتا ہے، میرے خالق نے مجھے اپنی آخری کتاب میں لفظ ”قلم“ سے یاد فرمایا ہے۔ (القلم ا۔ العلق ۴، سہ روزہ دعوت دہلی ۲۲ مئی ۲۰۱۵ء)۔

میری پیدائش ارشاد رسول ﷺ کے مطابق اس وقت ہوئی جب کہ ابھی میرے رب نے کائنات کی کسی شئے کو وجود نہیں بخشا تھا، وجود و ظہور میں سب سے پہلے ”میں“ ہوں پھر مجھے حکم ربی ہوا کہ ”لکھ“ تو میں نے منشائے الٰہی کے مطابق ہر وہ چیز لکھ دی جو ازل سے ابد تک ہونے والی ہے (ترمذی)۔ میرا کام لکھنا ہے آواز کی صورت گری کرنا ہے، فکر و خیال کی مجسمہ سازی ہے الفاظ کو لباس کا جامہ پہنانا ہے، میرا وجود بے جان ہے میں سماعت و بصارت سے خالی ہوں، نطق و بیان میری تحریر ہے، میں اپنے ذاتی فکر و خیال اور ارادہ سے عاری و خالی ہوں، میں خود نہیں چلتا ہوں، حرکت دینے والا مجھے اپنے ارادہ کے مطابق حرکت دیتا ہے، میں اس بات سے بے خبر ہوں کہ یہ میری کمزوری ہے یا خوبی کہ جو جس طرح اور جس نیت سے چلاتا ہے میں چل پڑتا ہوں۔

نیک لوگ مجھے بھلے اور اچھے کام کیلئے اور بُرے لوگ اپنی برائی کیلئے استعمال کرتے ہیں، کبھی میں ایمان کی باتیں لکھتا ہوں تو کبھی کفر کی باتیں، مجھ سے کوئی محبت و مودت کی تحریریں لکھتا ہے تو کوئی نفرت و عداوت کی لکیریں کھینچتا ہے، کوئی نوک قلم سے دو جدا دلوں کو محبت کے ٹانکوں سے جوڑتا ہے تو کوئی نوک قلم سے زہریلے سانپ کی طرح ڈس کر دو دلوں کو مسموم کرتا ہے۔

کبھی میں متقی و خداترس کے ہاتھ میں ہوتا ہوں تو کبھی فاسق و فاجر کے ہاتھ میں، متقی و خداترس لکھنے سے قبل سوچتا ہے، لکھتے ہوئے خدائی استحضار رکھتا ہے لکھ کر لکھی ہوئی عبارت کا بے لاگ جائزہ اور محاسبہ کرتا ہے۔

میرا کام زبان کی مانند ہے، فرق یہ ہے کہ زبان کے الفاظ سنے جاتے ہیں جب کہ میرے الفاظ دیکھے بھی جاتے ہیں، زبان سے نکلے الفاظ فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں جب کہ میرے الفاظ منقش پتھر کی طرح محفوظ ہو جاتے ہیں، بولی کا زمانہ مختصر اور میرا زمانہ تادیر، بولی کو وہ مقام حاصل نہیں جو لکھائی کو حاصل ہے، جو اصول و آداب زبان کی بولی کے ہیں وہی احکام قلم کی لکھائی کے ہیں جس طرح زبان سے بولنا اور پڑھنا رب کے نام سے ہو (علق ۱) اس طرح قلم سے لکھنا بھی رب کے نام سے ہو زبان کے بول میں خیر ضروری ہے ورنہ خاموشی بہتر (بخاری)۔

یہی اصول حرکت قلم کے وقت ہے جس طرح زبان سے کہی بات کی تحقیق ضروری ہے (حجرات ۶) اسی طرح تحریر قلم کی تحقیق ضروری ہے، زبان کا ایک بول رضائے خداوندی کا سبب ہو سکتا ہے (بخاری)۔ قلم کا ایک جملہ بھی یہی شان رکھتا ہے جس طرح زبان کا ہر بول کاتبان اعمال فرشتوں کی گرفت میں ہے (ق ۱۸) یہی نگرانی کا نظم، تحریر کلام پر بھی قائم ہے۔ زبان کی نرمی، کلام میں خوبصورتی اور اس کی سختی بدصورتی کو جنم دیتی ہے (کنز العمال) یہی کیفیت بیان تحریر کی ہے زبان کیلئے یاد الٰہی کا حکم ہے۔

میرے رب سبحانہ وتعالیٰ نے اس وقت میری اہمیت وضرورت اور مقام کا راز افشا کر دیا تھا جب کہ اس نے اپنی آخری کتاب کا آغاز سورۃ اقرا کی پانچ آیات سے فرمایا تھا، جس نے بتایا کہ آخری دور قلم کا ہے، علم و نظریات کا اور فکر و فلسفہ کا ہو گا، یہی وجہ تھی کہ اس امت نے تھوڑی سی مدت میں کتنے بڑے بڑے کتب خانے تیار کر دیے، ان گنت فنون میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ تیار کر دیا اور انسانی دنیا کو مادی و روحانی معالجاتی و ترقیاتی اور اپنے فکر و قلم سے ہزاروں انقلاب کی بنیاد ڈالی۔

صالح مفکرین نے مجھ سے اصلاح وخیر کا کام لیا ہے اور فاسد علم برداروں نے سماج میں ترویج فتنہ وفساد کا کام کیا ہے، دین ودنیا، اچھا، برا، خیر وشر، صلاح وفساد، وصل وفصل اور محبت پر جنہوں نے مجھ سے دین وایمان کے حقائق لکھے، قرآن وسنت کی تشریحات رقم کیں، معلوماتی وبہترین مضامین لکھے۔

مضمون نگار قلم کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آج سر کٹانے اور کاٹنے کی ضرورت نہیں، آج باطل سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہے، آج نبوت محمدی پر تلواروں کا حملہ نہیں دلیلوں کا حملہ ہے، مادیت کا حملہ ہے، قوم پرستی کا حملہ ہے، قلم اور تلوار ان دونوں کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے، فرق یہ ہے کہ تلوار کی ضرورت وقتی اور عارضی ہے جب کہ قلم کی ضرورت دائمی ہے اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ ہے، بقول شاعر

تاریخ کے اوراق الٹ کر ذرا دیکھو ہر دور میں تلوار ہی ہاری ہے قلم سے

تلوار کا خیر وشر وقتی اور قلم کا تادیر ہے، تلوار کا زخم خود بخود مٹ جاتا ہے قلم کا زخم مٹائے نہیں مٹتا ہے، آج اسلام پر اٹھنے والے باطل اشکالات اور قانون الٰہی پر لگائے گئے ظالمانہ اعتراضات کا مثبت، مدلل، ٹھوس اور حکیمانہ جواب کی ضرورت ہے، ہر دور اور زمانہ کے لیے تعلیمات اسلامی کا قابل عمل ہونا اور ساری مخلوق کے لیے اس کا باعث راحت وخیر ہونے کی مدبرانہ وفقیہانہ استدلال وتشریح کی ضرورت ہے۔

آپ ﷺ مجنون نہیں

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ {۲} (القلم)

جواب ترجمہ: آپ اپنے رب کی نعمت کی وجہ سے مجنوں نہیں ہیں۔

اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کی پاکیزگی و طہارت ہے جنون سے جو کفار آپ ﷺ سے حسد اور عداوت (دشمنی) اور مخالفت کی وجہ سے منسوب کرتے تھے، تو حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کفار جو بکتے ہیں آپ ﷺ اس سے بری اور پاک ہیں۔

بغوی سے منقول ہے کہ کفار کے اس مقولہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (اے وہ شخص! جس پر قرآن اتارا گیا بلاشبہ تو دیوانہ ہے) کے رد میں نازل ہوئی۔

نعمت سے مراد نبوت و رسالت عقل و حکمت، اخلاق جلیلہ، فہم و علم، شرافت و طہارت علیٰ وجہ الکمال ہے غرضیکہ اللہ کا لطف و کرم آپ پر بدرجہ غایت ہے اور جملہ کمالات جلیلہ جس قدر ممکن ہیں آپ ﷺ کو عطا کئے گئے ہیں۔ نعمت رب عزوجل کی موجودگی کے ساتھ جنون کی مؤکد بالقسم نفی دلالت کر رہی ہے کہ ایسی عظمت و شان والے رسول کو مجنون وہی کہے گا جو انتہائی جاہل، بے ہودہ اور معمولی عقل و فہم سے بھی کورا ہو گا۔ (تفسیر الحسنات)

یہ ہے وہ بات جس پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبین وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہو رہا ہے، بجائے خود کفار کے اس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ مجنون ہیں، حضور ﷺ کے دعوائے نبوت سے پہلے تو اہل مکہ آپ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپ کی دیانت و امانت اور عقل و فراست پر اعتماد رکھتے تھے، مگر جب آپ نے ان کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپ کو دیوانہ قرار دینے لگے، اس کے معنیٰ یہ تھے کہ قرآن ہی ان کے نزدیک وہ سبب تھا جس کی بنا پر انہوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی، اس لیے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اس تہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے، یہ اعلیٰ درجہ کا فصیح و بلیغ کلام، جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، اس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد ﷺ پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے، کجا کہ اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپ معاذ اللہ دیوانے ہو گئے ہیں۔

اسی مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب تو بظاہر نبی ﷺ سے ہے، لیکن اصل مقصود کفار کو ان کی تہمت کا جواب دینا ہے، لہذا کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آیت حضور ﷺ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہ نہ تھا کہ اسے دور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی، مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ (تفہیم القرآن)

حضور ﷺ کے متعلق مکہ والوں کی رائے تھی کہ ان کو خللِ دماغ ہے، یورپ کے بعض متعصب مشنریوں نے بھی یہ کہا ہے کہ نبوت محض مرض صرع (مرگی) کا دوسرا نام تھا، معاذ اللہ، مگر قرآن حکیم فرماتا ہے کہ قلم اور تحریر کا جتنا اندوختہ اس وقت فطرت نے محفوظ رکھا ہے اور جس قدر کہ اس میں اضافہ ہو سکتا ہے، اس سارے ذخیرہ ادب و عظمت کو میزان کے پلڑے میں رکھو اور اس کے بعد اس پیغام کو دوسرے پلڑے میں رکھو، جس کو معاذ اللہ اس حکیم امی نے پیش فرمایا ہے، جس کے متعلق موازنہ، اس کے پیش کردہ پیغام کی برکات سے استفادہ کرتی رہے گی اور بس سرچشمہ معارف میں مکھی پیدا نہ ہو گی، یہ کتنی بڑی فریب خوردگی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو انسانوں کی فطرت کو بدل کر رکھ دے، جو ایک مضبوط اور قابل قدر معاشرتی نظام پیش کرے، جو ایک مستقل اور پائیدار تہذیب کی تاسیس کرے اور ہزاروں حکماء اور فلسفیوں کو اپنا غلام بنالے، اس کے متعلق یہ فیصلہ ہو کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے۔

اگر باوجود ان جلائل اعمال اور اس رفعت و عظمت کے ایک شخص کا دماغ صحیح نہیں ہے، تو پھر صحت دماغی کا معیار کیا ہے اور اگر یہ جنون ہے، تو کیا دنیا بھر کی عقل و دانش کو اس پر قربان نہیں کیا جاسکتا، حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کے افکار کا اِظہار انتہائی تعصب اور بے بصیرتی کا نتیجہ ہے، ورنہ جس

شخص کو ادنی ترین قوت تمیزی بھی عطا ہوئی ہے۔ وہ بھی یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ محمد ﷺ دنیائے عقل وخرد کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ (تفسیر سراج البیان)

آپ ﷺ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ {۳} القلم

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں۔

یعنی دین حق کے منکر جو آپ کی شان میں ہرزہ سرائی کرتے ہیں اور آپ اس پر صبر کرتے ہیں اس پر آپ کو ایسا اجر ملنے والا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں جس طرح آپ کی مقدس تعلیم اور آپ کا دین قائم اور دائم رہنے والا ہے اسی طرح آپ کے اجر کو بھی زوال نہیں اور وہ اجر اور آپ کے مراتب کی بلندی اور برتری کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ممنون کے ایک معنٰی یہ بھی ہیں کہ احسان رکھا گیا اس تقدیر پر مطلب یہ ہو گا کہ ایسا اجر عطا ہو گا کہ جو بغیر کسی احسان جتانے کے عطا کیا جائیگا یعنی اس اجر کا آپ پر کوئی احسان نہیں رکھا جائے گا۔ (تفسیر کشف الرحمٰن للدھلوی)

مفسر قرآن مولانا محمد اسحاق کاشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں پیغمبر علیہ السلام کے لیے اجر غیر ممنون کی عظیم الشان بشارت: سو ارشاد فرمایا گیا اور حرف تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا کہ آپ ﷺ کے لئے یقیناً کبھی ختم نہ ہونے والا ایک عظیم الشان اجر ہے، جو ہمیشہ کے لئے جاری وساری رہے گا کہ آپ ﷺ کے پیش فرمودہ اس نورِ حق و ہدایت نے قیامت تک باقی رہنا ہے اور آپ ﷺ کی بعثت و تشریف آوری سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامِ قیامت تک، جس کو بھی اور جہاں کہیں بھی ہدایت کی یہ روشنی نصیب ہوئی، یا آئندہ نصیب ہو گی، وہ سب آپ ﷺ ہی کے واسطہ اور سبب

سے نصیب ہوئی اور ہو گی، جس کا اجر وثواب الدال علی الخیر کفاعلہ کے معروف و معقول ضابطے اور اصول کے مطابق آپ ﷺ کو سدا ملتا رہے گا۔

سبحان اللہ کیا کہنے اس مرتبہ و مقام اور عظمت شان کے جس سے آنحضرت ﷺ کو حضرت واہب مطلق جل جلالہ کی طرف سے نوازا گیا کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی منٹ سیکنڈ ایسا نہیں گزرتا جس میں اس پورے کرہ ارض میں آنحضرت ﷺ کی امت کے لاتعداد اور بے حد و حساب مسلمان کسی نہ کسی عبادت میں مشغول نہ ہوتے ہوں اور اس طرح آنجناب ﷺ کو طرح طرح سے اور بے حد و حساب اجر وثواب نہ ملتا ہو، صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ ومن اھتدی بھدیہ الی یوم الدین سو منکرین کا کہنا تھا کہ بُتِرَ مُحَمَّدُ یعنی محمد کی نسل کٹ گئی اور ان کا یہ کہنا تھا کہ ان کا یہ دین بس کچھ ہی عرصے کا مہمان ہے وغیرہ لیکن آپ کو یہ خوشخبری دی گئی کہ آپ کے لیے ایسا اجر غیر ممنون ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں جبکہ منکرین اپنی جس دنیا پر مست و مغرور ہیں وہ فانی اور چند روزہ ہے اور اب یہ لوگ عذاب کی زد میں ہیں اور یہ عنقریب ہی اپنے انجام کو پہنچ کر رہیں گے۔ (تفسیر مدنی)

نبی کریم ﷺ کے عالی اخلاق

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ اس آیت میں کس ہستی کے بارے میں بات کی گئی ہے؟

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ {۴} القلم.

جواب **ترجمہ:** اور بیشک آپ بڑے اخلاق والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہیں کہ آپ نے دین حق کی خاطر ان لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سنی ہیں، اذیتیں برداشت کی ہیں، دکھ اٹھائے ہیں، طعنے سنے ہیں، طنز کے نشتر ان لوگوں نے آپ ﷺ کی طرف چلائے، مگر آپ

ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ دین حق کی اشاعت کرتے رہے، اس لیے ایک تو آپ کے لیے اجر عظیم ہے، دوسرا اخلاق عظیم کی نعمت سے آپ کو نوازا گیا ہے۔

آپ ﷺ بہت بڑے اخلاق پر ہیں یعنی دین اسلام پر اور بہترین ادب پر ہیں، سعد بن ہشام کہتے ہیں کہ میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں نبی کریم ﷺ کے اخلاق عالیہ جاننے کے لیے حاضر ہوا، میں نے امی عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو انہوں نے میرے سوال کا یہ جواب دیا کہ کیا تو قرآن نہیں پڑھا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں میں نے قرآن کریم پڑھا ہے تو اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ بنو سواد کے ایک شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہی سوال کیا تھا تو آپ نے یہی فرما کر پھر آیت وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ القلم پڑھی۔

اس آدمی نے کہا کوئی ایک آدھ واقعہ تو بیان کیجئے ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا سنو! ایک مرتبہ میں نے بھی آپ ﷺ کے لئے کھانا پکایا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی، میں نے اپنی لونڈی سے کہا دیکھ اگر میرے کھانے سے پہلے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کا کھانا آجائے تو تو برتن گرا دینا چنانچہ اس نے یہی کیا اور برتن بھی ٹوٹ گیا، حضور ﷺ بکھرے ہوئے کھانے کو سمیٹنے لگے اور فرمایا اس برتن کے بدلے ثابت برتن تم دو، واللہ اور کچھ ڈانٹا ڈپٹا نہیں (مسند احمد)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وَمَعْنَى هَذَا أَنَّهُ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، صَارَ امتثالُ الْقُرْآنِ، أَمْرًا وَنَهْيًا، سَجِيَّةً لَهُ، وَخُلُقًا تَطَبَّعَه، وَتَرَكَ طَبْعَهُ الجِبِلِّي، فَمَهْمَا أَمَرَهُ الْقُرْآنُ فَعَلَهُ، وَمَهْمَا نَهَاهُ عَنْهُ تَرَكَهُ. هَذَا مَعَ مَا جَبَلَه اللهُ عَلَيْهِ مِنَ الْخُلُقِ الْعَظِيمِ، مِنَ الْحَيَاءِ وَالْكَرَمِ وَالشَّجَاعَةِ، وَالصَّفْحِ وَالْحِلْمِ، وَكُلِّ خُلُقٍ جَمِيلٍ مطلب اس حدیث کا جو کئی طرق سے مختلف الفاظ میں کئی کتابوں میں ہے یہ ہے کہ ایک تو

آپ ﷺ کی جبلت اور پیدائش میں ہی اللہ نے پسندیدہ اخلاق بہترین خصلتیں اور پاکیزہ عادتیں رکھی تھیں دوسرے آپ ﷺ کا عمل قرآن کریم پر ایسا تھا کہ گویا احکامِ قرآن کا مجسم عملی نمونہ ہیں، ہر حکم کو بجالانے اور ہر نہی سے رک جانے میں آپ کی حالت یہ تھی کہ گویا قرآن میں جو کچھ ہے وہ آپ کی عادتوں اور آپ کے کریمانہ اخلاق کا بیان ہے۔

حضرت انس رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی دس سال تک خدمت کی لیکن کسی دن آپ نے مجھے اُف تک نہیں کہا کسی کرنے کے کام کو نہ کروں یا نہ کرنے کے کام کر گزروں تو بھی ڈانٹ ڈپٹ تو کجا اتنا بھی نہ فرماتے کہ ایسا کیوں ہوا؟ حضور ﷺ سب سے زیادہ خوش خُلق تھے حضور ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہ تو ریشم ہے نہ کوئی اور چیز۔

حضور ﷺ کے پسینہ سے زیادہ خوشبو والی چیز میں نے تو کوئی نہیں سونگھی نہ مشک اور نہ عطر (بخاری و مسلم) صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ خلیق تھے آپ کا قد نہ تو بہت لانبا تھا نہ آپ پست قامت تھے۔

شمائل ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے نہ تو کبھی کسی خادم یا غلام کو مارا نہ بیوی بچوں کو نہ کسی اور کو، ہاں اللہ کی راہ کا جہاد الگ چیز ہے، جب کبھی دو کاموں میں آپ کو اختیار دیا جاتا تو آپ اسے پسند کرتے جو زیادہ آسان ہوتا ہاں یہ اور بات ہے کہ اس میں کچھ گناہ ہو تو آپ اس سے بہت دور ہو جاتے۔ کبھی بھی حضور ﷺ نے اپنا بدلہ کسی سے نہیں لیا ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی اللہ کی حرمتوں کو توڑتا ہو تو آپ ﷺ اللہ کے احکام جاری کرنے کے لئے ضرور انتقام لیتے۔

مسند احمد میں ہے حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں میں بہترین اخلاق اور پاکیزہ ترین عادتوں کو پورا کرنے کے لئے آیا ہوں۔ پھر فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ اور آپ کے مخالف اور منکر ابھی ابھی

جان لیں گے کہ دراصل بہکا ہوا اور گمراہ کون تھا؟ جیسے اور جگہ ہے (سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (القمر:۲۶) انہیں ابھی کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا اور شیخی باز کون تھا؟

اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فیصلہ

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ{۵}بِاَيِّيْكُمُ الْمَفْتُوْنُ {۶}اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ{۷}القلم

جواب ترجمہ: سو عنقریب آپ دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے۔ کہ تم میں سے کس کو جنون تھا۔ بلاشبہ آپ کا رب اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت اور مخالفوں کے لیے وعید: یہ آنحضرت ﷺ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے دھمکی ہے کہ اگر یہ تمہیں دیوانہ کہہ کر تمہاری باتوں کو بے وزن بنانا چاہتے ہیں تو کچھ دن صبر کرو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ دونوں میں سے کس پارٹی کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈر کے ہاتھ میں ہے؟ اہل ایمان کی باگ، جن کی قیادت تم کر رہے ہو یا قریش کی باگ جن کی قیادت ابو لہب اور ابو جہل کر رہے ہیں؟

مطلب یہ ہے کہ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے اور حقیقت کے ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ بہت جلد سب دیکھ لیں گے کہ کون لوگ شیطان کے فتنہ میں پڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی قوم کو تباہی کے کھڈ میں گرایا اور کون شیطان کے فتنوں سے امان میں رہا اور اس نے اپنے پیروؤں کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہ دکھائی۔

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رکھیے جس کی بار بار یاد دہانی کی جا چکی ہے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو اسی دنیا میں اپنی جماعت اور اپنے مخالفوں کے انجام کا فیصلہ کر

جاتے ہیں۔ آیت میں اہل ایمان کے لیے جو تسلی اور اہل کفر کے لیے جو وعید ہے وہ جس طرح آخرت سے متعلق ہے اسی طرح اس دنیا سے بھی متعلق ہے۔ (تفسیر تدبر قرآن للاصلاحی)

آیت ٦ کے تحت مولانا سعید احمد دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "یعنی عذاب دنیوی کے وقت یا مرنے کے بعد یا قیامت کے دن کا عذاب دیکھ کر یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ در حقیقت مجنون کون تھا اور جنون کے فتنے میں کون مبتلا تھا کیونکہ جنون موجب ہے زوال عقل کا اور زوال عقل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ضرر سے بچتا نہیں اور نفع حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا قیامت کے دن یہ بات آشکارا ہو جائے گی کہ کون نفع سے محروم رہ کر ضرر میں مبتلا ہوتا ہے اور اجر و ثواب سے محروم رہ کر عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اس دن یہ بات آنکھوں سے بھی مجرم دیکھ لے گا اور دل سے بھی یقین کر لے گا جو اس دن کے ضرر سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس دن کے نفع سے محروم رہا وہی دیوانہ تھا اور وہی جنون کے فتنے میں مبتلا تھا اگرچہ پیغمبر اسلام کو اس دنیا میں بھی یقین حاصل تھا کہ یہ منکر دیوانے ہیں لیکن منکروں کے مجنون کہنے سے آپ کی حیثیت ایک فریق کی بن گئی تھی اس لئے دونوں کو فرمایا کہ اے پیغمبر آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے۔ (تفسیر کشف الرحمٰن)

آیت ٨ کے ذیل میں ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ کافر لوگ اپنے اور آپ کے بارے میں کیسے ہی الٹے سیدھے تصورات رکھیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے کوئی بات مخفی نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ آپ ﷺ کو ہم نے جو ہدایت دے کے بھیجا ہے اسے قبول کرنے والا، اس کے لیے قربانیاں دینے والا اور اس راستے پر چلنے والا کون ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے قدم قدم پر آپ ﷺ کی مخالفت اپنا فریضہ سمجھ رکھا ہے اور وہ اسلام کی ناکامی اور شکست کو زندگی کا سب سے بڑا ہدف بنا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ عادل ہے اور اس کی صفت عدل کائنات کے نظام پر اس طرح چھائی ہوئی ہے جیسے زندگی کی سرگرمیوں پر روشنی کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس کے عدل کا ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ اس کے راستے پر

چلنے والے لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہوں اور آخرت میں بھی سرفراز ٹھہریں اور اس کی مخالفت کرنے والے آخر کار ناکامی سے دوچار ہوں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنیں۔ کیونکہ اگر وہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھے اور یکساں معاملہ کرے تو یہ عدل نہیں بلکہ ظلم ہے۔

اور اگر وہ اپنے راستے پر چلنے والوں کو ہمیشہ تکلیفوں میں مبتلا رکھے اور نافرمانوں اور باغیوں کو ہمیشہ کھل کھیلنے کا موقع دے تو یہ ظلم سے بڑھ کر ظلم ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا تقاضا اس سے بالکل مختلف ہے، آپ ﷺ اطمینان رکھیں، اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا ظہور ضرور ہو گا، اس کے راستے پر چلنے والے سرفراز ہوں گے اور مخالفت کرنے والے خائب و خاسر ہوں گے۔ (روح القرآن)

کسی غلط کار سے متأثر ہونے کی ضرورت نہیں

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ {۸}وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ {۹}وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ {۱۰}هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ {۱۱}مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ {۱۲}عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ {۱۳} القلم.

جواب ترجمہ: پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں میں ہر گز نہ آیئے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں، اور آپ کسی ایسے شخص کی بات نہ مانیے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے۔ ذلیل ہے جو دوسروں کو عیب لگاتا ہے چغل خور ہے، خیر سے روکنے والا ہے گناہ کا ارتکاب کرنے والا ہے، سخت مزاج ہے اور اس کے بعد منقطع النسب بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ جو نعمتیں ہم نے آپ کو دیں جو صراط مستقیم اور اخلاقِ عظیم ہم نے آپ کو عطا فرمایا اب آپ کو چاہیے کہ ہماری نہ ماننے والوں کی آپ بھی نہ مانیں، ان کی تو عین خوشی ہے کہ آپ ذرا بھی نرم پڑیں تو یہ کھل کھیلیں اور یہ بھی مطلب ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ

آپ ان کے معبودانِ باطل کی طرف کچھ تورخ کریں حق سے ذرا سا تو اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ (ابن کثیر) پھر فرماتا ہے کہ زیادہ قسمیں کھانے والے کمینے شخص کی بھی نہ مانیے چونکہ جھوٹے شخص کو اپنی ذلت اور کذب بیانی کے ظاہر ہو جانے کا ڈر رہتا ہے، اس لئے وہ قسمیں کھا کھا کر دوسرے کو اپنا یقین دلانا چاہتا ہے لگاتار قسموں پر قسمیں کھائے چلا جاتا ہے اور اللہ کے ناموں کو بے موقع استعمال کرتا پھرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں (مھین) سے مراد کاذب ہے۔ مجاہد کہتے ہیں ضعیف دل والا۔ حسن کہتے ہیں (حلاف) مکابرہ کرنے والا اور (مہین) ضعیف، (ھماز) غیبت کرنے والا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں الَّذِي يَمْشِي بَيْنَ النَّاسِ، وَيُحَرِّشُ بَيْنَهُمْ وَيَنْقُلُ الْحَدِيثَ لِفَسَادِ ذَاتِ الْبَيْنِ وَهِيَ الْحَالِقَةُ، چغل خور جو اِدھر کی اُدھر لگائے اور اُدھر کی اِدھر تاکہ فساد ہو جائے۔ طبیعتوں میں نفرت اور دل میں دشمنی آجائے۔

حضرت طاؤس رحمہ اللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ: إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ (بخاری و مسلم) رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے، پھر فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑے امر پر نہیں ایک تو پیشاب کرنے میں پردے کا خیال نہ رکھتا تھا۔ دوسرا چغل خور تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ چغل خور جنت میں نہ جائے گا۔ (مسند احمد بن حنبل، تفسیر ابن کثیر)

حضرت ہمام بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَرَّ رَجُلٌ عَلَى حُذَيْفَةَ فَقِيلَ: إِنَّ هَذَا يَرْفَعُ الْحَدِيثَ إِلَى الْأُمَرَاءِ. فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم يَقُولُ أَوْ: قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ ایک آدمی حضرت

حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا، تو ان سے کہا گیا کہ یہ شخص حکمرانوں تک باتیں پہنچاتا ہے، اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا یا یوں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، چغل خور جنت میں نہ جائے گا۔ (مسند احمد)

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن سے روایت ہے کہ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخِيَارِكُمْ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ: الذين إذا رُؤُوا ذُكر اللهُ، عَزَّ وَجَلَّ ثُمَّ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِشِرَارِكُمْ؟ الْمَشَّاءُونَ بِالنَّمِيمَةِ، الْمُفْسِدُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ، وَالْبَاغُونَ لِلْبُرَآءِ الْعَنَت (مسند احمد) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ تم میں سب سے بھلا شخص کون ہے؟ لوگوں نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے، فرمایا وہ کہ جب انہیں دیکھا جائے اللہ یاد آجائے اور سن لو سب سے بدتر شخص وہ ہے جو چغل خور ہو دوستوں میں فساد ڈلوانے والا ہو، پاک صاف لوگوں کو تہمت لگانے والا ہو۔

اس کے بعد ان برے لوگوں کے برے خصائل بیان ہو رہے کہ بھلائیوں سے باز رہنے والا اور باز رکھنے والا ہے، حلال چیزوں اور حلال کاموں سے ہٹ کر حرام خوری اور حرام کاری کرتا ہے، گنہگار، بدکردار، محرمات کو استعمال کرنے والا، بدخو، بدگو جمع کرنے والا اور نہ دینے والا ہے۔

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعَّف لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُل جَوّاظ مُسْتَكْبِرٍ (مسند احمد) کیا میں تمہیں اہل جنت کے بارے میں نہ بتاؤں؟ جنتی لوگ گرے پڑے عاجز وضعیف ہیں، جو اللہ کے ہاں اس بلند مرتبہ پر ہیں کہ اگر وہ قسم کھا بیٹھیں تو اللہ پوری کر دے اور جہنمی لوگ سرکش متکبر اور خود بین ہوتے ہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ كُلُّ جَعْظَرِيٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ جَمَّاعٍ مَنَّاعٍ (مسند احمد) جمع کرنے والے اور نہ دینے والے بدگو اور سخت خلق۔ اہل

لغت فرماتے ہیں کہ جعظری کا معنیٰ بد گو اور سخت خو ہے جب کہ جواظ کا معنیٰ ہے مال جوڑنے والا اور لوگوں کو نہ دینے والا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا عتل زنیم کون ہے ؟ فرمایا هُوَ الشَّدِيدُ الْخُلُقِ الْمُصَحَّحُ، الْأَكُولُ الشَّرُوبُ، الْوَاجِدُ لِلطَّعَامِ وَالشَّرَابِ، الظَّلُومُ لِلنَّاسِ، رَحِيبُ الْجَوْفِ بد خلق، صحت مند، خوب کھانے پینے والا، لوگوں پر ظلم کرنے والا پیٹو آدمی۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تَبْكِي السَّمَاءُ مِنْ عَبْدٍ أَصَحَّ اللَّهُ جِسْمَهُ، وَأَرْحَبَ جَوْفَهُ، وَأَعْطَاهُ مِنَ الدُّنْيَا مِقْضَمًا فَكَانَ لِلنَّاسِ ظَلُومًا. قَالَ: فَذٰلِكَ الْعُتُلُّ الزنيم (طبری ۱۹، ۱۶) اس نالائق شخص پر آسمان روتا ہے جسے اللہ نے تندرستی دی، پیٹ بھر کھانے کو دیا مال و جاہ بھی عطا فرمائی، پھر بھی لوگوں پر ظلم و ستم کر رہا ہے، یہی شخص ہے جسے قرآن کریم میں عتل الزنیم کہا گیا ہے۔ حضرت ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس روایت کو دو مرسل طریقوں سے نقل فرمایا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّ الْعُتُلَّ هُوَ: الْمُصَحَّحُ الْخَلْقِ، الشَّدِيدُ الْقَوِيُّ فِي الْمَأْكَلِ وَالْمَشْرَبِ وَالْمَنْكَحِ، وَغَيْرِ ذَلِكَ، عتل اسے کہتے ہیں جس کا بدن صحیح ہو، طاقتور ہو اور خوب کھانے پینے والا زور دار شخص ہو۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر در منثور میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت لائے ہیں کہ رجلٌ مِنْ قُرَيْشٍ لَهُ زَنَمَةٌ مِثْلُ زَنَمَةِ الشَّاةِ، عتل بعد ذلک زنیم، وہ آدمی قریش میں سے تھا جس کے حلق کے نیچے کا زائد گوشت اس طرح لٹکا ہوا تھا جیسے بکری کا گوشت لٹکا ہوتا ہے اور وہ اسی سے پہچانا جاتا ہے۔

ابن جریر و ابن المنذر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا، اس کی صفت بیان کی گئی مگر نہ پہچانا گیا، یہاں تک کہ کہا گیا، زنیم، اب اس سے مراد ایک ایسا آدمی جس کی گردن کا گوشت لٹکا ہوا تھا، جس سے وہ پہچانا جاتا تھا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ زنیم کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وَمَعْنَى هٰذَا: أَنَّهُ كَانَ مَشْهُورًا بِالشَّرِّ كَشُهْرَةِ الشَّاةِ ذَاتِ الزَّنَمَةِ مِنْ بَيْنِ أَخَوَاتِهَا وَإِنَّمَا الزَّنِيمُ فِي لُغَةِ الْعَرَبِ: هُوَ الدَّعِيُّ فِي الْقَوْمِ، (زنیم) سے مراد بدنام ہے جو برائی میں مشہور ہو، لغت عرب میں (زنیم) اسے کہتے ہیں جو کسی قوم میں سمجھا جاتا ہو لیکن دراصل اس کا نہ ہو۔

شعراء عرب نے اپنے اشعار میں زنیم کا یہی معنیٰ مراد لیا ہے، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قریش کے کچھ کفار کے بارے میں مذمتی الفاظ میں یہی الفاظ ذکر کیے

وأنتَ زَنيمٌ نِيطَ فِي آلِ هَاشِمٍ ... كَمَا نِيطَ خَلْفَ الرَّاكِبِ القَدَحُ الفَرْدُ

زَنيمٌ لَيْسَ يُعرَفُ مَن أبوهُ ... بَغِيُّ الأُمِّ ذُو حَسَبٍ لَئِيمِ

عرب شاعروں نے اسے اسی معنی میں باندھا ہے یعنی جس کا نسب صحیح نہ ہو، کہا گیا ہے کہ مراد اس سے اخنس بن شریق ثقفی ہے جو بنو زہرہ کا حلیف تھا اور بعض کہتے ہیں یہ اسود بن عبد یغوث زہری ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے زنیم کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا هُوَ وَلَدُ الزِّنَا، زنیم حرامی کو کہا جاتا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر در منثور میں روایت لائے ہیں کہ الطستی نے اپنے مسائل میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نافع بن ازرق رحمہ اللہ نے ان سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول " زنیم " سے کیا مراد ہے تو فرمایا کہ اس سے مراد ہے زنا کی اولاد۔ پھر پوچھا کیا عرب کے لوگ اس معنی سے واقف ہیں؟ فرمایا ہاں کیا تو نے شعراء کو یہ شعر کہتے ہوئے نہیں سنا۔

زَنيمٌ تَداعاهُ الرِّجالُ زِيادَةً ... كَما زِيدَ فِي عَرضِ الأَدِيمِ الأَكارِعُ

ترجمہ: زنیم وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں لوگ زیادتی اور اضافہ کے لیے دعویٰ کرتے ہیں جیسا کہ چمڑے کے سامان میں اس کے کھروں کا اضافہ کر دیا جائے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ يُعْرَفُ الْمُؤْمِنُ مِنَ الْكَافِرِ مِثْلُ الشَّاةِ الزَّنْمَاءِ. وَالزَّنْمَاءُ مِنَ الشِّيَاهِ: الَّتِي فِي عُنُقِهَا هَنَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِي حَلْقِهَا یہ بھی بیان ہوا ہے کہ

جس طرح ایک بکری جو تمام بکریوں میں سے الگ تھلگ اپنا چرا ہوا کان اپنی گردن پر لٹکائے ہوئے ہو تو یہ یک نگاہ پہچان لی جاتی ہے اسی طرح کافر مومنوں میں پہچان لیا جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اسی طرح کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں لیکن خلاصہ سب کا صرف اسی قدر ہے کہ زنیم وہ شخص ہے جو برائی سے مشہور ہو اور عموماً ایسے لوگ ادھر ادھر سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جن کے صحیح نسب کا اور حقیقی باپ کا پتہ نہیں ہوتا ایسوں پر شیطان کا غلبہ بہت زیادہ رہا کرتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَدُ زِنًا (مسند احمد) زنا کی اولاد جنت میں نہیں جائے گی۔

اس روایت کو علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت اس اصول کے خلاف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی شخص آخرت میں کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ اور روایت میں ہے کہ وَلَدُ الزِّنَا شَرُّ الثَّلَاثَةِ إِذَا عَمِلَ بِعَمَلِ أَبَوَيْهِ (مسند احمد) زنا کی اولاد تین برے لوگوں کی برائی کا مجموعہ ہے، اگر وہ بھی اپنے ماں باپ کے سے کام کرے۔

کثرت مال واولاد پر گھمنڈ کی مذمت

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ وتفسیر کیجیے۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ {۱۴} اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ {۱۵} سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ {۱۶} القلم

جواب ترجمہ: صرف اس وجہ سے کہ وہ بڑے مال اور اولاد والا ہے۔ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں" پھر فرمایا اس کی ان شرارتوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ مالدار اور بیٹوں کا باپ بن گیا ہے ہماری اس نعمت کا کفران کا تو کہاں ہماری آیتوں کو جھٹلاتا ہے

اور توہین کر کے کہتا پھرتا ہے کہ یہ تو پرانے افسانے ہیں۔

دوسرے مقام پر اسی کے بارے میں فرمایا گیا کہ ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا (المدثر:۱۱) مجھے چھوڑ دے اور اسے جسے میں نے یکتا پیدا کیا ہے اور بہت سا مال دیا ہے اور حاضر باش لڑکے دیئے ہیں اور بھی بہت کشادگی دے رکھی ہے پھر بھی اس کی طمع ہے کہ میں اسے اور دوں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا یہ تو میری آیتوں کا مخالف ہے میں اسے عنقریب بدترین مصیبت میں ڈالوں گا اس نے غور و فکر کے اندازہ لگایا یہ تباہ ہو۔ کتنی بری تجویز اس نے سوچی میں پھر کہتا ہوں، یہ برباد ہو اس نے کیسی بری تجویز کی اس نے پھر نظر ڈالی اور ترش رو ہو کہ منہ بنالیا، پھر منہ پھیر کر اینٹھنے لگا اور کہ دیا کہ یہ کلام اللہ تو پرانا نقل کیا ہوا جادو ہے، صاف ظاہر ہے کہ یہ انسانی کلام ہے، اس کی اس بات پر میں بھی اسے (سقر) میں ڈالوں گا تجھے کیا معلوم کہ (سقر) کیا ہے نہ وہ باقی رکھے نہ چھوڑے بدن پر لپٹ جاتی ہے اس پر انیتس فرشتے متعین ہیں، اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ اس کی ناک پر ہم داغ لگائیں گے یعنی اسے ہم اس قدر رسوا کریں گے کہ اس کی برائی کسی پر پوشیدہ نہ رہے ہر ایک اسے جان پہچان لے جیسے نشاندار ناک والے کو بیک نگاہ ہزاروں میں لوگ پہچان لیتے ہیں اور جو داغ چھپائے نہ چھپ سکے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر والے دن اس کی ناک پر تلوار لگے گی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت والے دن جہنم کی مہر لگے گی یعنی منہ کالا کر دیا جائے گا تو ناک سے مراد پورا چہرہ ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر)

امام ابو جعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے ان تمام اقوال کو وارد کر کے فرمایا ہے کہ ان سب میں تطبیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ یہ کل امور اس میں جمع ہو جائیں یہ بھی ہو وہ بھی ہو، دنیا میں رسوا ہو سچ مچ ناک پر نشان لگے آخرت میں بھی نشاندار مجرم بنے فی الواقع یہ بہت درست ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ الْعَبْدَ يُكْتَبُ مُؤْمِنًا أَحْقَابًا ثُمَّ أَحْقَابًا ثُمَّ يَمُوتُ وَاللهُ عَلَيْهِ سَاخِطٌ. وَإِنَّ الْعَبْدَ يُكْتَبُ كَافِرًا أَحْقَابًا ثُمَّ أَحْقَابًا، ثُمَّ يَمُوتُ وَاللهُ عَلَيْهِ رَاضٍ. وَمَنْ مَاتَ هَمَّازًا لَمَّازًا

مُلَقَّبا للناس، كَانَ عَلَامَتُهُ يَومَ القِيَامَةِ أَن يُّسميه اللهُ عَلَى الْخُرْطُومِ، مِنْ كِلَا الشَّفَتَيْنِ (معجم کبیر للطبرانی) بے شک ایک بندہ بہت طویل زمانے تک (اللہ کے ہاں) مؤمن لکھا جاتا رہتا ہے، پھر زمانوں پر زمانے گزرتے ہیں، مگر وہ (آخرکار) اس حال میں مرتا ہے کہ اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ اور بے شک ایک بندہ بہت طویل زمانوں تک کافر لکھا جاتا رہتا ہے، پھر زمانے گزرتے ہیں، لیکن وہ اس حال میں مرتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہوتا ہے۔ اور جو شخص لوگوں کو طعنہ دینے والا، عیب جوئی کرنے والا اور ان کے لیے بُرے لقب رکھنے والا ہو کر مرے، تو قیامت کے دن اس کی نشانی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کی سُونڈ (ناک کے اگلے حصے) پر داغ لگا دے گا، دونوں ہونٹوں کے درمیان۔

باغ والوں کا عبرت ناک قصہ

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ اصحاب الجنہ (باغ والوں) کا قصہ کیا ہے؟

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ {۱۷} وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ {۱۸} فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ {۱۹} فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ {۲۰} فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ {۲۱} اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ {۲۲} فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ {۲۳} اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ {۲۴} وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ {۲۵} فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ {۲۶} بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ {۲۷} قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ {۲۸} قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ {۲۹} فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ {۳۰} قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ {۳۱} عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ {۳۲} كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ {۳۳} القلم.

جواب ترجمہ: ہم نے ان (مکہ والوں) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جیسے (ایک) باغ والوں کو اس وقت آزمائش میں ڈالا تھا جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح ہوتے ہی ہم اس باغ کا پھل توڑ لیں گے۔ اور انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا، پھر ہوا یہ کہ جس وقت وہ سو رہے تھے، اس وقت تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھیر الگا گئی۔ جس سے وہ باغ صبح کو کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا۔ پھر صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو آواز دی۔ کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو اپنے کھیت کی طرف سویرے چل نکلو۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے سے چپکے چپکے یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس اس باغ میں نہ آنے پائے۔ اور وہ بڑے زوروں میں تیز تیز چلتے ہوئے نکلے۔ پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ: ہم ضرور راستہ بھٹک گئے ہیں۔ (پھر کچھ دیر بعد کہا کہ) نہیں بلکہ ہم سب لٹ گئے ہیں۔ ان میں جو شخص سب سے اچھا تھا، وہ کہنے لگا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ کہنے لگے: ہم اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے ہیں، یقیناً ہم ظالم تھے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ (پھر) سب نے (متفق ہو کر) کہا کہ: افسوس ہے ہم سب پر! یقیناً ہم سب نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔ کیا بعید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمیں اس باغ کے بدلے اس سے اچھا عطا فرمادے۔ بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عذاب ایسا ہی ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب یقیناً سب سے بڑا ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو اس طرح بھوک اور قحط کی آزمائش میں ڈالا، جس طرح اصحاب الجنہ (باغ والوں) کو ڈالا تھا، جب انہوں نے نے آپس میں قسمیں کھا کر عہد وپیمان کیا تھا کہ وہ صبح سویرے ہی اپنے باغ کے پھل اتار لیں گے، انہیں مساکین اور ضرورت مند نہیں کھا سکیں گے، ایسا کہنے اور ارادہ بنانے میں انہوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی میں ہی ان پھلوں پر آگ بھیج کر انہیں تباہ وبرباد کر دیا تھا، جب کہ یہ لوگ اپنے بستروں پر سو رہے تھے، جب یہ لوگ صبح

سویرے اپنی نیند سے بیدار ہو کر پھلدار باغ میں پہنچے تو ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کالی رات کا کوئی ٹکڑا پڑا ہوا ہے۔

صبح صبح ہی ایک دوسرے کو پکارنے لگے، کہ جلدی جلدی اپنے کھیت کی طرف چلو، اگر تم اپنے باغ کا پھل چننا چاہتے ہو تو جلدی کرو، یہ لوگ آپس میں باتیں کرتے تھے کہ آج صبح سویرے کھیت میں پہنچیں تاکہ کوئی بھی مسکین اور ضرورت مند تمہارے باغ میں داخل نہ ہو سکے، ان کی آمد سے پہلے پہلے پھل اتار لینا چاہیے۔

رات کو برے ارادے اور برے خیالات جنم دیتے ہوئے بستروں پر جا پڑے، صبح ہوتے ہی برے ارادوں اور بری نیتوں کے ساتھ گھروں سے باغ کی طرف چل پڑے، کہ مسکینوں کو باغ کا پھل نہیں لینے دیں گے، یوں خیال کر رہے تھے کہ شاید وہ سب کچھ کرنے پر دسترس رکھتے ہیں، جب باغ میں پہنچ کر انہوں نے تباہی و بربادی کا منظر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تو حیرت میں ڈوب گئے اور یہ سوچنے لگے کہ یہ تو ہمارا باغ نہیں، ہم کہیں غلط جگہ پہنچ گئے ہیں۔

وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ہم اپنے باغ کا راستہ بھٹک گئے ہیں، جب انہیں پتا چل گیا کہ نہیں راستہ نہیں بھولے ہیں بلکہ یہی ان کا باغ تھا، تو اب کہنے لگے کہ راستہ غلط نہیں ہوا بلکہ ہم اس کی خیر سے محروم کر دیے گئے ہیں، اس خیر اور نعمت سے محرومی کی وجہ ہماری بری نیتیں ہیں، جب ہم نے بخل اور کنجوسی کی بناء پر مساکین کو محروم رکھنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے ہمیں اس نعمت سے محروم کر دیا۔

ان باغ والوں میں سے ایک نے انصاف کی بات کی کہ میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ تم لوگ ان شاء اللہ کہہ لو، تم نے ان شاء اللہ کیوں نہ کہا تھا؟ جب اس تباہی کے باعث ان کے دماغ اور فکر ٹھکانے آئی تو اپنے کو کوسنے لگے، اپنے وطعن لعن کرنے لگے، رب تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرنے لگے، اپنے کو ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے گردانے لگے، اپنے برے خیالات اور فاسد نیتوں کو طعن کرنے لگے،

پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور پکار اٹھے کہ اے ہماری ہلاکت وبربادی! ہم فقراء ومساکین کو اس نعمت سے محروم رکھنے کی نیت اور اللہ کے حکم کی مخالفت کے باعث حدود سے تجاوز کر بیٹھے، ہو سکتا ہے ہمارا پروردگار ہماری توبہ اور اپنی خطاء کے اعتراف کی وجہ سے ہمیں اس باغ سے بہتر عطا فرمادے، اس لیے ہم اپنے اکیلے پروردگار کی طرف توجہ کرتے ہیں، ہم اپنے پروردگار سے عفوودگزر کی امید رکھتے ہوئے خیر کے طلب گار ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں بتارہے ہیں کہ جس طرح ہم نے باغ والوں کو سزادی یونہی ہماری اس دنیا میں ہر اس شخص کے لیے سزا ہوا کرتی ہے جو ہمارے حکم کی مخالفت کرتا ہے، ہماری نافرمانی کرتا ہے، اور جو کچھ ہم نے اسے عطا فرمارکھا ہے اس میں بخل سے کام لیتا ہے، جو کچھ اسے دیا گیا ہے اس میں اللہ کا حق ادا نہیں کرتا، دنیا میں یہ ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور شدید ہوتا ہے جو دنیوی سزا وعقاب سے بہت شدید ہوتا ہے، اگر ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس طرح کی حرکات کا صلہ کیا ملے گا تو وہ لوگ ایسا کرنے سے گریز کرتے۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں مکہ مکرمہ کے بعض مال دار کافروں کو یہ زعم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا تو ہمیں مال ودولت سے نہ نوازتا، جیسا کہ سورۃ مومنون:۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کا ذکر فرمایا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ ہم بعض اوقات کسی کو مال و دولت اس آزمانے کے لیے دیتے ہیں، اور اگر وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری کرے تو اس پر دنیا ہی میں عذاب آجاتا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں اسی طرح کا ایک واقعہ بیان فرمایا گیا ہے جو اہل عرب میں مشہور تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک نیک شخص کا بہت بڑا باغ تھا، اس نیک آدمی کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے باغ اور کھیت کی پیداوار کا ایک اچھا خاصہ حصہ غریبوں کو دیا کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں

نے یہ طے کیا کہ ہمارا باپ بیوقوف تھا جو اتنی ساری پیداوار غریبوں کو دے کر اپنی دولت میں کمی کر دیتا تھا۔ اب جو ہم باغ کی کٹائی کریں گے تو ایسا انتظام کریں گے کہ کوئی غریب آدمی وہاں آنے ہی نہ پائے۔ اس کے نتیجے میں جب وہ کٹائی کے لیے پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے باغ پر ایک ایسی آفت بھیج دی کہ سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔

اکثر روایتوں کے مطابق یہ واقعہ یمن کے شہر صنعاء سے کچھ فاصلے پر ضروان نامی ایک علاقے میں پیش آیا تھا، یہ علاقہ اب بھی ضروان کہلاتا ہے، اور میں نے دیکھا ہے، وہاں چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزے کے درمیان ایک کالے کالے پتھروں والا ویران علاقہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہی اس باغ کی جگہ تھی جو بعد میں آباد نہیں ہو سکی۔ واللہ اعلم۔ (توضیح القرآن)

آیت ۱۸ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ سارے کا سارا پھل ہم توڑ لیں گے، اور اس کے کسی حصے کا استثناء نہیں کریں گے، یعنی کوئی حصہ غریبوں کے لیے نہیں چھوڑیں گے۔ دوسرے استثناء کرنے کا ایک مطلب " ان شاء اللہ " کہنا بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم صبح ہوتے ہی پھل توڑ لیں گے تو اس وقت انہوں نے " ان شاء اللہ " نہیں کہا تھا۔

آیت ۲۶ کے ذیل میں لکھتے ہیں یعنی جب انہوں نے اپنے باغ کے پاس پہنچ کر دیکھا کہ وہاں درختوں کا نام ونشان ہی نہیں ہے تو شروع میں یہ سمجھے کہ وہ راستہ بھٹک کر کہیں اور پہنچ گئے ہیں۔)

آیت ۲۸ کے ذیل میں لکھتے ہیں: ان بھائیوں میں ایک دوسروں کی بہ نسبت اچھا تھا، اس نے پہلے بھی بھائیوں سے کہا تھا کہ اللہ کا ذکر کرو، اور غریبوں کو منع نہ کرو، لیکن بعد میں وہ بھی دوسرے بھائیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ (توضیح القرآن)

اُخروی باغات کے اصل حقدار

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ {۳۴} اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ {۳۵} مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ {۳۶} اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ {۳۷} اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ {۳۸} اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ {۳۹} القلم

جواب ترجمہ: بلاشبہ پرہیز گاروں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت والے باغ ہیں، کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے، تمہیں کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جسے تم پڑھتے ہو، اس میں تمہارے لیے وہ چیز لکھی ہوئی ہو جسے تم پسند کرتے ہو، کیا تمہارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں جو قیامت تک باقی رہنے والی ہیں کہ تمہیں وہ دیا جائے گا جس کا تم فیصلہ کرتے ہو۔

اوپر چونکہ دنیوی جنت والوں کا حال بیان ہوا تھا اور اللہ کی نافرمانی اور اس کے حکم کے خلاف کرنے سے ان پر جو بلا اور آفت آئی اس کا ذکر ہوا تھا اس لئے اب ان متقی پرہیز گار لوگوں کا حال ذکر کیا گیا جنہیں آخرت میں جنتیں ملیں گی جن کی نعمتیں نہ فنا ہوں، نہ گھٹیں، نہ ختم ہوں، نہ سڑیں، نہ گلیں، پھر فرماتا ہے کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمان اور گنہگار جزا میں یکساں ہو جائیں؟ قسم ہے زمین و آسمان کے رب کی کہ یہ نہیں ہو سکتا، کیا ہو گیا ہے تم کس طرح یہ چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی طرف سے اتری ہوئی کوئی ایسی کتاب ہے جو خود تمہیں بھی محفوظ ہو اور گزشتہ لوگوں کے ہاتھوں تم پچھلوں تک پہنچی ہو اور اس میں وہی ہو جو تمہاری چاہت ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ ہمارا کوئی مضبوط وعدہ اور عہد تم سے ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی ہو گا اور تمہاری بے جا اور غلط خواہشیں پوری ہو کر ہی

رہیں گی؟ ان سے ذرا پوچھو تو کہ اس بات کا کون ضامن ہے اور کس کے ذمے یہ کفالت ہے؟ نہ سہی تمہارے جو جھوٹے معبود ہیں انہی کو اپنی سچائی کے ثبوت میں پیش کرو۔ (تفسیر ابن کثیر)

منکرین سے چبھتا ہوا سوال

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ {۳۹} اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ {۴۱} القلم.

جواب ترجمہ: (اے پیغمبر) ان سے پوچھو کہ: ان میں سے کون ہے جس نے اس بات کی ضمانت لے رکھی ہو؟ کیا خدائی میں ان کے مانے ہوئے کچھ شریک ہیں (جو یہ ضمانت لیتے ہوں؟) تو پھر لے آئیں اپنے ان شریکوں کو، اگر وہ سچے ہیں۔

اصل میں لفظ زعیم استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں زعیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل، یا ضامن، یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے۔ (تفہیم القرآن)

گزشتہ آیت میں پوچھا گیا تھا کہ کیا انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مرضی کے مطابق ان سے سلوک کرے گا اور قیامت (اگر آگئی) تو وہاں بھی یہ لوگ نوازے جائیں گے۔ پیش نظر آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ ان سے یہ پوچھئے کہ تم جو عہد و پیمان وغیرہ کی باتیں کرتے ہو، کیا کوئی اس کا ضامن بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نبوت اور فلاح کا غیر مشروط ابدی پروانہ جاری کر رکھا ہے اور اگر کوئی ایسا ضامن نہیں ہے تو شاید ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کو ہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔ یہ دنیا میں جو کچھ بھی کرتے رہیں ان شریکوں کی انھیں پناہ حاصل ہے، وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا عتاب ان پر برسنے نہیں دیں گے۔

فرمایا جارہا ہے کہ اگر کچھ ایسے شرکاء ہیں اور تم اپنے دعوے میں واقعی سچے ہو تو پھر انھیں پیش کرو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریش بت پرستی میں مبتلا تھے، فرشتوں کی بھی پوجا کرتے تھے، جنات سے بھی استمداد کرتے تھے اور ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، باایں ہمہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے تحفظ کے لیے کبھی ان کا نام نہیں لیتے تھے کیونکہ قرآن کریم نے مسلسل تنقید سے ان کے اس مشرکانہ کاروبار کی بے حقیقتی مبرہن کر دی تھی اور آج اسی کا اثر ہے کہ ہندو جیسی مشرک قوم بھی کبھی اسے تسلیم نہیں کرتی اور وہ اپنے مشرکانہ رویئے پر تاویلات کے عجیب و غریب پردے تان کر اور جھول ڈال کر رکھتی ہے اور عجیب و غریب فلسفے اس نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ (روح القرآن)

جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ{۴۲}خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ{۴۳}القلم.

جواب ترجمہ: جس دن ساق کھول دی جائے گی، اور ان کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ سجدہ کر نہیں سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ان پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی۔ اس وقت بھی انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا جب یہ لوگ صحیح سالم تھے (اس وقت قدرت کے باوجود یہ انکار کرتے تھے)

اوپر چونکہ بیان ہوا تھا کہ پرہیز گار لوگوں کے لئے نعمتوں والی جنتیں ہیں اس لئے یہاں بیان ہو رہا ہے کہ یہ جنتیں انہیں کب ملیں گی؟ تو فرمایا کہ اس دن جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی۔ یعنی قیامت کے دن جو دن بڑی ہولناکیوں والا زلزلوں والا امتحان والا اور آزمائش والا اور بڑے بڑے اہم امور کے ظاہر ہونے کا دن ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو اس بارے میں فرماتے ہوئے یوں سنا، آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ یَکشِفُ رَبُّنا عَنْ سَاقِهٖ، فَیَسْجُدُ لَهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ، وَیَبْقَی مَنْ كَانَ یَسْجُدُ فِی الدُّنْیَا رِیَاءً وَسُمْعَةً، فَیَذْهَبُ لِیَسْجُدَ فَیَعُودُ ظَهْرُهٗ طَبَقًا وَاحِدًا ہمارا رب اپنی پنڈلی کھول دے گا پس ہر مومن مرد اور ہر مومنہ عورت سجدے میں گر پڑے گی، ہاں دنیا میں جو لوگ دکھاوے سناوے کے لئے سجدہ کرتے تھے وہ بھی سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی کمر تختہ کی طرح ہو جائے گی، یعنی ان سے سجدے کے لئے جھکا نہ جائے گا۔ (بخاری شریف، ابن کثیر)

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس دن کی ہولناکی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ هُوَ یَوْمُ كَرْبٍ وَشِدَّةٍ یہ دن تکلیف دکھ درد اور شدت کا دن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں هِیَ أَوَّلُ سَاعَةٍ تَكُونُ فِی یَوْمِ الْقِیَامَةِ قیامت کے دن کی پہلی گھڑی مراد ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں هُوَ الْأَمْرُ الشَّدِیدُ الْمُفْظِعُ مِنَ الْهَوْلِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یہ امر بہت سخت بڑی گھبراہٹ والا اور ہولناک ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حِینَ یُكْشَفُ الْأَمْرُ وَتَبْدُو الْأَعْمَالُ. وَكَشْفُهُ دُخُولُ الْآخِرَةِ. وَكَشْفُ الْأَمْرِ عَنْهُ جس وقت امر کھول دیا جائے گا اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور یہ کھلنا آخرت کا آجانا ہے اور اس سے کام کا کھل جانا ہے۔ (ابن جریر، ابن کثیر)

حضرت ابو بردہ بن ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا کہ عَنْ نُورٍ عَظِیمٍ، یَخِرُّونَ لَهٗ سُجَّدًا جس دن ایک نور عظیم سے پردہ اٹھایا جائے گا تو لوگ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر جائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ یوم یکشف الساق کے تحت بہت سی روایات لانے کے بعد فیصلہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں صحیح تفسیر وہی ہے جو بخاری شریف اور مسلم میں ہے۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ: پھر فرمایا جس دن ان لوگوں کی آنکھیں اوپر کو نہ اٹھیں گی اور ذلیل و پست ہو جائیں گے کیونکہ دنیا میں بڑے سرکش اور کبر و غرور والے تھے، صحت اور سلامتی کی

حالت میں دنیا میں جب انہیں سجدے کے لئے بلایا جاتا تھا تو رک جاتے تھے جس کی سزا یہ ملی کہ آج سجدہ کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے، پہلے کر سکتے تھے لیکن نہیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھ کر مومن سب سجدے میں گر پڑیں گے لیکن کافر و منافق سجدہ نہ کر سکیں گے، کمر تختہ ہو جائے گی جھکے گی ہی نہیں بلکہ پیٹھ کے بل چت گر پڑیں گے، یہاں بھی ان کی حالت مومنوں کے خلاف تھی وہاں بھی خلاف ہی رہے گی۔

کافروں کو ڈھیل اور پھر شکنجہ سخت

سوال اللہ تعالیٰ کافروں کو ڈھیل دیتا ہے اور دھیرے دھیرے ان کے گرد شکنجہ سخت کرتا ہے، پھر ان کافروں کو سزا کے لیے پکڑ لیتا ہے، ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ {۴۴} وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ {۴۵} القلم.

جواب ترجمہ: لہٰذا (اے پیغمبر) جو لوگ اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں انہیں مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم انہیں اس طرح دھیرے دھیرے (تباہی کی طرف) لے جائیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں۔ یقین رکھو میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یعنی قرآن کو جھٹلانے والوں کو تو چھوڑ دے، اس میں بڑی وعید ہے اور سخت ڈانٹ ہے کہ تو ٹھہر جا میں آپ ان سے نپٹ لوں گا، دیکھ تو سہی کہ کس طرح بتدریج انہیں پکڑتا ہوں یہ اپنی سرکشی اور غرور میں پڑتے جائیں گے میری ڈھیل کے راز کو نہ سمجھیں گے اور پھر ایک دم یہ پاپ کا گھڑا پھوٹے گا اور میں اچانک انہیں پکڑ لوں گا۔ میں انہیں بڑھاتا رہوں گا یہ بدمست ہوتے چلے جائیں گے وہ اسے کرامت سمجھیں گے حالانکہ وہ اہانت ہو گی۔

جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ (المؤمنون: ۵۵) یعنی کیا ان کا گمان ہے کہ مال و اولاد کا بڑھنا ان کے لئے ہماری جانب سے کسی

بھلائی کی بنا پر ہے، نہیں بلکہ یہ بے شعور ہیں۔

سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (الانعام :۴۴) جب یہ ہمارے وعظ وپند کو بھلا چکے تو ہم نے ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ انہیں جو دیا گیا تھا اس پر اترانے لگے تو ہم نے انہیں ناگہانی پکڑ لیا اور ان کی امیدیں منقطع ہو گئیں۔ یہاں بھی ارشاد ہوتا ہے میں انہیں ڈھیل دوں گا، بڑھاؤں گا اور اونچا کروں گا یہ میری تدبیر میرے مخالفوں اور میرے نافرمانوں کے ساتھ بہت بڑی ہے۔

بخاری مسلم میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا إِنَّ اللهَ تَعَالَى لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ، حَتَّى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے پھر جب پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ یعنی اسی طرح ہے تیرے رب کی پکڑ جبکہ وہ کسی بستی والوں کو پکڑتا ہے جو ظالم ہوتے ہیں اس کی پکڑ بڑی دردناک اور بہت سخت ہے۔ (سورۃ ھود ۱۰۲)

تبلیغ کا معاوضہ نہیں تو مخالفت کیوں؟

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ {۴۶} اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ {۴۷} القلم

جواب ترجمہ: کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ طلب کرتے ہیں کہ وہ اس کے تاوان سے دبے جارہے ہیں، یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے وہ لکھ رہے ہوں؟

سوال بظاہر رسول اللہ ﷺ سے کیا جارہا ہے، مگر اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت میں حد سے گزرے جارہے تھے۔ ان سے پوچھا جارہا ہے کہ کیا ہمارا رسول تم سے کچھ مانگ رہا ہے کہ تم

اس پر اتنا بگڑ رہے ہو؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ایک بے غرض آدمی ہے اور جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تم نہیں ماننا چاہتے تو نہ مانو، مگر اس تبلیغ پر آخر اتنے چراغ پا کیوں ہوئے جا رہے ہو؟ (تفہیم القرآن)

مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ میں تبلیغ شروع کی، توحید کا مسئلہ بیان کیا، رسالت کو بیان کیا، قیامت کا مسئلہ سمجھایا، شرک کی تردید کی، تو ان لوگوں نے آپ ﷺ کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور انکار کیا اللہ فرماتے ہیں **أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا**، کیا آپ ان سے سوال کرتے ہیں کسی معاوضے کا، اس تبلیغ کے سلسلے میں کوئی تنخواہ مانگتے ہیں، **فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ**، کہ وہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھ کے نیچے آئے ہوئے ہیں اور شدت سے مخالفت کرتے ہیں قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ نے یہ بات سمجھائی کہ پیغمبر اپنی تبلیغ کا کسی سے معاوضہ نہیں مانگتے۔ سورۃ شوریٰ آیت نمبر ۲۳ میں ہے، قل آپ ﷺ ان سے کہہ دیں، **لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا**، میں نہیں مانگتا اس پر تم سے کوئی معاوضہ، میرا اجر مجھے میرا اللہ دے گا۔

أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ: کیا ان کے پاس غیب ہے، پس وہ لکھتے ہیں کیا چیز ان کے لیے جائز ہے اور کیا چیز ان کے لیے ناجائز ہے؟ گزشتہ پیغمبروں کے واقعات کیا ہیں اور ان کو پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے یہ ساری چیزیں خود جانتے ہیں، حلال حرام کی باتیں پیغمبر بتلائے گا، تو سمجھ آئیں گی جنت دوزخ کی حقیقت پیغمبر بتلائے گا تو سمجھ آئے گی، پہلے پیغمبروں کے واقعات اللہ کا پیغمبر بتلائے گا، تو علم میں آئیں گے، کیا ان کو پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے، جب ان سب باتوں میں پیغمبر کی ضرورت ہے اور پیغمبر بغیر کسی معاوضے کے ان کو سمجھا رہا ہے تو پھر یہ ضد کیوں کرتے ہیں؟ (ذخیرۃ الجنان)

دعوت و تبلیغ پر صبر کی تلقین

سوال ان آیات کریمہ میں کیا بیان کیا گیا، ترجمہ اور تفسیر کریں۔ صاحب الحوت کون ہیں؟

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ {۴۸}لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ {۴۹}فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ{۵۰} القلم

جواب ترجمہ: غرض تم اپنے پروردگار کا حکم آنے تک صبر کیے جاؤ، اور مچھلی والے کی طرح مت ہو جانا۔ جب انہوں نے غم سے گھٹ گھٹ کر (ہمیں) پکارا تھا۔ اگر ان کے پروردگار کے فضل نے انہیں سنبھال نہ لیا ہوتا تو انہیں بری حالت کے ساتھ اسی کھلے میدان میں پھینک دیا جاتا۔ پھر ان کے پروردگار نے انہیں منتخب فرمالیا، اور انہیں صالحین میں شامل کر دیا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی! ﷺ اپنی قوم کی ایذاء پر اور ان کے جھٹلانے پر صبر و ضبط کرو، عنقریب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہونے والا ہے، انجام کار آپ کا اور آپ کے ماتحتوں کا ہی غلبہ ہو گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، دیکھو! تم مچھلی والے نبی کی طرح نہ ہونا، اس سے مراد حضرت یونس بن متی علیہ السلام ہیں جبکہ وہ اپنی قوم پر غضب ناک ہو کر نکل کھڑے ہوئے پھر جو ہوا سو ہوا، یعنی آپ کا جہاز میں سوار ہونا مچھلی کا آپ کو نگل جانا اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانا اور ان تہ بہ تہ اندھیروں میں اس قدر نیچے آپ کا سمندر کو اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے سننا اور خود آپ کا بھی پکارنا (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الأنبياء:۸۷) پڑھنا پھر آپ کی دعا کا قبول ہونا اس غم سے نجات پانا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس کے بعد اللہ سبحان و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ {فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ} (الأنبياء:۸۸) ہم نے ان کی دعا قبول کی، انہیں غم سے نجات دی اور ہم اسی طرح ایمانداروں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ {فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ} (الصّٰفّٰت: ۱۴۳، ۱۴۴) اگر وہ تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں پڑے

رہتے، یہاں سورۃ القلم میں بھی فرمان ہے کہ {إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ} جب اس نے غم اور دکھ کی حالت میں ہمیں پکارا۔ (ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ بحوالہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ

خَرَجَتِ الْكَلِمَةُ تَحُفُّ حَوْلَ الْعَرْشِ، فَقَالَتِ الْمَلَائِكَةُ: يَا رَبِّ، هٰذَا صَوْتٌ ضَعِيفٌ مَعْرُوفٌ مِنْ بِلَادٍ غَرِيبَةٍ. فَقَالَ اللهُ أَمَا تَعْرِفُونَ هٰذَا؟ قَالُوا: لَا. قَالَ: هٰذَا يُونُسُ. قَالُوا: يَا رَبُّ، عَبْدُكَ الَّذِي لَا يَزَالُ يُرْفَعُ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ وَدَعْوَةٌ مُجَابَةٌ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالُوا: أَفَلَا تَرْحَمُ مَا كَانَ يَعْمَلُهُ فِي الرَّخَاءِ فَتُنْجِيهِ مِنَ الْبَلَاءِ؟ فَأَمَرَ اللهُ الْحُوتَ فَأَلْقَاهُ بِالْعَرَاءِ، وَلِهٰذَا قَالَ تَعَالَى: {فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ}

حضرت یونس علیہ السلام کی زبان سے جونہی یہ کلمہ نکلا تو عرش پر پہنچا، فرشتوں نے کہا یارب! اس کمزور غیر معروف شخص کی آواز تو ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے پہلے کی سنی ہوئی ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اسے پہچانا نہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا نہیں، جناب باری نے فرمایا یہ میرے بندے یونس کی آواز ہے فرشتوں نے کہا پروردگار پھر تو تیرا یہ بندہ وہ ہے جس کے اعمال صالحہ روز آسمانوں پر چڑھتے رہے جس کی دعائیں ہر وقت قبولیت کا درجہ پاتی رہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا سچ ہے، فرشتوں نے کہا، پھر اے ارحم الراحمین! ان کی آسانیوں کے وقت کے نیک اعمال کی بنا پر انہیں اس سختی سے نجات عطا فرما، چنانچہ فرمان باری ہوا کہ اے مچھلی تو انہیں اُگل دے اور مچھلی نے انہیں کنارے پر آکر اُگل دیا۔ یہاں بھی یہی بیان ہو رہا ہے کہ اللہ نے اسے پھر برگزیدہ بنالیا اور نیک کاروں میں کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَقُولَ: أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى (مسند احمد) کسی کو لائق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حضرت یونس بن متی سے افضل بتائے۔

نظر بد کی تاثیر

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ {۵۱} وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ {۵۲} القلم.

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے جب وہ نصیحت کی یہ بات سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنی (تیز تیز) آنکھوں سے تمہیں ڈگمگا دیں گے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو دیوانہ ہے۔ حالانکہ یہ تو دنیا جہان کے لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہی نصیحت ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تیرے بغض و حسد کی وجہ سے یہ کفار تو اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر تجھے پھسلا دینا چاہتے ہیں اگر اللہ کی طرف سے حمایت اور بچاؤ نہ ہوتا تو یقیناً یہ ایسا کر گذرتے۔ اس آیت میں دلیل ہے اس امر پر کہ نظر کا لگنا اور اس کی تاثیر کا اللہ کے حکم سے ہونا حق ہے جیسا کہ بہت سی احادیث میں بھی ہے جو کئی کئی سندوں سے مروی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ أَوْ دَمٍ لَا يَرْقَأُ (ابوداؤد) دم جھاڑ صرف نظر کا اور زہریلے جانوروں کا اور نہ تھمنے والے خون کا ہے۔

ایک غریب حدیث ابو یعلی میں ہے کہ إِنَّ الْعَيْنَ لَتُولِعُ الرجلَ بِإِذْنِ اللّٰهِ، فَيَتَصَاعَدُ حَالِقًا، ثُمَّ يَتَرَدَّى مِنْهُ ترجمہ: بے شک نظر بد اللہ کے اذن سے آدمی پر اثر انداز ہوتی ہے، اگر وہ اونچی جگہ پر ہو تو نظر بد کی وجہ سے نیچے گر سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَا شَيْءَ فِي الْهَامِّ، وَالْعَيْنُ حَقٌّ، وَأَصْدَقُ الطِّيَرَةِ الْفَأْلُ (مسند احمد) کھوپڑی کے الو میں کوئی حقیقت نہیں ہے، نظر حق ہے، سب سے سچا شگون فال ہے۔ (الو کو دن میں دکھائی نہیں دیتا ہے، تو وہ رات کو نکلتا ہے، اور اکثر ویرانوں میں رہتا ہے، عرب لوگ اس کو منحوس جانتے تھے، اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ مقتول کی روح الو بن کر پکارتی پھرتی ہے، جب اس کا بدلہ لے لیا جاتا ہے تو وہ اڑ جاتا ہے، رسول اکرم ﷺ نے اس خیال کو باطل قرار دیا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلعَینُ حَقٌّ، اَلْعَیْنُ حَقٌّ، تَسْتَنْزِلُ الْحَالِقَ (مسند احمد) نظر بد حق ہے، نظر بد حق ہے۔ وہ (کبھی کبھی) اونٹنی کو ہلاک تک کر دیتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْعَیْنُ حَقٌّ، وَلَوْ کَانَ شَیْءٌ سَابَقَ القَدَرَ سَبَقَتِ الْعَیْنُ، وَإِذَا اغْتُسِلتُم فَاغْسِلُوا (مسلم) نظر حق ہے اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر کر جاتی جب تم سے غسل کرایا جائے تو غسل کر لیا کرو۔

عبد الرزاق میں ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ پناہ میں دیتے تھے أُعِیذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَّةِ، مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَهَامَّة، وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لامَّة، وَیَقُولُ هٰکَذَا کَانَ إِبْرَاهِیمُ یُعَوِّذ إِسْحَاقَ وَإِسْمَاعِیلَ، عَلَیْهِمَا السَّلَامُ (عبد الرزاق، بخاری، وکتب السنن، تفسیر ابن کثیر) یعنی تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے بھرپور کلمات کی پناہ میں سونپتا ہوں ہر شیطان سے اور ہر ایک زہریلے جانور سے اور ہر ایک لگ جانے والی نظر سے اور فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انہی الفاظ سے اللہ کی پناہ دیا کرتے تھے۔

ابن ماجہ میں ہے کہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ غسل کر رہے تھے عامر بن ربیعہ کہنے لگے میں نے تو آج تک ایسا بدن کسی پردہ نشین کا بھی نہیں دیکھا بس ذرا سی دیر میں وہ بیہوش ہو کر گر پڑے لوگوں نے حضور ﷺ سے کہا یا رسول اللہ ﷺ ان کی خبر لیجئے یہ تو بیہوش ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کسی پر تمہارا شک بھی ہے لوگوں نے کہا ہاں عامر بن ربیعہ پر۔

آپ ﷺ نے فرمایا عَلَامَ یَقْتُلُ أَحَدُکُمْ أَخَاهُ؟ إِذَا رَأَی أَحَدَکُمْ مِنْ أَخِیهِ مَا یُعجبه فَلْیَدْعُ لَهُ بِالْبَرَکَةِ، ثُم دَعَا بِمَاءٍ فَأَمَرَ عَامِرًا أَنْ یَتَوَضَّأَ فَیَغْسِلُ وَجْهَهُ وَیَدَیْهِ إِلَی الْمِرْفَقَیْنِ، وَرُکْبَتَیْهِ، وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ، وَأَمَرَهُ أَنْ یَصُبَّ عَلَیْهِ (ابن کثیر)

تم میں سے کیوں کوئی اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے؟ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی کسی ایسی چیز کو دیکھے کہ اسے بہت اچھی لگے تو اسے چاہیے کہ اس کے لئے برکت کی دعا کرے، پھر پانی منگوا کر عامر سے فرمایا تم وضو کرو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور گھٹنے اور تہد کے اندر کا حصہ جسم دھوڈالو اور حکم دیا کہ یہ پانی اس کے اوپر ڈالا جائے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا برتن کو اس کی پیٹھ کے پیچھے سے اوندھادو، نسائی وغیرہ میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنات کی اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، جب سورہ معوذتین نازل ہوئیں تو آپ نے انہیں لے لیا اور سب کو چھوڑ دیا (ابن ماجہ)

مسند وغیرہ میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا

فَقَالَ: اشْتَكَيْتَ يَا مُحَمَّدُ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ وَّعَيْنٍ يَشْفِيكَ، بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بیمار ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، تو جبریل صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا (دعا) بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ وَّعَيْنٍ يَشْفِيكَ، بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ، بخاری مسلم کی حدیث میں ہے کہ یقیناً نظر کا لگ جانا برحق ہے، مسند احمد کی ایک روایت میں اس کے بعد یوں بھی ہے کہ اس کا سبب شیطان ہے اور ابن آدم کا حسد ہے۔

مسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شگون تین چیزوں میں ہے گھر، گھوڑا اور عورت تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا پھر تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کہوں گا جو آپ نے نہیں فرمایا ہاں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تو سنا ہے کہ آپ نے فرمایا سب سے سچا شگون نیک فالی ہے اور نظر کا لگنا حق ہے۔

ترمذی میں ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے بچوں کو نظر لگ جایا کرتی ہے تو کیا میں کچھ دم کرالیا کروں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کر جانے والی ہوتی تو وہ نظر تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی حضور ﷺ کا نظر بد سے دم کرنے کا حکم مروی ہے (ابن ماجہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نظر لگانے والے کو حکم کیا جاتا تھا کہ وہ وضو کرے اور جس کو نظر لگی ہے اسے اس پانی سے غسل کرایا جاتا تھا (احمد)

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ دونوں بزرگ غسل کے ارادے سے چلے اور حضرت عامر رضی اللہ عنہ پانی میں غسل کے لئے اترے اور ان کا بدن دیکھ کر حضرت سہل رضی اللہ عنہ کی نظر لگ گئی اور وہ وہیں پانی میں خرخراہٹ کرنے لگے میں نے تین مرتبہ آوازیں دیں لیکن جواب نہ ملا میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ سنایا آپ خود تشریف لائے اور تھوڑے سے پانی میں تہمد اونچا اٹھائے ہوئے وہاں تک پہنچے اور ان کے سینے میں ہاتھ مارا اور دعا کی (اَللّٰھُمَّ اصْرِفْ عَنْہُ حَرَّھَا وَبَرْدَھَا وَوَصَبَھَا) اے اللہ! تو اس سے اس کی گرمی اور سردی اور تکلیف دور کر دے۔ مسند بزار میں ہے کہ أَكْثَرُ مَنْ يَّمُوتُ مِنْ أُمَّتِي بَعْدَ كِتَابِ اللهِ وَقَضَائِهِ وَقَدْرِهِ بِالْأَنْفُسِ میری امت کی لکھت اور قضاء وقدر کے بعد اکثر موت نظر سے ہو گی۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ الْعَيْنُ حَقٌّ، لَتُورِدُ الرَّجُلَ الْقَبْرَ، وَالْجَمَلَ الْقِدْرَ، وَإِنَّ أَكْثَرَ هَلَاكِ أُمَّتِي فِي الْعَيْنِ (الکامل لابن عدی، تفسیر ابن کثیر) نظر حق ہے انسان کو قبر تک پہنچا دیتی ہے اور اونٹ کو ہنڈیا تک، میری امت کی اکثر ہلاکت نظر لگنے سے ہے۔

فرمان رسالت مآب ﷺ ہے کہ لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ، وَلَا هَامَّةَ وَلَا حَسَدَ، وَالْعَيْنُ حَقٌّ (احمد) ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی اور نہ الو کی وجہ سے بربادی کا یقین کر لینا کوئی واقعیت رکھتا ہے اور نہ حسد کوئی چیز ہے، ہاں نظر سچ ہے۔

ابن عساکر میں ہے کہ جبریل حضور ﷺ کے پاس آئے آپ اس وقت غمزدہ تھے جب پوچھا تو فرمایا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو نظر لگ گئی ہے، فرمایا یہ سچائی کے قابل چیز ہے نظر واقعی لگتی ہے،

آپ نے یہ کلمات پڑھ کر انہیں پناہ میں کیوں نہ دیا؟ حضور ﷺ نے پوچھا وہ کلمات کیا ہیں؟ فرمایا یوں کہو اَللّٰھُمَّ ذَا السُّلْطَانِ الْعَظِیمِ، ذَا الْمَنِّ الْقَدِیمِ، ذَا الْوَجْهِ الْکَرِیمِ، وَلِیَّ الْکَلِمَاتِ التَّامَّاتِ، وَالدَّعَوَاتِ الْمُسْتَجَابَاتِ، عَافِ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ مِنْ أَنْفُسِ الْجِنِّ، وَأَعْیُنِ الْإِنْسِ، اے اللہ! اے بہت بڑی بادشاہی والے! اے زبردست قدیم احسانوں والے! اے بزرگ تر چہرے والے! اے پورے کلموں والے! اور اے دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دینے والے! تو حسن اور حسین کو تمام جنات کی ہواؤں سے اور تمام انسان کی آنکھوں سے اپنی پناہ دے۔ حضور ﷺ نے یہ دعا پڑھی وہیں دونوں بچے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے کھیلنے کودنے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا لوگو! اپنی جانوں کو اپنی بیویوں کو اور اپنی اولاد کو اسی پناہ کے ساتھ پناہ دیا کرو، اس جیسی اور کوئی پناہ کی دعا نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہاں یہ کافر اپنی حقارت بھری نظریں آپ پر ڈالتے ہیں وہاں اپنی طعنہ آمیز زبان بھی آپ پر کھولتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو قرآن لانے میں مجنون ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے قرآن تو اللہ کی طرف سے تمام عالم کے لئے نصیحت نامہ ہے۔

الحمد للہ سورۃ نون والقلم آج اختتام کو پہنچی۔ خادم اسلام۔ محمود الرشید عباسی حدوٹی

۱۵ اپریل ۲۰۱۹ء ۲۹ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ بروز جمعہ سوا دس بجے صبح

حروف بینی: ۲۸ جولائی ۲۰۱۹ء بروز اتوار۔ کاشانہ فقیر حدوٹی حدوٹ، مری

☆☆☆☆

الحاقہ

قیامت ایک حقیقت ہے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ﴿۳﴾ الحاقة.

جواب **ترجمہ:** وہ حقیقت ہو کر رہے گی۔ کیا ہے وہ حقیقت جو ہو کر رہے گی؟ اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ حقیقت کیا ہے جو ہو کر رہے گی؟

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس مقام پر ان الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ الحآقۃ۔ مالحآقۃ سے مراد قیامت ہے۔

وجہ تسمیہ: امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سُمِّيَتْ بِذَلِكَ لِأَنَّ الْأُمُورَ تَحِقُّ فِيهَا قیامت کو الحاقہ کا نام اس لئے دیا کیونکہ اس میں امور کو واقع کیا جائے گا، گویا اسے لَيْلٍ نَائِمٍ کے باب سے بنایا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے سُمِّيَتْ حَاقَّةً لِأَنَّهَا تَكُونُ مِنْ غَيْرِ شَكٍّ اسے حاقہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بغیر کسی شک و شبہ کے واقع ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے سُمِّيَتْ بِذَلِكَ لِأَنَّهَا أَحَقَّتْ لِأَقْوَامِ الْجَنَّةَ، وَأَحَقَّتْ لِأَقْوَامِ النَّارَ، اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ اس نے بعض اقوام کے لئے جنت کو ثابت کیا اور کچھ اقوام کے لئے جہنم کو ثابت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سُمِّيَتْ بِذَلِكَ لِأَنَّ فِيهَا يَصِيرُ كُلُّ إِنْسَانٍ حَقِيقًا بِجَزَاءِ عَمَلِهِ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر انسان اپنے عمل کی جزا کا حقدار ہو جائے گا۔

ازہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عربی محاورہ میں یوں کہا جاتا ہے يُقَالُ حَاقَقْتُهُ فَحَقَقْتُهُ أَحُقُّهُ، أَيْ غَالَبْتُهُ فَغَلَبْتُهُ. فَالْقِيَامَةُ حَاقَّةٌ لِأَنَّهَا تَحُقُّ كُلَّ مُحَاقٍّ فِي دِينِ اللَّهِ بِالْبَاطِلِ، أَيْ كُلَّ

مُخَاصِمٍ، میں نے اس پر غلبہ پانے کی کوشش کی تو میں اس پر غالب آگیا۔ قیامت غالب آنے والی ہے کیونکہ یہ ہر اس فرد پر غالب آنے والی ہے جو باطل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین میں جھگڑا کرتا ہے۔

لغت کی کتاب صحاح میں ہے وَحَاقَّهُ أَيْ خَاصَمَهُ وَادَّعَى كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْحَقَّ، فَإِذَا غَلَبَهُ قِيلَ حَقُّهُ. وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ إِذَا خَاصَمَ فِي صِغَارِ الْأَشْيَاءِ: إِنَّهُ لَنَزِقُ الْحِقَاقِ مَالُهُ فِيهِ حَقٌّ وَلَا حِقَاقٌ، أَيْ خُصُومَةٌ، حاقہ اس سے جھگڑا کیا اور ان میں سے ہر ایک نے حق کا دعویٰ کیا جب اس پر غالب آگیا تو کہا گیا۔ حقہ وہ آدمی جو حقیر چیزوں کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے: انہ لنزق الحقاق اور یہ کہا جاتا ہے: مالہ فیہ حق و حقاق اس کا اس میں نہ کوئی حق ہے اور نہ ہی کوئی جھگڑا ہے۔ تحاق کا معنی باہم جھگڑا کرنا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ التحاق کا معنیٰ جھگڑنا ہے۔ حاقہ، حقہ اور حق تینوں لغتیں ایک معنیٰ میں ہیں۔ کسائی اور مورج نے کہا: حاقہ سے مراد یوم حق ہے، عرب کہتے ہیں، لَمَّا عَرَفَ الْحُقَّةَ مِنِّي هَرَبَ جب اس نے میرا حق پہچانا تو بھاگ گیا۔

قرآن کریم میں قیامت کے بہت سے نام آئے ہیں " حاقہ " بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ قیامت کفار کے لئے ایک ہولناک دن بھی ہے اس لئے اس کی طرف پوری توجہ دلانے کے لئے سوالیہ انداز اختیار فرمایا۔ حاقہ ایک ایسی سچائی ہے جس کا آنا اور واقع ہونا یقینی ہے۔ قیامت کے دن پر یقین رکھنے والا ذہنی پستی، اخلاقی بگاڑ اور گناہوں کی دلدل میں نہیں پھنس سکتا۔

آخرت کا یقین، انسان کے کردار کی بلندی اور اس کی نجات کی ضمانت ہے۔ جس قوم نے بھی آخرت اور قیامت کا انکار کیا اس نے اپنی دنیا کو اپنے ہاتھوں برباد کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بہت زبردست اور ترقی یافتہ قوموں قوم عاد اور قوم ثمود کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے جب اللہ و رسول اور آخرت کو جھٹلایا اور نافرمانیوں کی انتہا کر دی تو ان پر اس طرح عذاب آیا کہ آج وہ صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ (بصیرت قرآن)

القارعہ اور الطاغیہ کا مفہوم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں القارعہ اور الطاغیہ کا کیا مفہوم ہے؟

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ الحاقة.

جواب ترجمہ: ثمود اور عاد کی قوموں نے اسی جھنجوڑ ڈالنے والی حقیقت کو جھٹلایا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جو ثمود کے لوگ تھے، وہ (چنگھاڑ کی) ایسی آفت سے ہلاک کیے گئے جو حد سے زیادہ (خوفناک) تھی۔

ان آیات میں یہ قانون واضح فرمایا ہے۔ کہ کوئی قوم زندگی کا اس وقت تک استحقاق نہیں رکھتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت نہ کرے اور اپنی خواہشات کو اس کے ارادہ اور منشا کے تابع نہ کر دے، کیونکہ مقدرات میں سے ہے، کہ کوئی نفس اس سرچشمہ حیات سے دور اور الگ رہ کر اپنی انفرادیت باقی نہیں رکھ سکتا، چنانچہ جب کسی قوم نے اس اصول کو نہیں سمجھا اور اللہ کے حکموں کی پرواہ نہیں کی، اس کا غصہ بھڑکا اور اس کو زندگی سے محروم کر دیا۔

ثمود وعاد کی قوم مٹادی گئی، فرعون اور اس کا لاؤ لشکر قلزم میں اپنی عزت و حکمت سمیت ڈبو دیا گیا، قوم لوط کی بستیاں الٹ دی گئیں اور اسی طرح جب بھی کسی قوم نے سرکشی اور تمرد کا اظہار کیا، اللہ نے اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا، اس کے بعد ایک دوسرے قانون کا ذکر فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں فاسقوں اور فاجروں کو اللہ نے سزا دی ہے، وہاں عین حالت عذاب میں پاکبازوں کی حفاظت اور ان کی دستگیری کی ہے۔

مثال میں حضرت نوح کو دیکھئے کہ اس وقت جب کہ آسمان کے دروازے کھل گئے اور زمین کے چشمے سمندر اگلنے لگے، اللہ نے ان کو توفیق مرحمت فرمائی کہ اپنی اور مومنین کی حفاظت کیلئے ایک کشتی بنائیں اور اس کو بلا خطر اس طوفان میں ڈال دیں اور یہ اس لئے ہوا تاکہ منکرین یہ محسوس کریں کہ یہ عذاب محض اتفاق و بخت کا نتیجہ نہیں بلکہ علیم و حکیم خدا کے فیصلہ کے مطابق نازل ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں نافرمانوں کو غرق کیا گیا ہے، وہاں مومنوں کو بھی بچایا گیا ہے (سراج البیان)

قَارِعَه سے مراد قیامت ہے سُمِّيَتْ بِذٰلِكَ لِأَنَّهَا تَقْرَعُ النَّاسَ بِأَهْوَالِهَا اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ لوگوں کو اپنی ہولناکیوں سے کھٹکھٹاتی ہے۔ عربی زبان میں یہ جملہ بولا جاتا ہے أَصَابَتْهُمْ قَوَارِعُ الدَّهْرِ انہیں حادثات زمانہ پہنچے۔ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَوَارِعِ فُلَانٍ ولواذعه وَقَوَارِصِ لِسَانِهِ، ہم فلاں کی طرف سے دی جانے والی مصیبتوں، آفتوں اور بدکلامیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ قوارص یہ قارصہ کی جمع ہے جس کا معنیٰ تکلیف دہ حکم ہے

اسی قارعہ سے قوارع القرآن ہے، قَوَارِعُ الْقُرْآنِ: الْآيَاتُ الَّتِي يَقْرَؤُهَا الْإِنْسَانُ إِذَا فَزِعَ مِنَ الْجِنِّ أَوِ الْإِنْسِ، نَحْوَ آيَةِ الْكُرْسِيِّ، كَأَنَّهَا تَقْرَعُ الشَّيْطَانَ، قوارع القرآن اس سے مراد وہ آیات ہیں جو انسان، جنوں یا انسانوں سے خوف زدہ ہو کر پڑھتا ہے جس طرح آیت الکرسی، گویا یہ شیطان کو کھٹکھٹاتی ہے۔

علامہ مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ الْقَارِعَةُ مَأْخُوذَةٌ مِنَ الْقُرْعَةِ فِي رَفْعِ قَوْمٍ وَحَطِّ آخَرِينَ: قَارِعَه قَرعَة سے ماخوذ ہے یعنی وہ بعض لوگوں کو بلند اور بعض کو پست کر دیتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَنَى بِالْقَارِعَةِ الْعَذَابَ الَّذِي نَزَلَ بِهِمْ فِي الدُّنْيَا، وَكَانَ نَبِيُّهُمْ يُخَوِّفُهُمْ بِذٰلِكَ فَيُكَذِّبُونَهُ (تفسیر قرطبی) قارعہ سے مراد ایسا عذاب ہے جو دنیا میں ان پر نازل ہوا، ان کا نبی انہیں اس بارے میں خبردار کرتا تھا تو وہ اس نبی کی تکذیب کرتے تھے۔

قوم ثمود جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی ان کی بستیاں شام اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھیں، محمد بن اسحاق نے کہا یہ وادی قریٰ ہے، یہ عرب تھے جہاں تک عاد کا تعلق ہے وہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی، ان کی بستیاں احقاف کے علاقہ میں تھیں، احقاف سے مراد عمان سے لے کر حضر موت تک کا علاقہ ہے اور پورا یمن مراد ہے، یہ عربی تھے، بڑے مضبوط جسم والے تھے۔

الطَّاغِيَة: طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ حد سے نکل جانے کے ہیں، طاغیہ کا معنیٰ ہو گا وہ چیز جو اپنی حدود و قیود سے متجاوز ہو جائے، قوم ثمود بھی اللہ تعالیٰ کیخلاف طغیان میں مبتلاء ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جو آفت مسلط کی، اسے طاغیہ فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۷۸ میں اس کو الرجفہ یعنی زبردست زلزلہ کہا گیا ہے اور سورۃ ہود آیت ٦٧ میں اس کے لیے الصیحہ یعنی زور کے دھماکے سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ تینوں لفظ ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔

اس سے مراد ایسی سخت آواز ہے جس کو انسان کا قلب و دماغ برداشت نہ کر سکے، معلوم ہوتا ہے ان پر ایسا زلزلہ آیا جس میں دھماکے تھے اور ہولناک آوازیں تھیں جس سے ان کے دل شق ہو گئے، کوئی تعجب نہیں کہ ان پر بجلیاں بھی کوندی ہوں اور ان کی وجہ سے ان دھماکوں میں مزید اضافہ ہوا ہو۔ (تفسیر روح القرآن)

بے قابو طوفانی ہوا کی سرکشی

سوال اللہ تعالیٰ نے قوم عاد پر جو ہوا مسلط کی وہ کتنے دن تک رہی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ {٦}سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۗ {٧}فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ {٨} الحاقة.

جواب ترجمہ: اور جو عاد کے لوگ تھے، انہیں ایک ایسی بے قابو طوفانی ہوا سے ہلاک کیا گیا۔ جسے اللہ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن لگاتار مسلط رکھا۔ چنانچہ تم (اگر وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ لوگ وہاں کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح پچھاڑے ہوئے پڑے تھے، اب کیا ان میں سے کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار ہوا چلائی، اس میں کوئی وقفہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ کسی لمحہ اس دوران تھمتی تھی، ان راتوں اور دنوں میں دیکھنے والے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لوگ مرے پڑے تھے جس طرح سروقد کھجور کے درخت گرے پڑے ہوں، ان آیات میں اسی کا بیان دیا جارہا ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ ہوا میں سے کوئی چیز نہیں بھیجتے مگر پیمانہ کے ساتھ اور کوئی قطرہ بارش کا نازل نہیں فرماتے مگر پیمانے کے ساتھ، سوائے قوم نوح اور قوم عاد پر کہ ان دونوں کو بغیر کسی پیمانے اور حد کے بھیجا اور نوح علیہ السلام کی قوم کو جب تباہ وبرباد کیا تو پانی اس کے خازن فرشتوں پر بھی غالب آگیا اور ان کے لیے اس پر قابو پانے کا کوئی راستہ نہیں رہا پھر یہ آیت پڑھی آیت انالما طغا الماء (جب پانی نے جوش مارا) اور قوم عاد کی تباہی کے وقت ہوا خازن فرشتوں پر غالب آگئی اور ان کے لیے اس سے بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں رہا پھر یہ آیت پڑھی۔ بریح صرصر عاتیہ۔ (تفسیر در منثور)

ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے روایت کیا کہ فرشتوں کے ہاتھوں سے بغیر پیمانے اور مقرر حد کے بارش کا کوئی قطرہ نازل نہیں ہوا سوائے نوح علیہ السلام کی قوم پر آنے والے سیلاب کے کیونکہ اس دن پانی کو خازن فرشتوں کے بغیر اجازت دے دی، لیکن اس دن پانی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے خازن فرشتوں پر غالب آگیا اور پھر نکل گیا اور قوم عاد کی تباہی کے دن کے سوا فرشتوں کے ہاتھوں بغیر حدود اور پیمانے کے کبھی ہوا نہیں چلی، کیونکہ اس دن اسے نگران فرشتوں کے بغیر چلنے کی اجازت دے دی گئی ہو وہ نکل گئی اسی کو فرمایا اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے) نگران فرشتوں پر غالب آگئی۔ (تفسیر در منثور)

ابو الشیخ رحمہ اللہ نے العظمت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری صَبا کے ساتھ مدد کی گئی اور قوم عاد کو دَبور کے ساتھ ہلاک کیا گیا پھر فرمایا ذمہ دار فرشتوں کو حکم دیا گیا

کہ وہ قوم عاد پر ہوا کو بھیجیں انگوٹھی کی مقدار سوراخ سے تو وہ ذمہ دار فرشتوں پر غالب آگئی اور وہ داروغوں کے کناروں سے نکل گئی تو اس لیے فرمایا آیت بریح صرصر عاتیہ پھر فرمایا وہ تیز اور تند ہوا جو ذمہ دار فرشتوں پر غالب آگئی۔ وہ دیہات کے رہنے والوں پر سب سے پہلے چلی اور اس نے انہیں ان کے مویشیوں اور ان کے گھروں کے ساتھ اٹھالیا اور ان کو شہری آبادی کے سامنے لے آئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُمْطِرُنَا (الاحقاف) جب انہوں نے اسے دیکھا کہ وہ ایک بادل ہے جو ان کے میدانوں کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے کہنے لگے یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔

جب ہوا قریب آئی تو ان پر چھا گئی تو لوگ اور مویشی اس میں آگے بڑھ گئے تو اس نے دیہاتیوں کو شہریوں پر پھینک دیا وہ ان کو توڑنے لگی تو وہ سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

قومِ عاد، قومِ ثمود، فرعون اور قومِ لوط کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ یہاں مؤتفکات اور الخاطئہ کا کیا مفہوم ہے اور اخذۃ رابیہ کا کیا معنیٰ ہے؟

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ الحاقة.

جواب ترجمہ: اور فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور لوط (علیہ السلام) کی الٹی ہوئی بستیوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغمبر کی نافرمانی کی تھی، اس لیے اللہ نے انہیں سخت پکڑ میں لے لیا۔

قوم عاد اور قوم ثمود کی سرکشی پر انہیں اللہ نے پکڑا، پھر فرعون اور قوم لوط کو اپنے وقت پر اللہ نے جرائم و سرکشیوں کی عبرت ناک سزا دی، اسی کا ذکر اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرمارہے ہیں، ڈاکٹر

اسلم صدیقی لکھتے ہیں قومِ عاد و ثمود کے انجام کے ذکر کے بعد فرعون اور قوم لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے آثار قریش کے تجارتی اسفار میں جابجا دکھائی دیتے تھے، فرعون اگرچہ مصر میں ہوا اور قریش کا مصر سے کوئی تجارتی تعلق نہ تھا، البتہ یہود کی ہمسائیگی کی وجہ سے وہ فرعون کے انجام سے ناواقف نہ تھے اور قوم عاد کی بستیوں کے کھنڈرات تو ان کے راستے میں پڑتے تھے، اس لیے قوم عاد و ثمود کے بعد ان کا ذکر کر کے قریش اور دیگر اہلِ عرب کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ یہ سب قومیں تکذیب قیامت اور تکذیب رُسل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں اور آج تم اسی راستے پر چل رہے ہو، تمہیں ان قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (روح القرآن)

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اگلی آیت کریمہ میں جرم کی نوعیت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو بے سبب نہیں پکڑا بلکہ ان پر عذاب کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی نافرمانی کرتے تھے، جو رسول بھی ان قوموں کی طرف آیا، اس نے ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تم جو زندگی گزار رہے ہو اس کے ایک ایک لمحے کی کاروائی محفوظ رکھی جارہی ہے، تمہارا ہر عمل محفوظ ہو رہا ہے، اس زندگی کے بعد ہمیشہ کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اور زندگی آنے والی ہے جسے قیامت یا آخرت کہتے ہیں۔

اس زندگی میں کیے ہوئے ہر عمل کا حساب وہاں دینا پڑے گا، اس لیے اس زندگی کو اس طرح گزارو جس طرح میں تمہیں تعلیم دے رہا ہوں کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس نے اپنا دین مجھ پر اتارا ہے، میں وہ ضابطہ حیات لے کر مبعوث ہوا ہوں جو تمہارے لیے زندگی کا ضابطہ اور قانون ہے اور جس کے مطابق تمہیں زندگی گزارنی ہے اور اسی کے حوالے سے تم سے بازپرس ہوگی، میری اطاعت اور میرا اتباع تم پر لازم ہے کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا نمائندہ ہوں۔

اگر تم مجھے تسلیم کرنے سے انکار کروگے تو تم حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا انکار کروگے اور تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے، لیکن جب انھوں نے بار بار کی تنبیہ کے باوجود اللہ تعالیٰ کے رسول کو ماننے سے انکار کر دیا، نہ صرف اس کی نافرمانی کی بلکہ اس کی زندگی کے درپے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں انہیں پکڑا، کیونکہ اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کیخلاف عَلَم بغاوت بلند کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سفیر بن کر آتا ہے اور پھر جب انہیں پکڑا تو ایسا پکڑا جس کی وہ مدافعت کرنے پر قادر نہ تھے۔(تفسیر روح القرآن لدکتور اسلم)

مُؤْتَفِكٰتُ: کے معنی باہم مختلط اور ملے جلے کے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کو **مُؤْتَفِكٰتُ** یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سب آپس میں ملی ہوئی بستیاں تھیں اور یا اس لیے کہ عذاب آنے کے وقت جب ان کا تختہ الٹا گیا تو سب گڈمڈ ہو گئیں اور بعض اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی ہے، الٹی ہوئی، قوم لوط کی بستیاں زلزلہ سے الٹ دی گئی تھیں اور کنکر برسانے والی ہوا نے ان کو ریت اور کنکروں سے ڈھانپ دیا تھا، اس لیے ان کو **مُؤْتَفِكٰتُ** کہا جاتا ہے۔(روح القرآن)

خَاطِئَه: سے مراد وہ جرائم اور گناہ ہیں جو وہ کرتے تھے، جیسے کفر و شرک جیسے بڑے جرائم اسی طرح فحاشی پھیلاتے اور اس میں خود بھی بری طرح مبتلا تھے۔

ارباب تفسیر نے سابقہ اقوام کی خطاؤں اور گناہوں، نافرمانیوں اور سرکشیوں کا یہاں ذکر کیا ہے فرعون کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ شروع میں پیغمبروں کی اولادوں کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا، ان لوگوں کو بنی اسرائیل کہا جاتا تھا، اس دشمنی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ سیدنا یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانہ میں جو کہ ریان کی طرف سے ممالک مصر کے مختار ہو گئے تھے۔

بنی اسرائیل شام سے مصر میں چلے گئے اور حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کے اقتدار اور شان کی وجہ سے مصر کے لوگ ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے، حضرت یوسف کی رحلت کے بعد یہ فرعون بادشاہ

بنا، بنی اسرائیل کی عزت اوراحترام اسے بہت ناگوار گزرا، اس نے چاہا کہ انہیں مصر کے لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دے، تاکہ یوسف علیہ السلام کی سرداری کا خیال بنی اسرائیل کے دل میں نہ آئے، اور یہ ریاستی کاموں میں مداخلت کے طلب گار نہ ہوں اور آہستہ آہستہ ان پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ وہ چماروں کی طرح اس کی بے گار کرتے تھے، بعض کے ذمہ اپنی عمارتوں کی تعمیر کا کام لگادیا، ان پر نگران مقرر کیے، اپنے کو مصریوں کا اِلٰہ اور معبود قرار دے کر اپنے کو سجدہ کروایا کرتا تھا۔

جب بنی اسرائیل یہ ذلیل کام کرنے سے گریزاں ہوتے تو وہ اس پر سخت غضب ناک ہوتا، طیش میں آجاتا اور ان پر مزید مظالم ڈھاتا، ان کو مختلف قسم کی سزائیں دیتا تھا۔

ایک بار فرعون کو نجومیوں نے اطلاع دے دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے تخت و تاج کے لیے خطرہ بن جائے گا، اس کی وجہ سے تیرے اقتدار کو زوال آئے گا، اس خطرے کو بھانپتے ہوئے فرعون نے حکم جاری کیا کہ بنی اسرائیل کے گھروں کی تلاشی لو، ان کی عورتوں میں سے جس کو حاملہ دیکھیں ان کے نام نوٹ کر کے کوتوال کے دفتر میں درج کروائیں۔

جب بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آجائے تو سرکاری اہل کار ان کے دروازوں پر کھڑے رہیں ، دائیاں پیدا ہونے والے نومولود بچے کی ان سرکاری اہل کاروں کو اطلاع کریں، تو اس نومولود کو اسی وقت قتل کر دیا جائے، اگر لڑکی ہو تو اسے قتل نہ کیا جائے، فرعون کا یہ ظلم سالہا سال تک رہا، اس کے علاوہ وہ بنی اسرائیل پر اور بھی بہت زیادہ مظالم ڈھاتا تھا۔

فرعونی مظالم میں سے ایک ظلم بت پرستی کو رواج دینا تھا، شرک کو عام کرنا تھا، لوگوں کو شرک کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، لوگوں کو چومیخا کر کے اذیت سے دوچار کرنا اسی بدبخت حکمران کے دور میں شروع ہوا تھا، اس کی سرکشی، اس کا تمرد یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ وہ ببانگ دہل اپنی خدائی کے نعرے لگاتا تھا، جس کا قرآن کریم میں تذکرہ موجود ہے وہ کہتا تھا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

قوم شعیب بھی سرکشی کی انتہاؤں پر تھی، یہ لوگ بت پرستی کرتے تھے، ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے، لینے کے باٹ اور تھے اور دینے کے ترازو اور تھے، بددیانتی ان میں انتہاء درجے کی پائی جاتی تھی، راہزنی اور ڈکیتی ان میں عام تھی، شام و مصر کی راہوں پر چھوٹے چھوٹے قلعے بنا کر چھپ کر بیٹھتے اور قافلوں پر حملے کرتے، راہ گزرتے مسافروں کو لوٹتے تھے۔

قوم لوط میں لواطت کی بیماری پائی جاتی تھی، یہ ایسا جرم تھا جو اس قوم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا، ہم جنس پرستی کا آغاز اسی قوم سے ہوا تھا، اغلام بازی ان میں عام تھی، یہ قوم صرف اغلام بازی ہی نہیں کرتی تھی بلکہ کبوتر بازی، مینڈھے لڑانا، کتے لڑانا بھی ان کی بری خصلتوں میں شامل تھا، مہمان کو گھر میں جگہ نہیں دیتے تھے، غلہ خریدنے کے لیے دور دراز سے کوئی ان کے علاقے میں آتا تو اسے غلہ نہیں خریدنے دیتے تھے، مذاق مذاق میں ایک دوسرے کو بری بری گالیاں دیتے تھے، بری بری اور گندی گندی باتیں منہ سے نکالتے تھے۔

فحاشی اس قدر عام تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے سامنے اپنے جسموں سے چادریں اتار کر برہنہ ہو جاتے تھے، لواطت کی بیماری ان میں تھی ہی مگر یہ برا اور شرمناک کام ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، عورتوں کی طرح بن ٹھن کر رہنا پسند کرتے تھے، ان کی طرح چہروں پر سرخی پوڈر لگاتے تھے، عورتوں کی طرح اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتے تھے۔

اللہ نے اتمام حجت کے لیے موسیٰ اور ہارون دو بھائیوں کو فرعون کی طرف، شعیب کو اہل مدین اور اہل ایکہ کی طرف، لوط کو اہل سدوم کی طرف نبی بنا کر روانہ کیا، ان نبیوں نے لوگوں کو بڑی حکمت اور پیار سے سمجھایا، انہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھانے کی کوشش کی، مگر لوگوں کی نافرمانی اور سرکشی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ بجائے ان فرستادگان خدا کی بات ماننے، تسلیم کرنے اور درست

ڈگر پر آنے کے مزید راہ راست سے ہٹتے اور نبیوں کی نافرمانیاں کرتے چلے گئے، پھر رب تعالیٰ نے اتمام حجت کے بعد اپنا کوڑا برسایا۔

اَخْذَةً رَّابِيَةً: اس سے مراد وہ پکڑ ہے جس کی مدافعت نہ ہو سکے جو انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض دفعہ گرفت صرف تنبیہ اور یاددہانی کے لیے ہوتی ہے، ایسی تنبیہ سے آدمی چھوٹ جاتا ہے، لیکن جب کوئی قوم خدا کے خلاف عَلم بغاوت بلند کرتی ہے تو وہ اس کو ایسی پکڑ پکڑتا ہے جس کی تاب لانا ناممکن ہوتا ہے۔ (روح القرآن)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پروردگار نے ایسی گرفت سے پکڑا جو کہ اس سے زائد تھی، جس کے صرف پیغمبروں کے انکار کی وجہ سے مستحق ہوتے تاکہ جو زیادہ ہے وہ ان کے ان گناہوں کے مقابلے میں واقع ہو، پس فرعون کو اس کے کہنے کے مطابق غرق کر کے ہلاک فرمایا، اس لیے کہ ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک داد طلب کرنے والے کی شکل میں برسر دربار آکر پوچھا کہ اگر کسی شخص کا غلام بندگی کا انکار کرے اور اپنے مالک کے مقابلے میں مالک ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کے متعلق بادشاہ کا کیا حکم ہے؟ اسے کس قسم کی سزا دی جائے؟

فرعون نے کہا کہ اس قسم کے نعمت کے ناشکرے غلام کو دریا میں غرق کرنا چاہیے، نیز فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے فخر اور بلندی مرتبت کے مقام میں بار بار اس چیز کا ذکر کرتا تھا کہ میں نے ملک مصر میں نہریں جاری کی ہیں اور میں نے ان نہروں کو اپنی عمارات کے نیچے جاری کیا ہے، تو چونکہ وہ زیادہ تر جاری نہروں کے ساتھ لذت اور فخر حاصل کرتا تھا اس لیے اسے دریا میں غرق کرنا زیادہ مناسب تھا کہ ان چھوٹی نہروں سے کیا کھلتا ہے، تو جو مصر کا بادشاہ ہوتا ہے، چاہیے کہ اس وسیع سمندر کا تماشا کرے اور جس طرح تو ان نہروں کو اپنی عمارات کے نیچے جاری کر کے عیش کرتا تھا، میں اس وسیع سمندر کے تیرے سر اور پورے بدن پر جاری کروں گا تاکہ تیری لذت کے اسباب ہر طرف سے محیط اور شامل ہوں۔

اور فرعون کے عذاب کی زیادتی اس طرح ہوئی کہ ایک لمحے میں تمام بادشاہی، عمارات، باغات، نفیس فرشوں والے محلات اور بے شمار خزانے اس کے قبضے سے نکال کر اس کے دشمنوں کو عطا فرمادیے جو کہ اس کی نظر میں نہایت حقیر اور ناچیز تھے۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو جو کہ دو گروہ تھے، مختلف طریقوں سے عذاب دیا گیا، اصحاب مدین کو ثمود کی چیخ کی مثل چیخ بھی پہنچی اور زلزلے نے بھی ہلاک کیا تو ایک قسم کا دوسری قسموں کے ساتھ ملنا زیادتی کا باعث ہوا، ان کی چیخ حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب اور آپ کو حقیر سمجھنے کے مقابلے میں تھی اور ان کا زلزلہ اس کے مقابلے میں جو وہ پیمانے اور ترازو کو ماپنے اور تولنے کے وقت ہلاتے لرزاتے تھے تاکہ ماپ اور تول برابر نہ رہے اور مؤتفکات کو پہلے نیچے سے اوپر لے گئے پھر الٹے کر کے گرائے گئے اس لیے کہ ان کا کام لواطت اور بے حیائی تھا کہ اس میں حقیقت کا بدلنا ہے، مرد کو حق تعالیٰ نے اس ذلت اور رسوائی کے لیے پیدا نہیں کیا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سے جلے ہوئے پتھر برسائے اس لیے لواطت میں بدکاری کی لذتیں حاصل کرتے تھے اور بدکاری کی حد سنگساری ہے۔ (تفسیر عزیزی، پارہ ۲۹)

طوفان نوح علیہ السلام

سوال ان آیات کا ترجمہ کریں، نیز بتائیے کہ الجاریہ سے کیا مراد ہے؟

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ {۱۱} لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ {۱۲} الحاقة.

جواب ترجمہ: جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کر دیا تاکہ ہم اس واقعے کو تمہارے لیے سبق آموز بنادیں اور یاد رکھنے والے کان اسے (سن کر) یاد رکھیں۔ (طغی طغیان سے ہے، یہاں معنیٰ یہ ہے کہ جب پانی کی سطح بلند ہو گئی)۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، طَغَى عَلَى خُزَّانِهِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ غَضَبًا لِرَبِّهِ فَلَمْ يَقْدِرُوا عَلَى حَبْسِهِ ،پانی اللہ تعالیٰ کے غضب کی وجہ سے فرشتوں میں سے خازنوں پر سرکش ہو گیا، وہ خزان اسے قابو رکھنے پر قادر نہ ہوئے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زَادَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ خَمْسَةَ عَشَرَ ذِرَاعًا پانی اتنا زیادہ ہو گیا کہ ہر چیز پر پندرہ ہاتھ بلند ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ طَغَى الْمَاءُ زَمَنَ نُوحٍ عَلَى خُزَّانِهِ فَكَثُرَ عَلَيْهِمْ فَلَمْ يَدْرُوا كَمْ خَرَجَ. وَلَيْسَ مِنَ الْمَاءِ قَطْرَةٌ تَنْزِلُ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ إِلَّا بِكَيْلٍ مَعْلُومٍ غَيْرَ ذَلِكَ الْيَوْمِ (قرطبی) حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پانی اپنے خازنوں پر سرکش ہو گیا، وہ ان پر بہت زیادہ ہو گیا، وہ نہیں جانتے تھے کہ کتنا پانی نکلا، اس سے قبل اور اس کے بعد کوئی قطرہ نازل نہیں ہوتا مگر معلوم پیمانہ کے ساتھ نازل ہوتا صرف اس دن ایسی صورت نہ تھی۔

ان امتوں کے واقعات کے ذکر کرنے کا مقصود اور جو عذاب ان پر آئے، ان کے ذکر کا مقصود یہ ہے کہ اس امت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں ان کفار کی اقتدا سے روکا جائے، پھر ان پر یہ احسان جتلایا کہ انہیں ان لوگوں میں سے بنایا جو اس غرق ہونے سے نجات پانے والے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ۔ یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں اٹھالیا جبکہ تم ان کی پشتوں میں تھے۔ اس کشتی میں جن کو اٹھایا گیا تھا وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد تھی، روئے زمین پر جو بھی انسان ہیں انہیں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً: هَا کی ضمیر کشتی کے لئے بھی ہو سکتی ہے اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کشتی کو تمہارے لئے یادگار بنائیں۔ اس صورت میں کشتی سے مراد خاص حضرت نوح کی کشتی بھی ہو سکتی ہے اور ہر کشتی بھی کیونکہ وہ اس کی جنس سے ہونے کی وجہ سے اس کی یادگار ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت نوح کی کشتی کو اس امت کے ابتدائی لوگوں نے دیکھا ہے۔ (ابن کثیر)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ نوح کے زمانہ میں جب پانی کا طوفان آیا تو بظاہر اسباب تم انسانوں میں سے کوئی بھی نہ بچ سکتا تھا۔ یہ ہماری قدرت و حکمت اور انعام و احسان تھا کہ سب منکروں کو غرق کر کے نوح کو مع اس کے ساتھیوں کے بچالیا۔ بھلا ایسے عظیم الشان طوفان میں ایک کشتی کے سلامت رہنے کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن ہم نے اپنی قدرت و حکمت کا کرشمہ دکھلایا۔ تاکہ لوگ رہتی دنیا تک اس واقعہ کو یاد رکھیں اور جو کان کوئی معقول بات سن کر سمجھتے اور محفوظ رکھتے ہیں وہ کبھی نہ بھولیں کہ اللہ کا ہم پر ایک زمانہ میں یہ احسان ہوا ہے اور سمجھیں کہ جس طرح دنیا کے ہنگامہ دار و گیر میں فرمانبرداروں کو نافرمان مجرموں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے، یہ ہی حال قیامت کے ہولناک حاقہ میں ہو گا۔ آگے اسی کی طرف کلام منتقل کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قیامت کا ہولناک منظر

سوال سورۃ الحاقہ میں ہنگامہ یوم النشور کی منظر کشی کس طرح کی گئی ہے؟

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ {۱۳} وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً {۱۴} فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ {۱۵} وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ {۱۶} الحاقة.

جواب ترجمہ: پھر جب ایک ہی دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ تو اس دن وہ واقعہ پیش آجائے گا جسے پیش آنا ہے۔ اور آسمان پھٹ پھڑے گا اور وہ اس دن بالکل کمزور پڑ جائے گا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں وَأَوَّلُ ذَلِكَ نَفْخَةُ الْفَزَعِ، ثُمَّ يَعْقُبُهَا نَفْخَةُ الصَّعْقِ حِينَ يُصعق مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللهُ، ثُمَّ بَعْدَهَا نَفْخَةُ الْقِيَامِ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْبَعْثِ وَالنُّشُورِ، وَهِيَ هٰذِهِ النَّفْخَةُ ، جس میں سب سے پہلے گھبراہٹ پیدا کرنے والی چیز صور کا پھونکا جانا ہو گا جس سے سب کے دل ہل

جائیں گے پھر نفخہ پھونکا جائے گا جس سے تمام زمین و آسمان کی مخلوق بیہوش ہو جائے گی مگر جسے اللہ چاہے پھر صور پھونکا جائے گا جس کی آواز سے تمام مخلوق اپنے رب کے سامنے کھڑی ہو جائے گی یہاں اسی پہلے نفخہ کا بیان ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَقَدْ أَكَّدَهَا هَاهُنَا بِأَنَّهَا وَاحِدَةٌ لِأَنَّ أَمْرَ اللهِ لَا يُخَالَفُ وَلَا يُمَانَعُ، وَلَا يَحْتَاجُ إِلَى تَكْرَارٍ وَتَأْكِيدٍ (تفسیر ابن کثیر) یہاں بطور تاکید کے یہ بھی فرمایا کہ یہ اٹھ کھڑے ہونے کا نفخہ ایک ہی ہے اس لئے کہ جب اللہ کا حکم ہو گیا پھر نہ تو اس کے خلاف ہو سکتا ہے نہ وہ ٹل سکتا ہے نہ دوبارہ فرمان کی ضرورت ہے اور نہ تاکید کی۔

جن لوگوں نے اس نفخہ سے مراد آخری نفخہ لیا ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کے قول کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ درست بات وہی ہے جو ہم نے لکھی ہے، اسی لئے یہاں اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ زمین و آسمان اٹھا لئے جائیں گے اور کھال کی طرح پھیلا دیئے جائیں گے اور زمین بدل دی جائے گی اور قیامت واقع ہو جائے گی۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تَنْشَقُّ السَّمَاءُ مِنَ الْمَجَرَّةِ، آسمان ہر کھلنے کی جگہ سے پھٹ جائے گا۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ نبا میں ارشاد فرمایا (وَّفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (النبأ :۱۹) اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس کے دروازے ہی دروازے بن جائیں گے۔

آسمان میں سوراخ اور غاریں پڑ جائیں گی اور شق ہو جائے گی عرش اس کے سامنے ہو گا فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے جو کنارے اب تک ٹوٹے نہ ہوں گے۔

حاملین عرش کی تعداد

سوال اس آیت کی تفسیر اور ترجمہ کیجیے۔

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ الحاقة.

جواب ترجمہ: اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے، اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس سے مراد یا تو عرش عظیم کا اٹھانا ہے یا اس عرش کا اٹھانا مراد ہے جس پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کے فیصلوں کے لئے ہو گا۔(ابن کثیر) حضرت عباس بن عبد المطلب فرماتے ہیں کہ حَمَلَةُ الْعَرْشِ أَنَّهُمْ ثَمَانِيَةُ أَوْعَالٍ، حاملین عرش فرشتے پہاڑی بکروں کی صورت میں ہوں گے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حَمَلَةُ الْعَرْشِ ثَمَانِيَةٌ، مَا بَيْنَ مُوقِ أَحَدِهِمْ إِلَى مُؤَخَّرِ عَيْنِهِ مَسِيرَةُ مِائَةِ عَامٍ (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر) حاملین عرش آٹھ ہوں گے ان کی آنکھ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا ایک سو سال کا راستہ ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ أُذِنَ لِي أَنْ أُحَدِّثَكُمْ عَنْ مَلَكٍ مِنْ حَمَلَةِ الْعَرْشِ: بُعْدَ مَا بَيْنَ شَحْمَةِ أُذُنِهِ وَعُنُقِهِ بِخَفْقِ الطَّيْرِ سَبْعُمِائَةِ عَامٍ (ابن ابی حاتم، ابن کثیر) مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں تمہیں عرش کے اٹھانے والے فرشتوں میں سے ایک کی نسبت خبر دوں کہ اس کی گردن اور کان کے نیچے کی لَو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ اڑنے والا پرندہ سات سو سال تک اڑتا چلا جائے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس سے مراد فرشتوں کی آٹھ صفیں ہیں اور بھی بہت سے بزرگوں سے یہ مروی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اعلیٰ فرشتوں کے آٹھ حصے ہیں جن میں سے ہر ایک حصہ کی گنتی تمام انسانوں جنوں اور سب فرشتوں کے برابر ہے۔

قیامت کے دن پیشی

سوال اس آیت کریمہ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ {۱۸} الحاقه

جواب ترجمہ: اس دن تمہاری پیشی اسی طرح ہو گی کہ تمہاری کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی نہیں رہے گی۔ قیامت کے روز تم اس اللہ کے سامنے کئے جاؤ گے جو پوشیدہ کو اور ظاہر کو بخوبی جانتا ہے جس طرح کھلی سے کھلی چیز کو وہ جانتا ہے اس طرح چھپی سے چھپی چیز کو بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے، اسی لئے فرمایا تمہارا کوئی بھید اس روز چھپ نہ سکے گا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان عالی شان ہے کہ حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا، وَزِنُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُوزَنوا، فَإِنَّهُ أَخَفُّ عَلَيْكُمْ فِي الْحِسَابِ غَدًا أَنْ تُحَاسِبُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ، وَتَزَيَّنُوا لِلْعَرْضِ الْأَكْبَرِ، لوگو! اپنی جانوں کا حساب کر لو اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کا آپ اندازہ کر لو اس سے پہلے کہ ان اعمال کا وزن کیا جائے تا کہ کل قیامت والے دن تم پر آسانی ہو جس دن کو تمہارا پورا پورا حساب لیا جائے گا اور بڑی پیشی میں خود اللہ تعالیٰ جل شانہ کے سامنے تم پیش کر دیئے جاؤ گے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ يُعْرَضُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَ عَرَضَاتٍ، فَأَمَّا عَرْضَتَانِ فجدالٌ ومعاذيرُ، وَأَمَّا الثَّالِثَةُ فَعِنْدَ ذَلِكَ تَطِيرُ الصُّحُفُ فِي الْأَيْدِي، فَآخِذٌ بِيَمِينِهِ وَآخِذٌ بِشِمَالِهِ (مسند احمد) قیامت کے دن لوگ تین مرتبہ اللہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے پہلی اور دوسری بار تو عذر معذرت اور جھگڑا بحث کرتے رہیں گے لیکن تیسری پیشی جو آخری ہو گی اس وقت نامہ اعمال اڑائے جائیں گے، کسی کے دائیں ہاتھ میں آئے گا اور کسی کے بائیں ہاتھ میں۔

جس کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا

وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ {۲۴} الحاقة

جواب ترجمہ: پھر جس کسی کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ کہے گا کہ: لوگو! لو یہ میرا اعمال نامہ پڑھو۔ میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے حساب کا سامنا کرنا ہو گا۔ چنانچہ وہ من پسند عیش میں ہو گا۔ اس اونچی جنت میں۔ جس کے پھل جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (کہا جائے گا کہ) اپنے ان اعمال کے صلے میں مزے سے کھاؤ پیو، جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے تھے۔

سعادت مند اور خوش نصیب لوگ قیامت کے دن اپنا نامہ اعمال اپنے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے وہ حضرات اپنے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پا کر بہت ہی زیادہ خوش ہوں گے اور جوش مسرت میں بے ساختہ ہر ایک سے کہتے پھریں گے کہ میرا نامہ اعمال تو پڑھو اور یہ اس لئے کہ جو گناہ بتقاضائے بشریت ان سے ہو گئے وہ بھی ان کی توبہ سے نامہ اعمال میں سے مٹا دیئے گئے ہیں اور نہ صرف مٹا دیئے گئے ہیں بلکہ ان کے بجائے نیکیاں لکھ دی گئی ہیں، پس یہ سراسر نیکیوں کا نامہ اعمال ایک ایک کو پورے سرور اور سچی خوشی سے دکھاتے پھریں گے۔

حضرت ابو عثمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چپکے سے حجاب میں مومن کو اس کا نامہ اعمال دیا جاتا ہے جس میں اس کے گناہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں یہ اسے پڑھتا ہے اور ہر ایک گناہ پر اس کے ہوش اڑ اڑ جاتے ہیں چہرے کی رنگت پھیکی پڑ جاتی ہے اتنے میں اب اس کی نگاہ اپنی نیکیوں پر پڑتی ہے جب انہیں پڑھنے لگتا ہے تب ذرا چین پڑتا ہے ہوش و حواس درست ہوتے ہیں اور چہرہ کھل جاتا ہے پھر نظریں جما کر پڑھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی برائیاں بھی بھلائیوں سے بدل دی گئی ہیں ہر برائی کی جگہ بھلائی لکھی ہوئی ہے، اب تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور خوشی خوشی نکل کھڑا ہوتا ہے اور جو ملتا ہے اس سے کہتا ہے ذرا میرا نامہ اعمال تو پڑھنا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جن کو فرشتوں نے ان کی شہادت کے بعد غسل دیا تھا ان کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ يَقِفُ عَبْدَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُبْدِي سَيِّئَاتِهِ فِي ظَهْرِ

صَحِيفَتِهِ، فَيَقُولُ لَهُ: أَنْتَ عَمِلْتَ هَذَا؟ فَيَقُولُ: نَعَمْ أَيْ رَبِّ. فَيَقُولُ لَهُ إِنِّي لَمْ أَفْضَحْكَ بِهِ، وَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَكَ. فَيَقُولُ عِنْدَ ذَلِكَ: {هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ} حِينَ نَجَا مِنْ فَضْحِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو قیامت والے دن اپنے سامنے کھڑا کرے گا اور اس کی برائیاں اس کے نامہ اعمال کی پشت پر لکھی ہوئی ہوں گی جو اس پر ظاہر کی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ بتا کیا تو نے یہ اعمال کئے ہیں؟ وہ اقرار کرے گا کہ ہاں بیشک اللہ یہ برائیاں مجھ سے ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا دیکھ میں نے دنیا میں بھی تجھے رسوا نہیں کیا، اب یہاں بھی میں تجھ سے درگزر کرتا ہوں اور تیرے تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں، جب یہ اس سے فارغ ہو گا تب اپنا نامہ اعمال لے کر خوشی سے ایک ایک کو دکھاتا پھرے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

يُدْنِي اللهُ الْعَبْدَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوبِهِ كُلِّهَا، حَتَّى إِذَا رَأَى أَنَّهُ قَدْ هَلَكَ قَالَ اللهُ إِنِّي سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ. ثُمَّ يُعْطَى كِتَابَ حَسَنَاتِهِ بِيَمِينِهِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ وَالْمُنَافِقُ فَيَقُولُ الْأَشْهَادِ: {هَؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى رَبِّهِمْ أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظَّالِمِينَ}

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے کو اپنے پاس بلائے گا اور اس سے اس کے گناہوں کی بابت پوچھے گا کہ فلاں گناہ کیا ہے؟ فلاں گناہ کیا؟ یہ اقرار کرے گا یہاں تک کہ سمجھ لے گا کہ اب ہلاک ہوا اس وقت جناب باری عزاسمہ فرمائے گا اے میرے بندے! دنیا میں میں نے تیری ان برائیوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اب آج تجھے کیا رسوا کروں جا میں نے تجھے بخشا پھر اس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جاتا ہے جس میں صرف نیکیاں ہی نیکیاں ہوتی ہیں۔ (سورۃ ھود آیت ۱۸)

لیکن کافروں اور منافقوں کے بارے میں تو گواہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کے بارے میں جھوٹ کہا لو گو سنو! ان ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ داہنے ہاتھ کے نامہ اعمال والا کہتا ہے کہ مجھے تو دنیا میں ہی یقین کامل تھا کہ یہ حساب کا دن قطعاً آنے والا ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے (اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ (البقرۃ:۲۴۹) انہیں یقین تھا کہ یہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔

{فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ} فرمایا ان کی جزا یہ ہے کہ یہ پسندیدہ اور دل خوش کن زندگی پائیں گے اور بلند وبالا بہشت میں رہیں گے، جس کے محلات اونچے اونچے ہوں گے جن میں حوریں قبول صورت اور نیک سیرت ہوں گی جو گھر نعمتوں کے بھرپور خزانے ہوں گے اور یہ تمام نعمتیں نہ ٹلنے والی نہ ختم ہونے والی بلکہ کمی سے بھی محفوظ ہوں گی۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَلْ يَتَزَاوَرُ أَهْلُ الْجَنَّةِ؟ قَالَ: نَعَمْ، إِنَّهُ لَيَهْبِطُ أَهْلُ الدَّرَجَةِ الْعُلْيَا إِلَى أَهْلِ الدَّرَجَةِ السُّفْلَى، فَيُحَيُّونَهُمْ وَيُسَلِّمُونَ عَلَيْهِمْ، وَلَا يَسْتَطِيعُ أَهْلُ الدَّرَجَةِ السُّفْلَى يَصْعَدُونَ إِلَى الْأَعْلَيْنَ، تَقْصُرُ بِهِمْ أَعْمَالُهُمْ، ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اونچے نیچے مرتبے والے جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں بھی کریں گے آپ ﷺ نے فرمایا ہاں بلند مرتبہ لوگ کم مرتبہ لوگوں کے پاس ملاقات کے لئے اتر آئیں گے اور خوب محبت و اخلاص سے سلام مصافحے اور آؤ بھگت ہوگی ہاں البتہ نیچے والے بہ سبب اپنے اعمال کی کمی کے اوپر نہ چڑھیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ إِنَّ الْجَنَّةَ مِائَةُ دَرَجَةٍ، مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، جنت میں ایک سو درجے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ ہے۔

{قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ} اس کے پھل نیچے نیچے ہوں گے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں أَيْ قَرِيبَةٌ، يَتَنَاوَلُهَا أَحَدُهُمْ، وَهُوَ نَائِمٌ عَلَى سَرِيرِهِ اس قدر جھکے ہوئے ہوں گے کہ جنتی اپنے چھپر کھٹ پر لیٹے ہی لیٹے ان میووں کو توڑ لیا کریں گے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يَدْخُلُ أَحَدٌ الْجَنَّةَ إِلَّا بِجَوَازٍ: (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ) هَذَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ لِفُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، أَدْخِلُوهُ جَنَّةً عَالِيَةً، قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ہر جنتی کو اللہ کی طرف سے ایک لکھا ہوا پروانہ ملے گا جس میں لکھا ہوا ہو گا۔ (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ) هَذَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ لِفُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، أَدْخِلُوهُ جَنَّةً عَالِيَةً، قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ یعنی اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع یہ پروانہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فلاں شخص کے لئے جو فلاں کا بیٹا ہے اسے بلند وبالا جھکی ہوئی شاخوں اور لدے پھندے ہوئے خوشوں والی خوشگوار جنت میں جانے دو (طبرانی، تفسیر ابن کثیر)

بعض روایتوں میں ہے یہ پروانہ پل صراط پر حوالے کر دیا جائے گا۔ {كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ} بطور احسان اور مزید لطف وکرم کے بھی کھانے پینے کی رخصت مرحمت ہو گی اور کہا جائے گا کہ یہ تمہارے نیک اعمال کا بدلہ ہے۔ اعمال کا بدلہ کہنا صرف بطور لطف کے ہے ورنہ صحیح حدیث میں ہے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرمایا کرتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِعْمَلُوا وَسَدِّدوا وقَارِبُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ أَحَدًا مِنْكُمْ لَنْ يُّدْخِلَهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ (بخاری ومسلم) عمل کرتے جاؤ سیدھے اور قریب قریب رہو اور جان رکھو کہ صرف اعمال جنت میں لے جانے کے لئے کافی نہیں، لوگوں نے کہا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال بھی نہیں؟ فرمایا میرے بھی نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی رحمت شامل حال ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مسلم شریف والی روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں وَاعْلَمُوا أَنَّ أَحَبَّ الْعَمَلِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ (مسلم) جان لو! اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل وہ ہے جو لگاتار ہو اگرچہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يُدْخِلُ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، وَلَا يُجِيرُهُ مِنَ النَّارِ، وَلَا أَنَا، إِلَّا بِرَحْمَةٍ مِنَ اللهِ (مسلم) تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی دوزخ سے بچائے گا اور نہ ہی مجھے (میرا عمل جنت میں لے جائے گا اور نہ دوزخ سے بچائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا اور دوزخ سے بچ جاؤں گا)

مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ تم میں سے کسی کا عمل اسے جنت میں نہیں لے جائے گا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یارسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں نہیں لے جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی میرا عمل جنت میں لے کر نہیں جائے گا، ہاں مجھے اللہ نے اپنی رحمت و فضل میں ڈھانپ لیا ہے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں یہ فرمان گرامی ہے کہ کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ (مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں مغفرت اور رحمت کے الفاظ استعمال فرمائے کہ مجھے اللہ اپنی بخشش اور رحمت میں ڈھانپ لے گا۔ (مسلم)

شارح مسلم شریف شیخ فواد عبد الباقی فرماتے ہیں کہ جان لیجیے کہ مذہب اہل سنت والجماعت میں ثواب اور سزا، ایجاب اور تحریم اور نہ ہی ان کے علاوہ باقی انواع مکلفات عقل سے ثابت ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں شریعت سے ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح اہل سنت کا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز

واجب نہیں ہے، بلکہ سارا عالم دنیا اللہ کی ملک اور قبضے میں ہے، دنیا اور آخرت اس کی بادشاہی میں ہے، وہ ان میں جو چاہتا ہے کرتا ہے، اگر وہ اطاعت شعاروں اور نیکوکاروں سب کو عذاب دے اور انہیں دوزخ میں ڈالے دے تو یہ اس کا عدل ہے، اور اگر وہ ان کا اکرام کرے، انہیں نعمتوں سے سرفراز کرے اور جنت میں داخل کرے تو یہ اس کا فضل و کرم ہے۔

اور اگر وہ کافروں پر نوازشات کرے اور انہیں جنت میں داخل کر دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن چونکہ اس نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے کہ وہ ایسا کرے گا نہیں، بلکہ وہ اہل ایمان کی بخشش کرے گا اور انہیں اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا، اور کافروں کو عذاب دے گا اور انہیں ہمیشہ دوزخ میں رکھے گا، یہ اس کا عدل ہو گا۔

اور یہاں احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ اہل حق کے لیے دلالت ہے کہ کوئی بھی اپنی طاعت و فرمانبرداری کی وجہ سے ثواب اور جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۲)النحل تم اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہے تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الزُّخْرُفِ: ۷۲)اور یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں اپنے اعمال کے بدلے وارث بنادیا گیا ہے۔

اسی طرح اور بھی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کے سبب جنت میں جائے گا اور اعمال کے سبب دوزخ سے بچے گا، جب کہ ان روایات میں واضح بتایا جارہا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہیں جاسکتا اور اعمال کے بل بوتے پر دوزخ سے نہیں بچ سکتا، یہ بظاہر دونوں چیزیں متضاد ہیں، قرآنی آیات اور نبوی ارشادات میں بظاہر تعارض دکھائی دیتا ہے۔ مگر جن لوگوں کی قرآن کریم اور احادیث دونوں پر گہری نظر ہے ان کے نزدیک قرآن کریم اور احادیث نبویہ دونوں میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بخاری شریف کی شرح فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جنت کی منازل، مقامات اور درجات کا حصول اعمال کی وجہ سے ہو گا، اس لیے کہ جنت کے مختلف درجات مختلف اعمال کی وجہ سے ہیں، جب کہ جنت میں داخلہ اللہ کی رحمت، فضل وکرم کی وجہ سے ہو گا، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

جس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ تم اپنے کیے ہوئے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ یہ آیت چونکہ مجمل ہے اس کی تفسیر حدیث شریف کرتی ہے، تقدیر عبارت کی یوں ہے اُدْخُلُوا مَنَازِلَ الْجَنَّةِ وَقُصُورَهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ کہ تم جنت کی منازل اور محلات میں ان اعمال کے سبب داخل ہو جاؤ جو تم کرتے رہے ہو، اس سے اصل دخول جنت مراد نہیں ہے، پھر فرمایا کہ یہ بھی جائز ہے کہ حدیث شریف اس آیت کی تفسیر کر رہی ہو اور تقدیر عبارت کی یوں ہے اُدْخُلُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ مَعَ رَحْمَةِ اللهِ لَكُمْ وَتَفَضُّلِهِ عَلَيْكُمْ تم اللہ کی اپنے اوپر رحمت اور اپنے اوپر فضل کے ساتھ ان اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اس لیے کہ جنت کی منازل اور جنت کے درجات اس کی رحمت کے ساتھ ہی تقسیم ہوتے ہیں، اور اسی طرح اصل دخول جنت اس کی رحمت کی وجہ سے ہو گا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات اور نبوی ارشادات کے درمیان تطبیق کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ حدیث قرآنی آیت کے اجمال کی تفسیر کرتی ہے، ابن بطال رحمہ اللہ نے بخاری کی شرح میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں سے یہ بات ہے کہ وہ عمل کی توفیق دیتا ہے، اور اطاعت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، ان ساری باتوں کا کوئی عامل اپنے عمل کی وجہ سے مستحق نہیں ہوتا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے چار جوابات حاصل ہوتے ہیں، ① پہلا جواب یہ ہے کہ عمل کی توفیق اللہ کی رحمت سے ہوتی ہے، پہلے ہی اللہ کی رحمت نہ ہو تو انسان کو ایمان

حاصل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی ایسی اطاعت کی توفیق مل سکتی ہے جس سے نجات کا سامان ہو سکے۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ غلام کے اعمال کے منافع اس کے آقا کے لیے ہوتے ہیں، غلام کے عمل کا استحقاق اس کا آقا رکھتا ہے، جب یہ سب کچھ آقا کا ہے تو آقا اپنے غلام کو کوئی صلہ، کوئی انعام دے تو یہ آقا کا فضل و کرم ہے۔

③ تیسرا جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ نفس دخول جنت تو اللہ کی رحمت کے ساتھ ہو گا جب کہ جنت کے درجات کی تقسیم اعمال کی وجہ سے ہو گی۔

④ چوتھا جواب یہ ہے کہ اطاعت گزاری والے اعمال کا زمانہ تھوڑا سا ہے جب کہ ثواب ختم ہونے والا نہیں ہے، تو جو انعام تھوڑے سے اعمال کے صلے میں ملے وہ کبھی ختم نہیں ہو گا تو یہ اللہ کے فضل و کرم سے ختم نہیں ہو گا، اعمال کے مقابلے میں نہیں ہو گا۔ (فتح الباری شرح صحیح البخاری)

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں فَدُخُولُ الْجَنَّةِ بِمَحْضِ الْفَضْلِ، وَدَرَجَاتُهَا عَلَى حَسَبِ أَعْمَالِ أَصْحَابِهَا بِمُقْتَضَى الْعَدْلِ (مرقات شرح مشکوٰۃ) جنت میں داخلہ تو محض اللہ کے فضل و کرم سے ہو گا، جب کہ جنت میں جنت والوں کو جو درجات ملیں گے وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ملیں گے، یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ شارحین حدیث شریف کے ان جوابات سے تشفی ہو جاتی ہے کہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں ہے۔ واللہ اعلم

عقیدہ طحاویہ میں ہے کہ وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ مَخْلُوقَتَانِ، لَا تَفْنَيَانِ أَبَدًا وَلَا تَبِيدَانِ، فَإِنَّ اللهَ تَعَالَى خَلَقَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ قَبْلَ الْخَلْقِ، وَخَلَقَ لَهُمَا أَهْلًا، فَمَنْ شَاءَ مِنْهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ فَضْلًا مِنْهُ، وَمَنْ شَاءَ مِنْهُمْ إِلَى النَّارِ عَدْلًا مِنْهُ، وَكُلٌّ يَعْمَلُ لِمَا قَدْ فُرِغَ لَهُ، وَصَائِرٌ إِلَى مَا خُلِقَ لَهُ. (العقیدۃ الطحاویہ)

جنت اور دوزخ اللہ کی دو مخلوقات ہیں جو کبھی فنا نہیں ہوں گی اور نہ کبھی ختم ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کو دوسری مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے بنایا اور ان دونوں کے لیے اہل (جنت میں

رہنے والے) بھی پیدا کیے، ان میں سے جسے چاہے گا اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کر دے گا اور جسے چاہے گا اپنے عدل وانصاف کے ساتھ جہنم رسید کر دے گا، ہر انسان وہی کام سر انجام دیتا ہے جس کے لیے وہ فارغ کیا گیا اور ہر شخص اسی طرف لوٹنے والا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

بدنصیب کا نامہ اعمال

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا ہے، ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ {۲۵} وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ {۲۶} یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ {۲۷} مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ {۲۸} هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ {۲۹} الْحَاقَّةُ

جواب ترجمہ: اور جس کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا سو وہ کہے گا کہ ہائے کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا جاتا۔ اور مجھے خبر بھی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے؟ اے کاش! کہ میری موت ہی پر میرا کام تمام ہو جاتا۔ میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا زور مجھ سے جاتا رہا۔

یہاں ان بدقسمت اور بدبخت سیاہ کاروں و گنہگاروں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جب میدان قیامت میں انہیں ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یہ نہایت ہی پریشان ہو جائیں گے اور حسرت و افسوس سے کہیں گے کاش! کہ ہمیں اعمال نامہ ملتا ہی نہ اور کاش! کہ ہم اپنے حساب کی اس کیفیت سے آگاہ ہی نہ ہوتے کاش! کہ موت نے ہمارا کام ختم کر دیا ہوتا اور یہ دوسری زندگی سرے سے ہمیں ملتی ہی نہ، جس موت سے دنیا میں بہت ہی گھبراتے تھے آج اس کی آرزوئیں کریں گے، یہ کہیں گے کہ ہمارے مال و جاہ نے بھی آج ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہماری ان چیزوں نے بھی عذاب ہم سے نہ ہٹائے۔

جہنم میں ڈالنے کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ {۳۰}ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ {۳۱}ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ{۳۲}إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ {۳۳}وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ {۳۴}الحاقه

جواب ترجمہ:(ایسے شخص کے بارے میں حکم ہو گا) پکڑو اسے، اور اس کے گلے میں طوق ڈال دو پھر اسے دوزخ میں داخل کر دو۔ پھر ایسی زنجیر میں اس کو جکڑ دو جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے۔

بد نصیبی اور بد بختی کی انتہاء ہو گئی، دنیا میں نافرمانیاں اور سرکشیاں کرتا تھا، متکبر تھا اور سرکشی اختیار کیے رکھی، اللہ کے احکامات کی پرواتک نہیں کی تھی، آج جب نیکی اور بدی کا ترازو تلا، کامیابی اور ناکامی واضح ہو گئی، نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں تھما دیا گیا تو پھر اللہ کی طرف سے ایک حکم آجائے گا کہ فرشتو! اسے پکڑ لو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو اور اسے جہنم میں لے جاؤ اور اس میں پھینک دو۔

حضرت منہال بن عمرو رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے اس فرمان کو سنتے ہی کہ اسے پکڑو، ستر ہزار فرشتے اس کی طرف لپکیں گے جن میں سے اگر ایک فرشتہ بھی اس طرح اشارہ کرے تو ایک چھوڑ ستر ہزار لوگوں کو پکڑ کر جہنم میں پھینک دے۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ اپنی کتاب الاھوال میں لکھتے ہیں کہ

أَنَّهُ يَبْتَدِرُهُ أَرْبَعُمِائَةِ أَلْفٍ، وَلَا يَبْقَى شَيْءٌ إِلَّا دَقَّه، فَيَقُوْلُ: مَا لِي وَلَكَ؟ فَيَقُوْلُ: إِنَّ الرَّبَّ عَلَيْكَ غَضْبَانُ، فَكُلُّ شَيْءٍ غَضْبَانٌ عَلَيْكَ، چار لاکھ فرشتے اس کی طرف دوڑیں گے اور کوئی چیز باقی نہ رہے گی مگر اسے توڑ پھوڑ دیں گے یہ کہے گا تمہیں مجھ سے تعلق؟ وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ تجھ پر غضبناک ہے اور اس وجہ سے ہر چیز تجھ پر غصے میں ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إِذَا قَالَ الرَّبُّ، عَزَّ وَجَلَّ: {خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ} ابْتَدَرَهُ سَبْعُوْنَ أَلف مَلَكٍ، أَيُّهُمْ يَجْعَلُ الْغُلَّ فِي عُنُقِهِ، اللہ تعالیٰ عزوجل کے اس فرمان کے

سرزد ہوتے ہی ستر ہزار فرشتے اس کی طرف غصے سے دوڑیں گے جن میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت کر کے چاہے گا کہ اسے میں طوق پہناؤں۔

{ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ} پھر اسے جہنم کی آگ میں غوطہ دینے کا حکم ہو گا۔

{ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ} پھر ان زنجیروں میں جکڑا جائے گا جن کا ایک ایک حلقہ بقول حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کے دنیا بھر کے لوہے کے برابر ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تَدْخُلُ فِي اسْتِهِ ثُمَّ تَخْرُجُ مِنْ فِيهِ، ثُمَّ يُنْظَمُونَ فِيهَا كَمَا يُنْظَمُ الْجَرَادُ فِي الْعُودِ حِينَ يُشْوَى، یہ زنجیریں اس کے جسم میں پرو دی جائیں گی، پاخانے کے راستے سے ڈال دی جائیں گی اور منہ سے نکالی جائیں گی اور اس طرح آگ میں بھونا جائے گا جیسے سیخ میں کباب اور تیل میں ٹڈی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ يُسْلَكُ فِي دُبُرِهِ حَتَّى يَخْرُجَ مِنْ مَنْخِرَيْهِ، حَتَّى لَا يَقُومَ عَلَى رِجْلَيْهِ، پیچھے سے یہ زنجیریں ڈالی جائیں گی اور ناک کے دونوں نتھنوں سے نکالی جائیں گی۔ اس عمل کی شدت اس قدر ہو گی کہ وہ اپنے پاؤں کے بل کھڑا ہی نہ ہو سکے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لَوْ أَنَّ رَصَاصَةً مِثْلَ هَذِهِ وَأَشَارَ إِلَى [مِثْلِ] جُمْجُمَةِ-أُرْسِلَتْ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، وَهِيَ مَسِيرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ، لَبَلَغَتِ الْأَرْضَ قَبْلَ اللَّيْلِ، وَلَوْ أَنَّهَا أُرْسِلَتْ مِنْ رَأْسِ السِّلْسِلَةِ، لَسَارَتْ أَرْبَعِينَ خَرِيفًا الليلَ والنهارَ، قَبْلَ أَنْ تَبْلُغَ قَعْرَهَا أَوْ أَصْلَهَا (مسند احمد، ترمذی) اگر کوئی بڑا سا پتھر آسمان سے پھینکا جائے تو زمین پر وہ ایک رات میں آجائے حالانکہ یہ پانچ سو سال کی مسافت ہے، لیکن اگر اس کو جہنمیوں کے باندھنے کی زنجیر کے سرے پر سے چھوڑا جائے تو دوسرے سرے تک پہنچے میں چالیس سال کے دن رات لگ جائیں، پھر بھی وہ اس کی گہرائی میں نہ پہنچ پائے۔

جہنمی جہنم میں کیوں ڈالے جائیں گے؟

سوال جہنم میں ڈالے جانے والے لوگوں کو جہنم میں کیوں جھونکا جائے گا؟

جواب قرآن کریم میں ان جہنمیوں کے بارے میں واضح کیا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی یہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے، اور نہ ہی دوسرے لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ ایمان لائیں اور نہ ہی وہ غریبوں مسکینوں کی مدد امداد کرنے کی دوسروں کو ترغیب دلاتے تھے، اس لیے انہیں دوزخ میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا، قرآن کریم میں ایک مقام پر ان دوزخیوں کی زبانی بتایا گیا کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ کی آگ میں کیوں ڈالے گئے تو وہ کہیں گے کہ ہم نمازیں نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، یہاں ایمان نہ لانا اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا جرم بتلایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ {۳۳} وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ {۳۴} یہ اللہ عظیم پر ایمان نہ رکھتا تھا نہ مسکین کو کھلا دینے کی کسی کو رغبت دیتا تھا۔ یعنی نہ تو اللہ کی عبادت و اطاعت کرتا تھا نہ اللہ کی مخلوق کے حق ادا کر کے اسے نفع پہنچاتا تھا، اللہ کا حق یہ ہے کہ ایک دوسرے سے احسان و سلوک کریں اور بھلے کاموں میں آپس میں امداد پہنچاتے رہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حقوق کو عموماً ایک ساتھ بیان فرمایا ہے جیسے نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور نبی ﷺ نے انتقال کے وقت میں ان دونوں کو ایک ساتھ بیان فرمایا کہ نماز کی حفاظت کرو اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

دوستی یاری کا فقدان ہو گا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيمٌ {۳۵} وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ {۳۶} لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا

الْخَاطِئُوْنَ{۳۷}الحاقه

جواب ترجمہ: لہٰذا آج یہاں نہ اس کا کوئی یار و مدد گار ہے۔ اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز میسر ہے۔ سوائے غسلین کے۔ جسے گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

دنیوی زندگی میں تکبر و سرکشی کرنے والے آخرت میں سخت ذلت و پریشانی سے دوچار ہوں گے، یہاں دوستوں، یاروں، تعلق داروں اور جتھوں کی وجہ سے اکڑنے والے قیامت کے دن درماندہ اور بے یار و مدد گار ہوں گے، کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہو گا، اللہ کی گرفت سے انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

ایک طرف تنہائی کی مشکل گھڑیاں اور دوسری طرف کھانے پینے کی چیزوں کا فقدان، یہ انہیں بہت ہی پریشان کرے گا، ہاں انہیں کھانے کو غسلین دیا جائے گا، جو بدترین سڑی بسی بیکار چیز کے ہو گی۔ غسلین جہنم کا ایک درخت ہے اور ممکن ہے کہ اسی کا دوسرا نام (زقوم) ہو اور (غسلین) کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ جہنمیوں کے بدن سے جو خون اور پانی بہتا ہے۔

غسلین ناپاک اور گندی چیزوں کے غسالہ دھوون کو کہتے ہیں چونکہ انہوں نے اپنی دولت کا مصرف صرف تن پروری اور اپنے کام و دہن کی لذت ہی کو سمجھا اور اس حرص میں غرباء مساکین کے حقوق ہڑپ کر کے اپنے سارے مال کو نجس بنایا اس وجہ سے قیامت کے دن ان کو ناپاک چیزوں کا دھوون ہی کھانے پینے کو ملے گا۔ (تدبر)

عظمتِ قرآن کریم

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ{۳۸}وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ{۳۹}اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ {۴۰} وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ{۴۱}وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ

{۴۲}تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ {۴۳}وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ {۴۴}لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ {۴۵}ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ {۴۶} فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ {۴۷}وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ {۴۸}وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ {۴۹}وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ {۵۰}وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ {۵۱} فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ {۵۲} الحاقة.

جواب ترجمہ: اب میں قسم کھاتا ہوں اس کی بھی جسے تم دیکھتے ہو۔ اور اس کی بھی جسے تم نہیں دیکھتے۔ کہ یہ (قرآن) ایک معزز پیغام لانے والے کا کلام ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ (مگر) تم ایمان تھوڑا ہی لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ (مگر) تم سبق تھوڑا ہی لیتے ہو۔ یہ کلام تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اتارا جارہا ہے۔ اور اگر (بالفرض) یہ پیغمبر کچھ (جھوٹی) باتیں بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی نہ ہوتا جو ان کے بچاؤ کے لیے آڑے آسکتا۔ اور یقین جانو کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے والے بھی ہیں۔ اور یہ (قرآن) ایسے کافروں کے لیے حسرت کا سبب ہے۔ اور یہی وہ یقینی بات ہے جو سراسر حق ہے۔ لہٰذا تم اپنے پروردگار کے عظمت والے نام کی تسبیح کرتے رہو۔

عرش بریں کا آخری پیغام قرآن کریم کی شکل میں کائنات کے سب سے افضل، اشرف، اعلیٰ، برتر و بالا انسان کے قلب اطہر پر نازل ہوا، ان کا کسی شاعری و سخنوری سے تعلق نہیں ہے، جس طرح عرب لوگ گمان کے گھوڑے دوڑاتے اور آپ ﷺ کو شاعر کہتے تھے ایسی کوئی بات آپ ﷺ میں نہیں تھی۔

قرآن کریم کاہنوں کی مسجع اور مقفیٰ عبارات جیسا نہیں ہے، یہ رب العالمین کا کلام ہے جسے اس نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ اگر محمد ﷺ کوئی

ایسا دعویٰ ہمارے کے لیے کریں جسے ہم نے ان کے لیے نہیں کہا تو پھر ہم ان سے انتقام لیتے اور ان کے ہاتھ کو قوت سے روک دیتے اور ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے پھر تم میں سے کوئی بھی ان کو بچانے نہ پہنچتا۔

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن متقی لوگوں کے لیے وعظ ونصیحت کی کتاب ہے، متقی لوگوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکامات کو مانتے ہیں اور جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے ان سے رک جاتے ہیں، ہم تم میں ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو قرآن کریم کی واضح آیات کے باوجود اس کو جھٹلاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں، یہ تکذیب وانکار کافروں کے لیے اس دن ندامت اور شرمندگی کا باعث بن جائے گی جس دن وہ اللہ کے عذاب کو دیکھیں گے اور اہل ایمان پر نعمتوں کی برسات دیکھیں گے، قرآن کریم حق وسچ پر مبنی کتاب ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو، اللہ کی تسبیح بیان کرو اور اس عظیم ہستی کا نام لیا کرو، اس کو یاد کیا کرو۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ، آج سورۃ الحاقہ کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین بحرمۃ سید المرسلین

خادم اسلام : محمود الرشید حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

یکم مئی ۲۰۱۹ء، بروز بدھ بوقت چھ بجے شام

حروف بنی: ۳۰ جولائی ۲۰۱۹ء بروز منگل، حال وارد حدوٹ مری

☆☆☆☆

المعارج

مطالبہ عذاب اور یوم الحشر کی مقدار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍۙ{۱}لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ{۲}مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ {۳} تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ{۴} المعارج.

جواب ترجمہ: ایک مانگنے والے نے وہ عذاب مانگا ہے۔ جو کافروں پر آنے والا ہے کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے۔ وہ اللہ کی طرف سے آئے گا جو چڑھنے کے تمام راستوں کا مالک ہے۔ فرشتے اور روح القدس اس کی طرف ایک ایسے دن میں چڑھ کر جاتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ سَأَلَ سَائِلٌ ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا یعنی نضر بن حارث نے اور اس نے یہ کہا تھا اے اللہ! اگر یہ حق ہے تیرے پاس تو ہم پر پتھر برسا دیجیے اور فرمایا لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ،یعنی اس عذاب کے بارے میں جو ہو کر رہنے والا ہے۔ یہ تیار ہے کافروں کے لیے کہ اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے جو درجات کا مالک ہے۔ (تفسیر در منثور سیوطی)

ابن المنذر رحمہ اللہ نے ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ آیت بِعَذَابٍ وَاقِعٍ سے مراد ہے کہ دنیا میں ان کا یہ کہنا آخرت میں واقع ہو گا کہ اے اللہ! اگر تیری جانب سے یہ حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے اور یہ کہنے والا نضر بن حارث تھا۔ (در منثور)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں سورۃ المعارج میں بِعَذَابٍ میں جو "ب" ہے وہ بتا رہی ہے کہ یہاں فعل کی تضمین ہے گویا کہ فعل مقدر ہے یعنی یہ کافر عذاب کے واقع ہونے کی طلب میں جلدی کر رہے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر ہے (وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ

وَعْدَهٗ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج :۴۷) یعنی یہ عذاب مانگنے میں جلدی کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر گز وعدہ خلافی نہیں کرتا، یعنی اس کا عذاب یقیناً اپنے وقت مقررہ پر آکر ہی رہے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ذٰلِكَ سُؤَالُ الْكُفَّارِ عَنْ عَذَابِ اللّٰهِ وَهُوَ وَاقِعٌ، کافروں کا یہ سوال اللہ تعالیٰ کے عذاب سے متعلق تھا سو وہ عذاب واقع ہو کر رہے گا۔ یعنی آخرت میں ان کی اس طلب کے الفاظ بھی دوسری جگہ قرآن میں منقول ہیں (اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال :۳۲) الٰہی! اگر یہ تیرے پاس سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہمارے پاس کوئی دردناک عذاب لا۔ پھر فرماتا ہے کہ وہ عذاب کافروں کے لئے تیار ہے اور ان پر آپڑنے والا ہے جب آجائے گا تو اسے دور کرنے والا نہیں اور نہ کسی میں اتنی طاقت ہے کہ اسے ہٹا سکے۔

مِنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ (المعارج:۳) کے معنیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق درجوں والا، یعنی بلندیوں اور بزرگیوں والا اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مراد معارج سے آسمان کی سیڑھیاں ہیں، قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں فضل و کرم اور نعمت و رحم والا، یعنی یہ عذاب اس اللہ کی طرف سے ہے جو ان صفتوں والا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ: اس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں، روح کی تفسیر میں حضرت ابو صالح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ هُمْ خَلْقٌ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ، يُشْبِهُونَ النَّاسَ، وَلَيْسُوا أُنَاسًا یہ اللہ کی مخلوق میں سے مخلوق ہے، انسان تو نہیں لیکن انسانوں سے مشابہ ہے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہوں اور یہ عطف ہو عام پر خاص کا اور ممکن ہے کہ اس سے مراد بنی آدم کی روحیں ہوں، اس لئے کہ وہ بھی قبض ہونے کے بعد آسمان کی طرف چڑھتی ہیں، جیسے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ والی لمبی حدیث میں ہے

کہ فَلَا يَزَالُ يُصْعَدُ بِهَا مِنْ سَمَاءٍ إِلَى سَمَاءٍ حَتَّى يَنْتَهِيَ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ، جب فرشتے پاک روح نکالتے ہیں تو اسے لے کر ایک آسمان سے دوسرے پر چڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ: اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں چار قول ہیں ① ایک تو یہ کہ اس سے مراد وہ دوری ہے جو اسفل السافلین سے عرش معلی تک ہے اور اسی طرح عرش کے نیچے سے اوپر تک کا فاصلہ بھی اتنا ہی ہے اور عرش معلی سرخ یاقوت کا ہے، جیسے کہ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "صفتہ العرش" میں ذکر کیا ہے۔

ابن ابی حاتم میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کے حکم کی انتہاء نیچے کی زمین سے آسمانوں کے اوپر تک کی پچاس ہزار سال کی ہے اور ایک دن ایک ہزار سال کا ہے یعنی آسمان سے زمین تک اور زمین سے آسمان تک ایک دن میں جو ایک ہزار سال کے برابر ہے، اس لئے کہ آسمان و زمین کا فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن ابی حاتم میں روایت ہے کہ ہر زمین کی موٹائی پانچ سو سال کے فاصلہ کی ہے اور ایک زمین سے دوسری زمین تک پانچ سو سال کی دوری ہے تو سات ہزار سال یہ ہوگئے، اسی طرح آسمان، تو چودہ ہزار سال یہ ہوئے اور ساتویں آسمان سے عرش عظیم تک چھتیس ہزار سال کا فاصلہ ہے یہی معنی ہیں اللہ کے اس فرمان کے کہ اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا کیا ہے تب سے لے کر قیامت تک کہ اس کی بقاء کی آخر تک مدت پچاس ہزار سال کی ہے، چنانچہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی کل عمر پچاس ہزار سال کی ہے، اور یہی ایک دن ہے جو اس آیت میں مراد

لیا گیا ہے، حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا کی پوری مدت یہی ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ کس قدر گزر گئی اور کتنی باقی ہے سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے۔

③ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دن وہ ہے جو دنیا اور آخرت میں فاصلے کا ہے، حضرت محمد بن کعب رحمہ اللہ یہی فرماتے ہیں لیکن یہ قول بہت ہی غریب ہے۔

④ چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بہ سند صحیح مروی ہے، حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قیامت کے دن کو اللہ تعالیٰ کافروں پر پچاس ہزار سال کا کر دے گا، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا یہ دن تو بہت ہی بڑا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ مومن پر اس قدر ہلکا ہو جائے گا کہ دنیا کی ایک فرض نماز کی ادائیگی میں جتنا وقت لگتا ہے اس سے بھی کم ہو گا۔ (ابن جریر، تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے قبیلہ بنو عامر کا ایک شخص گذرا لوگوں نے کہا حضرت یہ اپنے قبیلے میں سب سے بڑا مالدار ہے آپ رضی اللہ عنہ نے اسے بلوایا اور فرمایا کیا واقع میں تم سب سے زیادہ مالدار ہو؟ اس نے کہا ہاں میرے پاس رنگ برنگ سینکڑوں اونٹ، قسم قسم کے غلام، اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے گھوڑے وغیرہ ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا دیکھو خبردار ایسا نہ ہو کہ یہ جانور اپنے پاؤں سے تمہیں روندیں اور اپنے سینگوں سے تمہیں ماریں، بار بار یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ عامری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے کہا حضرت یہ کیوں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا سنو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

مَنْ كَانَتْ لَهُ إِبِلٌ لَا يُعْطِي حَقَّهَا فِي نَجْدَتِهَا وَرِسْلِهَا قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ: مَا نَجْدَتُهَا وَرِسْلُهَا؟ قَالَ: فِي عُسْرِهَا وَيُسْرِهَا فَإِنَّهَا تَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَغَذِّ مَا كَانَتْ وَأَكْثَرِهِ وَأَسْمَنِهِ وَآشَرِهِ، حَتَّى يُبْطَحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ، فَتَطَؤُهُ بِأَخْفَافِهَا، فَإِذَا جَاوَزَتْهُ أُخْرَاهَا

أُعِيدَتْ عَلَيْهِ أُولَاهَا، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ فَيَرَى سَبِيلَهُ، وَإِذَا كَانَتْ لَهُ بَقَرٌ لَا يُعْطِي حَقَّهَا فِي نَجْدَتِهَا وَرِسْلِهَا، فَإِنَّهَا تَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاغَذِّ مَا كَانَتْ وَأَكْثَرِهِ وَأَسْمَنِهِ وَآشَرِهِ ثم يُبْطَحُ لَهَا بِقَاعٍ قَرقَرٍ فَتَطَؤُهُ كُلُّ ذَاتِ ظِلْفٍ بِظِلْفِهَا، وَتَنْطَحُهُ كُلُّ ذَاتِ قَرْنٍ بِقَرْنِهَا، إِذَا جَاوَزَتْهُ أُخْرَاهَا أُعِيدَتْ عَلَيْهِ أُولَاهَا، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ فَيَرَى سَبِيلَهُ. وَإِذَا كَانَتْ لَهُ غَنَمٌ لَا يُعْطِي حَقَّهَا فِي نَجْدَتِهَا وَرِسْلِهَا، فَإِنَّهَا تَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاغَذِّ مَا كَانَتْ وَأَسْمَنِهِ وَآشَرِهِ، حَتَّى يُبْطَحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرقَرٍ، فَتَطَؤُهُ كُلُّ ذَاتِ ظِلْفٍ بِظِلْفِهَا وَتَنْطَحُهُ كُلُّ ذَاتِ قَرْنٍ بِقَرْنِهَا، لَيْسَ فِيهَا عَقْصَاءُ وَلَا عَضْبَاءُ، إِذَا جَاوَزَتْهُ أُخْرَاهَا أُعِيدَتْ عَلَيْهِ أُولَاهَا، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ، فَيَرَى سَبِيلَهُ

جو اپنے اونٹوں کا حق ادا نہ کرے ان کی سختی میں اور ان کی آسانی میں اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک چٹیل لمبے چوڑے صاف میدان میں چت لٹائے گا اور ان تمام جانوروں کو خوب موٹا تازہ کر کے حکم دے گا کہ اسے روندتے ہوئے چلو چنانچہ ایک ایک کر کے اسے کچلتے ہوئے گزریں گے جب آخر والا گذر جائے گا تو اول والا لوٹ کر آجائے گا یہی عذاب اسے ہوتا رہے گا اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے پھر وہ اپنا راستہ دیکھ لے گا۔ اسی طرح گائے گھوڑے بکری وغیرہ یہی سینگ دار جانور اپنے سینگوں سے بھی اسے مارتے جائیں گے کوئی ان میں بے سینگ کا یا ٹوٹے ہوئے سینگ والا نہ ہو گا۔

عامری نے پوچھا اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! فرمایئے اونٹوں میں اللہ کا حق کیا ہے؟ فرمایا مسکینوں کو سواری کے لئے تحفتًا دینا، غرباء کے ساتھ سلوک کرنا دودھ پینے کے لئے جانور دینا ان کے نروں کی ضرورت جنہیں مادہ کے لئے ہوا نہیں مانگا ہوا بے قیمت دینا۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا مَا مِنْ صَاحِبِ كَنْزٍ لَا يُؤَدِّي حَقَّهُ إِلَّا جُعِلَ صَفَائِحَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ، فَتُكْوَى بِهَا جَبْهَتِهِ وَجَنْبِهِ وَظَهْرِهِ، حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَ عِبَادِهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تُعِدُّونَ، ثُمَّ يُرَى سَبِيلُهُ إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ (مسند احمد) سونے چاندی کے خزانے والا اس کا حق ادا نہ کرے اس کا سونا چاندی کی تختیوں کی صورت میں بنایا جائے گا اور جہنم کی آگ میں تپا کر اس کی پیشانی کروٹ اور پیٹھ داغی جائے گی یہاں تک کہ اللہ اپنے بندوں کے فیصلے کرلے اس دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی سے پچاس ہزار سال کی ہوگی پھر وہ اپنا راستہ جنت کی طرف یا جہنم کی طرف دیکھ لے گا۔

ان روایات کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں تھا، مگر مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی پیروی کرتے ہوئے انہی پر اعتماد کرتے ہوئے یہ روایات ہم نے تفسیر ابن کثیر سے نقل کی ہیں، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ روایات اس لیے نقل فرمائی ہیں کہ ان میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے جن میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ ہم اپنی تفسیر کے دوسرے مقام پر جہاں قیامت کے دن کی ہولناکی اور اس کی مقدار کا ذکر ہے تفصیل سے باحوالہ مدلل لکھ چکے ہیں، باقی اصل حقیقت اور اصل ان اعداد سے مراد کیا ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

روز محشر قریب یا بعید؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ﴿٥﴾ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ﴿٦﴾ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ﴿٧﴾ المعارج

جواب ترجمہ: سو آپ ایسا صبر کیجئے جو صبر جمیل ہو، بیشک وہ اس دن کو دور سمجھ رہے ہیں، اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے صبر کی تلقین فرما رہے ہیں، آپ ﷺ کے مخالفین و معاندین آپ ﷺ کی باتیں سن کر جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے تھے، جب کہ

عقل ودانش کی بات یہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کی باتوں کو دل وجان سے تسلیم کرتے ہوئے آپ ﷺ کے سچے پیروکار بن جاتے، مگر وہ اس کے برعکس استہزا کرتے اور جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے تھے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (الشوری ۱۸) یعنی بے ایمان تو قیامت کے جلد آنے کی تمنائیں کرتے ہیں اور ایمان دار اس کے آنے کو حق جان کر اس سے ڈر رہے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے، مگر وہ لوگ جو وقوع قیامت کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اسی لئے یہاں بھی فرمایا کہ یہ تو اسے دور جان رہے ہیں بلکہ محال اور واقع نہ ہونے والا مانتے ہیں لیکن ہم اسے قریب ہی دیکھ رہے ہیں، یعنی مومن تو اس کا آنا حق جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب آیا ہی چاہتی ہے، نہ جانے کب قیامت قائم ہو جائے اور کب عذاب آپڑیں، کیونکہ اس کے صحیح وقت کو تو سوائے اللہ کے اور کوئی جانتا ہی نہیں، پس ہر وہ چیز جس کے آنے اور ہونے میں کوئی شک نہ ہو اس کا آنا قریب ہی سمجھا جاتا ہے اور اس کے ہو پڑنے کا ہر وقت کھٹکا ہی رہتا ہے۔

ہولناک دن، خوفناک منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ لفظ الم ھل کا کیا مطلب ہے؟

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ {۸} وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ {۹} وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا {۱۰} يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ {۱۱} وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ {۱۲} وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ {۱۳} وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ {۱۴} كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى {۱۵} نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى {۱۶} تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى {۱۷} وَجَمَعَ فَاَوْعٰى {۱۸} المعارج.

جواب ترجمہ: (وہ عذاب) اس دن ہو گا جب آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگین روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو پوچھے گا بھی نہیں۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیے جائیں گے۔ مجرم یہ چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹے فدیہ میں دیدے۔ اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی، اور اپنا وہ خاندان جو اسے پناہ دیتا تھا۔ اور زمین کے سارے کے سارے باشندے۔ پھر (ان سب کو فدیہ میں دے کر) اپنے آپ کو بچالے۔ (لیکن) ایسا ہر گز نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ جو کھال اتار لے گی۔ ہر اس شخص کو بلائے گی جس نے پیٹھ پھیر کر منہ موڑا ہو گا۔ اور مال جمع کیا پھر اس کو سنبھال کر رکھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس عذاب کو یہ طلب کر رہے ہیں وہ عذاب ان طلب کرنے والے کافروں پر اس دن آئے گا جس دن آسمان مثل مھل کے ہو جائے گا، یعنی زیتون کی تلچھٹ جیسا ہو جائے گا، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنی ہوئی اون۔

پھر روز محشر کی ہولناکی کی اطلاع دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کوئی قریبی رشتہ دار کسی اپنے قریبی رشتہ دار سے پوچھ گچھ بھی نہ کرے گا حالانکہ ایک دوسرے کو بری حالت میں دیکھ رہے ہوں گے لیکن خود ایسے مشغول ہوں گے کہ دوسرے کا حال پوچھنے کا بھی ہوش نہیں سب آپا دھاپی میں پڑے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، وَيَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ يَفِرُّ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ، ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، آپس میں ایک دوسرے سے تعارف کریں گے، پھر ایک دوسرے سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے (لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ (عبس:۳۷) یعنی ہر ایک ایسے مشغلے میں لگا ہوا ہو گا جو دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ دے گا۔

سورۃ لقمان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ (لُقْمَانَ:

۳۳) اے لوگو! اپنے پروردگار (کی ناراضی) سے بچو، اور ڈرو اس دن سے جب کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام نہیں آئے گا، اور نہ کسی بیٹے کی یہ مجال ہو گی کہ وہ اپنے باپ کے ذرا بھی کام آجائے۔ یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

سورۃ فاطر میں ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى (فَاطِرَ: ۱۸) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور جس کسی پر بڑا بوجھ لدا ہوا ہو، وہ اگر کسی اور کو اس کے اٹھانے کی دعوت دے گا تو اس میں سے کچھ بھی اٹھایا نہیں جائے گا، چاہے وہ (جسے بوجھ اٹھانے کی دعوت دی گئی تھی) کوئی قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ (الْمُؤْمِنُونَ ۱۰۱) جب صور پھونکا جائے گا تو نہ ہی کوئی رشتہ نسب ان کے درمیان اس دن ہو گا اور نہ ہی ایک دوسرے سے کوئی سوال کریں گے۔

روز محشر کی ہولناکی کا کیا پوچھنا اور کیا بتانا اس دن تو ہر شخص اپنی پریشانیوں کی وجہ سے دوسرے سے غافل ہو گا، یہ وہ دن ہو گا کہ اس دن ہر گنہگار دل سے چاہے گا کہ اپنی اولاد کو اپنے فدیہ میں دے کر جہنم کے آج کے عذاب سے چھوٹ جائے اور اپنی بیوی، بھائی، اپنے رشتے کنبے، اپنے خاندان اور قبیلے کو بلکہ چاہے گا کہ تمام روئے زمین کے لوگوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے لیکن اسے آزاد کر دیا جائے۔ آہ! کیا ہی دل گداز منظر ہے کہ انسان اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو، اپنی شاخوں، اپنی جڑوں سب کو آج فدا کرنے پر تیار ہے تاکہ خود بچ جائے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فصیلہ کنبے اور خاندان کو کہتے ہیں جب کہ مالک فرماتے ہیں کہ فصیلہ ماں کو کہا گیا ہے غرض تمام تر محبوب ہستیوں کو اپنی طرف سے بھینٹ میں دینے

پر دل سے رضامند ہو گا، لیکن کوئی چیز کام نہ آئے گی کوئی بدلہ اور فدیہ نہ چلے گا، کوئی عوض اور معاوضہ قبول نہ کیا جائے گا۔

بلکہ اس آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا جو اونچے اونچے اور تیز تیز شعلے پھینکنے والی اور سخت بھڑکنے والی ہے جو سر کی کھال تک جھلسا کر کھینچ لاتی ہے، بدن کی کھال دور کر دیتی ہے اور کھوپڑی پلپلی کر دیتی ہے، ہڈیوں کو گوشت سے الگ کر دیتی ہے، رگ پٹھے کھنچنے لگتے ہیں، ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے ہیں، پنڈلیاں کٹی جاتی ہیں چہرہ بگڑ جاتا ہے، ہر ایک عضو بدل جاتا ہے، چیخ پکار کرتا رہتا ہے، ہڈیوں کا چورا کرتی رہتی ہے، کھالیں جلائی جاتی ہے۔

یہ آگ اپنی فصیح زبان اور اونچی آواز سے اپنے والوں کو جنہوں نے دنیا میں بدکاریاں اور اللہ کی نافرمانیاں کی تھیں پکارتی ہے پھر جس طرح پرند جانور دانہ چگتا ہے اسی طرح میدان محشر میں سے ایسے بدلوگوں کو ایک ایک کر کے دیکھ بھال کر چن لیتی ہے۔

اب ان کی بداعمالیاں بیان ہو رہی ہیں کہ یہ دل سے جھٹلانے والے اور بدن سے عمل چھوڑ دینے والے تھے، یہ مال کو جمع کرنے والے اور سر بند کر کے رکھ چھوڑنے والے تھے، اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام میں بھی مال خرچ کرنے سے بھاگتے تھے بلکہ زکوٰۃ تک ادا نہ کرتے تھے۔ حدیث شریف میں ہے وَلَا تُوعِي فَيُوعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ، سمیٹ سمیٹ کر سینت سینت کر نہ رکھ ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے روک لے گا۔ حضرت عبداللہ بن عکیم رحمہ اللہ تو اس آیت پر عمل کرتے ہوئے کبھی تھیلی کا منہ ہی نہ باندھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر) امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں يَا ابْنَ آدَمَ، سَمِعتَ وَعِيدَ اللّٰهِ ثُمَّ أَوعَيتَ الدُّنيَا، اے ابن آدم! اللہ تعالیٰ کی وعید سن رہا ہے پھر مال سمیٹتا جا رہا ہے؟

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں كَانَ جَمُوعًا قَمُومًا لِلخَبِيثِ، مال کو جمع کرنے میں حلال حرام کا پاس نہ رکھتا تھا اور فرمان اللہ ہوتے ہوئے بھی خرچ کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

مُھل، تیل کی تلچھٹ کو کہتے ہیں، زیتون کی تلچھٹ، سیسہ، تانبا یا چاندی میں سے جسے پگھلایا گیا ہو المُھل، خالص پیپ جو خون اور کچلہو سے مل کر بنی ہو۔

نمازیوں کی عمدہ صفات

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا {۱۹} اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا {۲۰} وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا {۲۱} اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ {۲۲} الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ {۲۳} وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ {۲۴} لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ {۲۵} وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ {۲۶} وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ {۲۷} اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ {۲۸} وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ {۲۹} اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ {۳۰} فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ {۳۱} وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ {۳۲} وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ {۳۳} وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ {۳۴} اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ {۳۵} المعارج.

جواب حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے۔ اور جب اس کے پاس خوشحالی آتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔ مگر وہ نمازی ایسے نہیں ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ اور جن کے مال و دولت میں ایک متعین حق ہے۔ سوالی اور بے سوالی کا۔ اور جو روز جزاء کو برحق مانتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ بلاشبہ ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور ان باندیوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ان کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار

کرنا چاہیں وہ حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیاں ٹھیک ٹھیک دینے والے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی پوری پوری حفاظت کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو جنتوں میں عزت کے ساتھ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی صفات بیان کرتے ہوئے ھلوع قرار دیا ہے، ھلوع کا معنیٰ حریص اور بے صبرا کے ہیں، کہ اس کی تخلیق ایسی صفات پر کی گئی ہے کہ اس میں جزع فزع پائی جاتی ہے، اس میں حرص وآز پائی جاتی ہے، جب اسے کسی ناپسندیدہ چیز کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کسی تنگی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو پھر یہ بہت زیادہ جزع فزع کرتا ہے، اور جب اسے بھلائی اور آسانی پہنچتی ہے تو پھر یہ چیزوں کو روکتا ہے، منع کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے نمازیوں کی شان بیان فرمائی کہ انہیں ان صفات سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، ان کے لیے اعزاز واکرام یہ بتایا گیا کہ وہ عزتوں والے باغات میں ہوں گے۔

نمازیوں کی کچھ صفات اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر بیان فرمائی ہیں کہ

① یہ لوگ تمام اوقات میں نمازوں کی حفاظت فرماتے ہیں، دنیا کی کوئی چیز بھی انہیں نمازوں سے غافل نہیں کر سکتی۔

② دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں جو حصہ زکوٰۃ وغیرہ کے لیے معین فرمایا ہے اسے اللہ کے حکم کی تعمیل میں نکالتے ہیں۔ سائلین اور محرومین کو یہ اپنے مالوں میں سے عطا کرتے ہیں۔

③ ان کی ایک صفت یہ ہے کہ روز حساب وجزا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس میں شرمندگی، ندامت اور نقصان سے بچنے کے لیے نیک اعمال بجالاتے ہیں۔

④ ایک صفت ان کی یہ ہے کہ یہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسا ہوگا جس سے بے خوف نہیں ہوا جاسکتا۔

⑤ ایک صفت ان کی یہ ہے کہ یہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ان پر حرام کی ہوئی ہیں ان سے بچتے ہیں اور جو حلال کی ہوئی ہیں انہیں استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے پاکیزہ اور حلال ان کی بیویاں اور ان کی باندیاں ہیں، باندیاں جو ان کی ملکیت میں آچکی ہیں ان کے پاس جانے یا انہیں اپنے پاس بلانے میں ان کا کوئی مؤاخذہ یا پکڑ نہیں ہو گی۔

⑥ ایک صفت ان کی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ کے بندوں کی امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اللہ کے بندوں سے انہوں نے جو عہد و پیمان باندھ رکھے ہیں ان کی وہ حفاظت کرتے ہیں۔

⑦ ان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ سچی گواہی بغیر کسی تبدیلی یا بغیر چھپائے دے دیتے ہیں۔

⑧ ایک صفت ان کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز کی ادائیگی کی حفاظت کرتے ہیں، جو چیزیں نماز سے متعلق ضروری ہیں ان میں سے کوئی چیز نہیں چھوڑتے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں یہاں انسانی جبلت کی کمزوری بیان ہو رہی ہے کہ یہ بڑا ہی بے صبرا ہے، مصیبت کے وقت تو مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے باؤلا سا ہو جاتا ہے، گویا دل اڑ گیا اور گویا اب کوئی آس باقی نہیں رہی، اور راحت کے وقت بخیل کنجوس بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ڈکار جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شَرُّ مَا فِي رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ، وَجُبْنٌ خَالِعٌ (مسند احمد) بدترین چیز انسان میں بے حد بخیلی اور اعلیٰ درجہ کی نامردی ہے۔

پھر فرمایا کہ ہاں اس مذموم خصلت سے وہ لوگ دور ہیں جن پر خاص فضل الٰہی ہے اور جنہیں توفیق خیر ازل سے مل چکی ہے، جن کی صفتیں یہ ہیں کہ وہ پورے نمازی ہیں وقتوں کی نگہبانی کرنے، واجبات نماز کو اچھی طرح بجالانے، سکون اطمینان اور خشوع خضوع سے پابندی کے ساتھ نماز ادا

کرنے والے۔ جیسے سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے {قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ} (الْمُؤْمِنُونَ: ۱، ۲) ان ایمان داروں نے نجات پالی جو اپنی نماز خوف اللہ سے ادا کرتے ہیں۔

ٹھہرے ہوئے بے حرکت کے پانی کو بھی عرب ماءٌ دائمٌ کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں اطمینان واجب ہے، جو شخص اپنے رکوع سجدے پوری طرح ٹھہر کر با اطمینان ادا نہیں کرتا ہے وہ اپنی نماز پر دائم نہیں کیونکہ نہ وہ سکون کرتا ہے نہ اطمینان بلکہ کوّے کی طرح ٹھونگیں مارتا ہے اس کی نماز اسے نجات نہیں دلوائے گی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر نیک عمل پر مداومت اور ہمیشگی کرنا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی علیہ صلوات اللہ کا فرمان ہے کہ أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ، اللہ کو سب سے زیادہ پسند وہ عمل ہے جس پر مداومت کی جائے گو کم ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کا اپنا عمل مبارک یوں بتاتی ہیں كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا عَمِلَ عَمَلًا دَاوَمَ عَلَيْهِ حضور ﷺ کی عادت بھی یہی تھی کہ جس کام کو کرتے اس پر ہمیشگی کرتے تھے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ذُكِرَ لَنَا أَنَّ دَانْيَالَ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، نَعَتَ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يُصَلُّونَ صَلَاةً لَوْ صَلَّاهَا قَوْمُ نُوحٍ مَا غَرِقُوا، أَوْ قَوْمُ عَادٍ مَا أُرْسِلَتْ عَلَيْهِمُ الرِّيحُ الْعَقِيمُ، أَوْ ثَمُودُ مَا أَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ. فَعَلَيْكُمْ بِالصَّلَاةِ فَإِنَّهَا خُلُقٌ لِلْمُؤْمِنِينَ حَسَنٌ (تفسیر ابن کثیر)

ہم سے ذکر کیا گیا کہ حضرت دانیال پیغمبر نے امت محمد ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایسی نماز پڑھے گی کہ اگر قوم نوح ایسی نماز پڑھتی تو ڈوبتی نہیں اور قوم عاد کی اگر ایسی نماز ہوتی تو ان پر بے برکتی کی ہوائیں نہ بھیجی جاتیں اور اگر قوم ثمود کی نماز ایسی ہوتی تو انہیں چیخ سے ہلاک نہ کیا جاتا، پس اے لوگو! نماز کو اچھی طرح پابندی سے پڑھا کرو مومن کا یہ زیور اور اس کا بہترین خلق ہے۔

کافروں کا طرز عمل اور جنت کا لالچ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ{۳۶}عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ {۳۷} اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ {۳۸} كَلَّا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ{۳۹} المعارج

جواب ترجمہ: تو (اے پیغمبر) ان کافروں کو کیا ہو گیا کہ یہ تمہاری طرف چڑھے چلے آرہے ہیں۔ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی، ٹولیاں بنا بنا کر۔ کیا ان میں سے ہر شخص کو یہ لالچ ہے کہ اسے نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے؟ ہر گز ایسا نہیں ہو گا ہم نے ان کو اس چیز سے پیدا کیا ہے جسے یہ خود جانتے ہیں۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ عزوجل ان کافروں پر انکار کر رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں تھے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دیکھ رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایت لے کر آئے وہ ان کے سامنے تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے معجزے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر باوجود ان تمام باتوں کے وہ بھاگ رہے تھے اور ٹولیاں ٹولیاں ہو کر دائیں بائیں کترا جاتے تھے، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (۴۹) كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۵۰) فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۵۱) (المدثر) یہ نصیحت سے منہ پھیر کر ان گدھوں کی طرح جو شیر سے بھاگ رہے ہوں کیوں بھاگ رہے ہیں؟

یہاں بھی اسی طرح فرمارہا ہے کہ ان کفار کو کیا ہو گیا ہے یہ نفرت کر کے کیوں تیرے پاس سے بھاگے جارہے ہیں؟ کیونکہ دائیں بائیں سرکتے جاتے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ متفرق طور پر اختلاف کے ساتھ ادھر ادھر ہو رہے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے خواہش نفس پر عمل کرنے والوں کے حق میں فرمایا کہ فَهُمْ مُخَالِفُونَ لِلْكِتَابِ، مُخْتَلِفُونَ فِي الْكِتَابِ، مُتَّفِقُونَ عَلَى مُخَالَفَةِ الْكِتَابِ، وہ کتاب اللہ کے مخالف ہوتے ہیں، اللہ کی کتاب میں اختلاف کرتے ہیں، مگر اللہ کی کتاب کی مخالفت کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ ٹولیاں ہو کر بے پرواہی کے ساتھ تیرے دائیں بائیں ہو کر تجھے مذاق سے گھورتے ہیں۔ حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی دائیں بائیں الگ ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس شخص نے کیا کہا؟ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں دائیں بائیں ٹولیاں ٹولیاں ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد پھرتے رہتے ہیں نہ کتاب اللہ کی چاہت ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَلَيْهِمْ وَهُمْ حِلَقٌ، فَقَالَ: مَالِي أَرَاكُمْ عِزِينَ؟ (مسند احمد، مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس آئے اور وہ متفرق طور پر حلقے حلقے تھے تو فرمایا میں تمہیں الگ الگ جماعتوں کی صورتوں میں کیسے دیکھ رہا ہوں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَلَى أَصْحَابِهِ وَهُمْ حِلَقٌ حِلَقٌ، فَقَالَ: مَالِي أَرَاكُمْ عِزِينَ؟ (ابن جریر، طبری، تفسیر ابن کثیر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کی طرف تشریف لائے تو وہ لوگ حلقے حلقے بنا کر بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں الگ الگ ٹولیوں کی صورت میں کیسے دیکھ رہا ہوں؟ {أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِءٍ مِنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ} کیا ان کی چاہت ہے کہ جنت نعیم میں داخل کئے جائیں؟ ایسا نہ ہو گا یعنی جب ان کی یہ حالت ہے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دائیں بائیں کترا جاتے ہیں پھر ان کی یہ چاہت پوری نہیں ہو سکتی بلکہ یہ جہنمی گروہ ہے۔

{إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ} اب جس چیز کو یہ محال جانتے تھے اس کا بہترین ثبوت ان ہی کی معلومات اور اقرار سے بیان ہو رہا ہے کہ جس نے تمہیں ضعیف پانی سے پیدا کیا ہے جیسے کہ خود تمہیں بھی معلوم ہے پھر کیا وہ تمہیں دوبارہ نہیں پیدا کر سکتا؟ جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ (المرسلات:۲۰) کیا ہم نے تمہیں ناقدرے پانی سے پیدا نہیں کیا؟

سورۃ الطارق میں فرمایا{فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ} (الطارق: ۵،۱۰) انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور چھاتی کے درمیان سے نکلتا ہے، یقیناً وہ اللہ اس کے لوٹانے پر قادر ہے جس دن پوشیدگیاں کھل جائیں گی اور کوئی طاقت نہ ہو گی نہ مددگار۔

اللہ قادر ہے عاجز نہیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ {۴۰} عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ {۴۱} (المعارج)

جواب ترجمہ: اب میں قسم کھاتا ہوں ان تمام مقامات کے مالک کی جہاں سے ستارے نکلتے اور جہاں سے غروب ہوتے ہیں کہ ہم یقیناً اس بات پر قادر ہیں۔ کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں، اور کوئی ہمیں ہرا نہیں سکتا۔

{فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ} یہاں بھی فرماتا ہے مجھے قسم ہے اس کی جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور مشرق و مغرب متعین کی اور ستاروں کے چھپنے اور ظاہر ہونے کی جگہیں مقرر کر دیں، مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! جیسا تمہارا گمان ہے ویسا معاملہ نہیں کہ نہ حساب کتاب ہو نہ حشر

نشر ہو بلکہ یہ سب یقیناً ہونے والی چیزیں ہیں۔ اسی لئے قسم سے پہلے ان کے باطل خیال کی تکذیب کی اور اسے اس طرح ثابت کیا کہ اپنی قدرت کاملہ کے مختلف نمونے ان کے سامنے پیش کئے، مثلاً آسمان وزمین کی ابتدائی پیدائش اور حیوانات، جمادات اور مختلف قسم کی مخلوق کی موجودگی جیسے اور جگہ ہے {لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ} (غَافِرٍ: ۵۷) یعنی آسمان وزمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب بڑی بڑی چیزوں کو پیدا کرنے پر اللہ قادر ہے تو چھوٹی چیزوں کی پیدائش پر کیوں قادر نہ ہو گا؟

جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے {أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى بَلَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ} (الأَحْقَافِ: ۳۳) یعنی کیا یہ نہیں دیکھتے کہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان کی پیدائش میں نہ تھکا کیا وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ بیشک وہ قادر ہے اور ایک اس پر کیا ہر ایک چیز پر اسے قدرت حاصل ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے {أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَى وَهُوَ الْخَلاقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ} یعنی کیا زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا، ان کے مثل پیدا کرنے پر قادر نہیں؟ ہاں ہے اور وہی پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے، وہ جس چیز کا ارادہ کرے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ (سورۃ یٰسین ۸۲،۸۱)

یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ مشرق اور مغرب کے پروردگار کی قسم ہم ان کے ان جسموں کو جیسے یہ آپ ہیں اس سے بھی بہتر صورت میں بدل ڈالنے پر پورے پورے قادر ہیں کوئی چیز کوئی شخص اور کوئی کام ہمیں عاجز اور درماندہ نہیں کر سکتا۔

جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے {أَيَحْسَبُ الإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ بَلَى قَادِرِينَ عَلَى أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ} (الْقِيَامَةِ: ۳،۴) کیا کسی شخص کا یہ گمان ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہ کر سکیں

گے ؟غلط گمان ہے بلکہ ہم تو اس کی پور پور جمع کر کے ٹھیک ٹھاک بنادیں گے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا{نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَى أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ} (الْوَاقِعَةِ) ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کر دی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تم جیسوں کو بدل ڈالیں اور تمہیں اس نئی پیدائش میں پیدا کریں جسے تم جانتے بھی نہیں، پس ایک مطلب تو آیت مندرجہ بالا کا یہ ہے، دوسرا مطلب امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ہم قادر ہیں اس امر پر کہ تمہارے بدلے ایسے لوگ پیدا کر دیں جو ہمارے مطیع و فرمانبردار ہوں اور ہماری نافرمانیوں سے رکے رہنے والے ہوں۔

جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے{وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ} [مُحَمَّدٍ: ۳۸] یعنی اگر تم نے منہ موڑا تو اللہ تمہارے سوا اور قوم کو لائے گا اور وہ تم جیسی نہ ہو گی، لیکن پہلا مطلب دوسری آیتوں کی صاف دلالت کی وجہ سے زیادہ ظاہر ہے۔

سرکشوں کے لیے ڈھیل

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ {۴۲}يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَى نُصُبٍ يُوفِضُونَ {۴۳}خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ{۴۴}المعارج

جواب ترجمہ: سو آپ ان کو ان کے شغل میں رہنے دیجئے باطل چیزوں میں غور و خوض کیا کریں اور کھیلتے رہیں یہاں تک کہ اپنے اس دن سے ملاقات کر لیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

اللہ فرماتا ہے اے نبی! ﷺ انہیں ان کے جھٹلانے، کفر کرنے، سرکشی میں بڑھنے ہی میں چھوڑ دو جس کا وبال ان پر اس دن آئے گا جس کا ان سے وعدہ ہو چکا ہے، جس دن اللہ تعالیٰ انہیں بلائے گا

اور یہ میدان محشر کی طرف جہاں انہیں حساب کے لئے کھڑا کیا جائے گا اس طرح لپکتے ہوئے جائیں گے جس طرح دنیا میں کسی بت یا علم، تھان اور چلے کو چھونے اور ڈنڈوت کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے جاتے ہیں، مارے شرم و ندامت کے نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی اور چہروں پر پھٹکار برس رہی ہوگی، یہ ہے دنیا میں اللہ کی اطاعت سے سرکشی کرنے کا نتیجہ ! اور یہ ہے وہ دن جس کے ہونے کو آج محال جانتے ہیں اور ہنسی مذاق میں نبی ﷺ ، شریعت اور کلام الٰہی کی حقارت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیامت کیوں قائم نہیں ہوتی ؟ ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؟

الحمدللہ ثم الحمدللہ، آج سورۃ المعارج کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اس میں لکھی گئی اچھی چیزوں کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول و منظور فرمائے، اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ ومشائخ کے لیے، میرے معاونین ومساعدین کے لیے توشہ آخرت بنادے آمین بحرمۃ النبی الکریم ﷺ

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۳ مئی ۲۰۱۹ء بروز جمعۃ المبارک رات ساڑھے بارہ بجے

حروف بینی و نظر ثانی: ۳۱ جولائی ۲۰۱۹ء بروز بدھ، حال وارد حدوٹ مری

☆☆☆☆

نوح

عبادت، تقویٰ اور اطاعت کا فائدہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۱} قَالَ يَاقَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ {۲} أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ {۳} يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ {۴}نوح

جواب ترجمہ: بلاشبہ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو اس سے پہلے ڈرایئے کہ ان پر دردناک عذاب آجائے۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم بلاشبہ میں تمہیں صاف طریقہ پر ڈرانے والا ہوں۔ کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ وہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور تمہیں وقت مقرر تک مہلت دے گا بلاشبہ جب اللہ کی مقرر کی ہوئی اجل آجائے تو مؤخر نہیں کی جاتی کیا خوب ہوتا اگر تم جانتے ہوتے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے نسل در نسل ساڑھے نو سو سال تک مسلسل اللہ کا دین پھیلانے کی جدوجہد کی اس طویل عرصہ میں نہ تو آپ نے اپنی جدوجہد اور کوشش میں کمی آنے دی اور نہ مایوس ہوئے بلکہ تبلیغ دین کی وجہ سے قوم نے جو بدترین تکلیفیں پہنچائیں ان پر صبر کیا۔

اس قوم کا یہ حال تھا کہ وہ کبھی ان کا گلا گھونٹ دیتے جس سے وہ بے ہوش ہو جاتے۔ کبھی وہ پتھر مار مار کر ان کو زخمی کر دیتے۔ کبھی اتنا مارتے کہ آپ پر غشی طاری ہو جاتی لیکن ہوش میں آنے پر ان کی زبان پر بد دعا کے بجائے یہ الفاظ ہوتے رَبِّ اغفِر لِقَومِی بِأَنَّهُم لَا يَعلَمُونَ، اے میرے پروردگار! ان کو معاف فرمادے کیونکہ یہ مجھے جانتے نہیں۔

اللہ تعالیٰ سورۃ نوح کی ان ابتدائی آیات میں بیان فرماتا ہے کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ عذاب کے آنے سے پہلے اپنی قوم کو ہوشیار کر دو اگر وہ توبہ کر لیں گے اور اللہ کی طرف جھکنے لگیں گے تو اللہ کا عذاب ان سے اٹھ جائے گا۔

نوح علیہ السلام نے اللہ کا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا اور صاف کہہ دیا کہ دیکھو میں کھلے لفظوں میں تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں، میں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اللہ کی عبادت اس کا ڈر اور میری اطاعت لازمی چیزیں ہیں جو کام رب نے تم پر حرام کئے ہیں ان سے بچو گناہ کے کاموں سے الگ تھلگ رہو جو میں کہوں بجالاؤ جس سے روکوں رک جاؤ میری رسالت کی تصدیق کرو تو اللہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

دعوتِ نوح اور اس کا سخت ترین رد عمل

سوال حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کے لیے دعوت کیا تھی؟ اور ان کی قوم کا رد عمل کیا تھا؟

جواب حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا، اے میرے رب! میں نے رات دن اپنی قوم سے تجھ پر ایمان لانے کو کہا، انہیں دعوت دی کہ وہ تیری اطاعت کریں، مگر میں جوں جوں انہیں دعوت دیتا گیا توں توں یہ لوگ ایمان لانے سے بھاگتے اور منہ پھیرتے گئے، میں جب بھی انہیں دعوت دیتا کہ وہ تجھ پر ایمان لائیں تاکہ یہ عظیم الشان کام ان کے لیے تیری بخشش اور مغفرت کا سبب بن جائے، مگر ان کی سرکشی، نفرت اور تمرد کا عالم یہ تھا کہ وہ میری آواز اپنے کانوں کی دہلیز سے اندر جانے سے روکنے کے لیے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے، جب ان کی سرکشی، نفرت اور حقارت کا یہ منظر میں دیکھتا تو پھر انگلیوں کے اشارے سے انہیں تیری عظمت وبڑائی کی طرف اشارے کرتا تھا، وہ یہ اشارے بھی پسند نہیں کرتے تھے، اپنی آنکھوں پر کپڑے لٹکا لیتے تھے تاکہ وہ مجھے دیکھ ہی نہ سکیں۔

وہ لوگ اپنے کفر پر ڈٹے رہے، ایمان قبول کرنے کی بجائے شدید ترین تکبر کا اظہار کرتے رہے، پھر میں نے علی الاعلان اور خفیہ طریقوں سے، چپکے چپکے انہیں دعوت دی، پھر میں نے اونچی اور بلند

آواز میں انہیں دعوت دی، میں نے انہیں بہت ہی آہستہ آواز میں بھی دعوت دی۔

پھر میں نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے کفر سے توبہ کرو، وہ اپنے ان بندوں کی جو اس کی طرف رجوع کرتے اور توبہ کرتے ہیں توبہ بہت ہی زیادہ قبول کرنے والا ہے، اسی کی منظر کشی قرآن کریم نے یہاں یوں کی ہے، ارشاد ہے

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَہَارًا ۙ﴿۵﴾فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا ۟﴿۷﴾ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُہُمۡ جِہَارًا ﴿۸﴾ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَہُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَہُمۡ اِسۡرَارًا ۙ﴿۹﴾ نوح.

(پھر) نوح نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا کہ: میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن (حق کی) دعوت دی ہے۔ لیکن میری دعوت کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوا کہ وہ اور زیادہ بھاگنے لگے۔ اور میں نے جب بھی انہیں دعوت دی، تاکہ آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں، اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیے، اپنی بات پر اڑے رہے، اور تکبر ہی تکبر کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پھر میں نے انہیں پکار پکار کر دعوت دی۔ پھر میں نے ان سے علانیہ بھی بات کی، اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔

توبہ اور استغفار کے فوائد

سوال توبہ اور استغفار کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟

جواب توبہ اور استغفار کرنے کے بے شمار فوائد ہیں، کچھ فوائد قرآن کریم نے یہاں بیان فرمائے ہیں

① توبہ و استغفار کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موسلا دھار بارشیں مسلسل اتارتے ہیں۔

② توبہ اور استغفار کی وجہ سے مال کو مدد و نصرت کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔

③ توبہ اور استغفار کیوجہ سے اولاد مدد و نصرت کا ذریعہ بنادی جاتی ہے۔

④ توبہ اور استغفار کرنے والوں کے لیے ایسے باغات کی خوشخبری دی گئی ہے جن کے پھلوں اور خوبصورتیوں سے لطف اندوزی کے ساتھ فائدہ اٹھائے گا۔

⑤ توبہ اور استغفار کرنے والوں کے لیے ایسی نہریں رواں دواں ہوں گی جن سے وہ خود پانی پئیں گے اور اپنے جانوروں کو بھی پلائیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام کا قول نقل فرماتے ہیں

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا {۱۰} يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا {۱۱} وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا {۱۲} نوح.

چنانچہ میں نے کہا کہ: اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا، اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کر دے گا۔

اللہ کی عظمت سے بے خوفی

سوال اس آیت کا ترجمہ کریں نیز یہ بتائیں کہ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا کا کیا معنیٰ اور مفہوم ہے۔

مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا {۱۳} نوح.

جواب ترجمہ: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے بالکل نہیں ڈرتے؟

حضرت نوح علیہ السلام نے ہر اعتبار سے جب اپنی قوم کو صبح و شام سمجھایا اس کے باوجود جب وہ نہ سمجھی تو اس کی ہٹ دھرمی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تم اس نصیحت آموز گفتگو کو سنی ان سنی کر رہے ہو، اپنی پسند و ناپسند کی طرف دھیان رکھتے اور توجہ دیتے ہو مگر جو ذات عالی تمہیں سب کچھ عطا کر رہی ہے، سب کچھ دے رہی ہے تم اس کے پیغام کو قبول تو دور کی بات ہے سنتے تک نہیں ہو، تمہاری تمام تر سرکشیوں اور بدمستیوں کے باوجود وہ ذات عالی تمہیں اپنی گرفت میں نہیں لے رہی۔

تمہیں کون سی چیز اس کے جلال پادشاہی سے متاثر نہیں ہونے دیتی، تمہاری حرکتوں اور چالوں سے یوں پتہ چلتا ہے کہ رب العالمین کو تم لوگ بے بس خیال کرتے ہو، تمہیں کس چیز نے دھوکہ میں مبتلا کیا ہوا ہے؟

(ترجون) کے معنی یہاں منتظر اور متوقع رہنے کے اور وقار کے معنی عظمت شان اور جلال کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میں جمال کی صفات کے ساتھ جلال کی صفات بھی ہیں جو ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہیں جو اس کے رسولوں کی نافرمانی کرتے اور اس کے آگے اکڑتے ہیں۔ صراط مستقیم پر استوار رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دونوں ہی قسموں کی صفات کی یادداشت تازہ رکھے۔ اگر ان میں عدم توازن پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن صفات الٰہی کے باب میں غیر متوازن ہو جاتا ہے جس سے اس کی ساری زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہاں خطاب چونکہ سرکشوں سے ہے اس وجہ سے صرف صفت جلال ہی کا حوالہ دیا ہے۔ (تفسیر تدبر قرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں" یعنی اللہ کی بڑائی سے امید رکھنا چاہیے کہ تم اس کی فرمانبرداری کروگے تو تم کو بزرگی اور عزت و وقار عنایت فرمائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس کی عظمت و جلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یہاں کئی حضرات کے اقوال پیش کیے ہیں" ایک قول یہ کیا گیا ہے، رجا یہاں خوف کے معنی میں ہے یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے کہ وہ تم میں سے کسی کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف کو ترک کرنے میں تمہارے پاس کیا عذر ہے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، ابو العالیہ رحمہ اللہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب کی امید نہیں رکھتے اور اس کے عقاب سے نہیں ڈرتے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے عقاب سے نہیں ڈرتے اور اس سے ثواب کی امید رکھتے ہو۔ والبی رحمہ اللہ اور عوفی رحمہ اللہ نے ان سے روایت نقل کی ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نہیں جانتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال نہیں کرتے؟ مجاہد رحمہ اللہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کی پرواہ نہیں کرتے؟ قطرب نے کہا: یہ مجازی لغت ہے۔ بنو ہذیل، بنو خزاعہ اور بنو مضر کہتے ہیں لم ارج کا معنی ہے: میں پرواہ نہیں کرتا، وقار کا معنی عظمت ہے، توقیر کا معنی تعظیم ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے پکڑ کی امید نہیں رکھتے، گویا معنی یوں ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اللہ تعالیٰ سے ایمان پر جزا کی امید نہیں رکھتے۔

ابن کیسان نے کہا، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کے بارے میں یہ امید نہیں رکھتے کہ وہ تمہیں اس صورت میں بدلہ دے کہ تمہیں بھلائی عطا کر کے عزت دے۔ ابن زید نے کہا، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طاعت نہیں کرتے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا حق نہیں پہچانتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا نہیں لاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا وجہ ہے تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ جو اس کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ اس کی وحدانیت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وقار کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت قدم ہونا اس معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ (الاحزاب: ۳۳) اپنے گھروں میں ٹھہری رہو، اس کا معنیٰ ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اثبات نہیں کرتے جب کہ وہ تمہارا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (تفسیر قرطبی)

تخلیق انسانی کے مختلف مراحل

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ یہاں اطوار کا کیا مفہوم ہے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا {۱۴} نوح

جواب ترجمہ: حالانکہ اس نے تمہیں تخلیق کے مختلف مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں "تحقیق اس نے تمہیں کئی رنگوں میں پیدا فرمایا ہے اور ہر رنگ پہلے رنگ سے بہتر اور زیادہ اچھا ہے اور پہلی حالت سے تمہاری ترقی کا موجب ہوا ہے، پہلے تم عناصر تھے اس کے بعد اس نے تمہیں غذائی مرکبات بنا دیا، پھر نطفہ بنایا، پھر منجمد خون، پھر جما ہوا گوشت کا ٹکڑا، پھر ہڈی اور نرم گوشت اور یہ سات حالتیں روح پھونکنے سے پہلے واقع ہوئیں، پھر جب روح پھونک دی تو پیٹ کا بچہ تھے، تمہیں حرکت، انتقال اور حواس اور قویٰ استعمال کرنے کی جگہ بالکل میسر نہ تھی اس کے بعد تم نشو و نما والا بچہ ہو گئے اور تم نے ماں کے دودھ کی لذت پائی اور تم نے ماں کی گود میں قرار پایا اور اس نے تمہیں حرکت اور استعمال حواس کی کچھ جگہ عطا فرمائی، پھر تم نیا چلنے والا طفل ہو گئے اور اس نے تمہیں سیر، ادھر ادھر گھومنے اور دیکھنے کی لذت بخشی اور چکھائی لیکن صرف اپنے گھر اور کوچہ کے اندر پھر تم نوجوان ہو گئے اور اس نے تمہیں بازار، باغ، دریا اور محفلوں کی سیر، بے شمار لوگوں کو دیکھنا اور نغمات کو سننا عطا فرمایا، پھر تم پورے جوان ہو گئے اور تم نے دور دراز کے سفر اور اموال کمانا شروع کر دیے پھر تم درمیانہ عمر کے ہو گئے اور تم نے عقل، تجربہ اور تدبیر میں کمال حاصل کر کے شہرت اور مرتبہ حاصل کیا، پھر اس نے تمہیں بوڑھا کر دیا تاکہ تم سفر آخرت کے لیے تیار ہو جاؤ اور قوت شہویہ اور غضبیہ کے ڈھل جانے کی وجہ سے تم سے راہ خدا میں سلوک کی رکاوٹیں دور ہو جائیں اور اس جہان کی ترقی حاصل کرو اور یہ سات حالتیں دنیوی زندگی کی ابتدا سے اس انتہا تک رونما ہوئیں۔

اور اگر تم اپنے اعضاء اور بدن میں ودیعت لکھی گئی مخفی حقیقتوں پر نظر کرو تو تمہارے عالم شہادت کے محسوس ارکان بھی سات رنگ رکھتے ہیں، کھال جو کہ زینت اور حفاظت کے لیے ہے، گوشت جو کہ قوت اور گرمی کے لیے ہے، اعصاب جو کہ حس و حرکت کے لیے ہیں۔

گردن کی رگیں جو کہ غذا پہنچانے کے لیے مقرر ہیں، حرکت کرنے والی رگیں جو کہ ارواح کے جاری ہونے کے لیے مقرر ہیں، ہڈیاں جو کہ بمنزلہ ستون ہیں اور ارواح جو کہ قوتوں کی حامل اور حیات کا مرکب ہیں اور ہر رنگ اپنے نچلے رنگ سے زیادہ اچھا اور نفیس ہے اور تمہارے جہانِ غیب کے مخفی ارکان سات قسم کے ہیں، پہلا رکن قویٰ، دوسرا نفس، تیسرا عقل، چوتھا سر، پانچواں روح، چھٹا خفی اور ساتواں اخفیٰ جو کہ غیب الغیب اور تمہاری ذات کا عین جمع ہے اور ہر رنگ اپنے نچلے رنگ سے اعلیٰ اور ارفع ہے، پس تمہیں کیا ہے کہ تم غیب کو شہادت پر، معقول کو محسوس پر اور مستقبل کو ماضی پر قیاس نہیں کرتے ہو اور آفاق کو نفس کے ساتھ مطابق نہیں دیتے ہو۔ (تفسیر عزیزی)

آسمانوں، سورج اور چاند کی تخلیق

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا {۱۵} وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا {۱۶} نوح

جواب ترجمہ: کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا فرمائے ہیں؟ اور ان میں چاند کو نور بنا کر اور سورج کو چراغ بنا کر پیدا کیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کو سات آسمانوں کی طرف متوجہ کیا اور اللہ نے ان کو بتایا کہ یہ سات ہیں اور ان آسمانوں میں شمس و قمر اس طرح ہیں کہ ایک نور ہے اور دوسرا چراغ ہے، لوگ آسمانوں کو بھی دیکھ رہے تھے اور شمس و قمر کو بھی دیکھ رہے تھے، آسمان اس فضا سے عبارت ہے جو نیلگوں ہے، یہ ہے کیا؟ اس کی حقیقت نہ وہ معلوم کر سکتے تھے اور نہ ان سے مطلوب تھا، نہ آج تک ان کی حقیقت

معلوم ہو سکی ہے، اس حد تک وضاحت اس بات کے لئے کافی ہے کہ انسان اس ہولناک کائنات پر غور و فکر کرے اور دیکھے کہ قدرت الٰہیہ نے کس قدر عجیب تخلیق کی ہے اور یہی مقصد تھا حضرت نوح علیہ السلام کا۔ (تفسیر ظلال القرآن)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ان کے لئے ایک اور دلیل ذکر کی یعنی کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ذات جو اس پر قادر ہے تو وہی اس امر کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ طباقاً کا معنیٰ ہے ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر آسمان دوسرے آسمان پر اس طرح ہے جس طرح قبہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو سات زمینوں کے اوپر پیدا کیا، ہر دو زمینوں اور دو آسمانوں کے درمیان مخلوق اور امر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان الم تر واخبار کے طریقہ پر ہے، آنکھوں سے مشاہدہ کے طریقہ پر نہیں جس طرح تو کہتا ہے الم ترنی کیف صنعت بفلان کیا تو نہیں جانتا میں نے فلاں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ طباقاً اسے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے، تقدیر کلام یہ ہو گی مطابقۃ طباقاً یا یہ حال ہے اور ذات طباق کے معنی میں ہے۔ ذات کے لفظ کو حذف کر دیا گیا اور طباق کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔ (قرطبی)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا**، اور ان سات آسمانوں کے درمیان چاند کو قابل اعتماد روشنی کا سبب بنایا ہے جو کہ دوسرے ستاروں کی روشنی سے زیادہ ہے، گویا دوسرے ستاروں کی روشنی اس کے سامنے روشنی ہی نہیں ہے تاکہ اس بات پر دلیل حاصل کریں کہ عالم ظلمانی میں نور کا فیض دینا بھی ممکن ہے۔ (تفسیر عزیزی)

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا: اور سورج کو ایک چمکتا چراغ بنایا ہے کہ چاند کا نور حقیقت میں اسی چراغ کا نور ہے جو کہ ایک صیقل آئینہ پر پڑ کر روشن ہوا تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ عالم نور میں ایک ایسی ذات درکار ہے جو کہ مبدء فیاض سے بلاواسطہ فائض ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے روشن ہونے کی صلاحیت

رکھنے والے روشن ہوتے ہیں اور اپنی ترقی کے حال کو انبیاء علیہم السلام کی ترقی کے حال کی نسبت سے قیاس کریں۔

نیز تمہیں پتہ چل جائے کہ ظلمت سے نور کے ساتھ روشنی اور ترقی، علم و عمل میں شریعت کی پیروی کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خلقت احوال میں ترقی حکمت و قدرت میں طبیعت کی پیروی کی وجہ سے ہے اور اگر تم عالم بالا کی ترقیات اور درجات کو نظر کی کوتاہی کی وجہ سے دریافت نہیں کر سکتے ہو تو ذرا عالم سفلی کی ترقیات میں نظر ڈالو۔ (تفسیر عزیزی)

بعث بعد الموت تک کے مراحل

سوال جنس بنی آدم کی تخلیق کے موت کے بعد اٹھائے جانے تک تین مراحل ان آیات کی روشنی میں کون کون سے ہیں؟

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا {۱۷} ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا {۱۸} نوح.

جواب ترجمہ: اور اللہ نے تمہیں زمین سے بہترین طریقے پر اگایا ہے۔ پھر وہ تمہیں دوبارہ اسی میں بھیج دے گا، اور (وہیں سے پھر) باہر نکال کھڑا کرے گا۔

ان آیات کی روشنی میں جنس بنی آدم کی تخلیق کے موت کے بعد اٹھائے جانے تک کے تین مراحل اس طرح ہیں کہ ① اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا تھا۔ ② پھر جب انسان اس دنیا میں وقت گزار کر انتقال کرتا ہے تو اسے قبر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ③ پھر اسے قبر سے اٹھایا جائے گا۔

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اور اللہ نے تمہیں زمین سے اگایا ہے اس لیے کہ تمہارے باپ کو جو کہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، زمین سے پیدا فرمایا پھر اس کی نسل میں نطفے کو پیدا کرنے کا تخم بنایا جو کہ نباتی اور حیوانی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے اور وہ نباتی اور حیوانی غذائیں بلاواسطہ یا بالواسطہ زمین سے اگتی ہیں، پس اگرچہ اس نے تمہیں بلاواسطہ زمین سے نہیں اگایا ہے تاکہ یوں کہا جا سکے کہ

اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ اَنۡۢبَاتًا لیکن تمہارے اگنے کا سلسلہ آخر زمین تک پہنچتا ہے، پس یوں کہا جاسکتا ہے کہ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ فَنَبَتُّمۡ نِبَاتًا پس تم زمین سے اگے اگنا کیونکہ تمہاری قریبی بنیاد جو کہ نطفہ ہے قریبی واسطے کے ساتھ زمین سے اگتا ہے اور تمہاری دور کی بنیاد جو کہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، بلاواسطہ زمین سے اگے ہیں اور زمین اجسام عالم میں سب سے نیچے ہے اور ان میں سب سے زیادہ ذلیل کہ ہر صاحب حرکت ورفتار کے سامنے پائمال ہے اور اس ذلت کے باوجود اس نے تمہارے وجود میں بہت بڑی رفعت پیدا کی ہے، دنیا میں بھی بادشاہت، سلطنت، عزت اور مرتبے کی بلندی تک پہنچتی ہے اور دین میں بھی نبوت، رسالت، امامت، خلافت، قطبیت، ارشاد اور ولایت کی بلندی تک پہنچتی ہے۔(عزیزی) پھر ایک وقت آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں موت کا ذائقہ چکھائے گا، پھر تمہیں قبر میں پہنچائے گا، پھر ایک وقت آئے گا جب تمہیں قبر سے اٹھایا جائے گا۔

فرشِ زمین بچھانے کا مقصد

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ کیجیے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسۡلُكُوۡا مِنۡهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ نوح

جواب ترجمہ: اور اللہ نے ہی تمہارے لیے زمین کو ایک فرش بنادیا ہے۔ تاکہ تم اس کے کھلے ہوئے راستوں پر چلو۔

نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ہر انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ قوم سمجھ جائے اور راہ ہدایت پر آجائے، یہاں حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے زمین کے اندر تمہارے لئے کیا کیا سہولیات پیدا کی ہیں، اس زمین کو تمہارے لئے مسخر کیا، سدھایا، اس میں تمہارے زندہ رہنے کے لئے تمام سہولیات رکھ دیں۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھادیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔

یہ حقیقت جو حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے پیش کی اور ان کے سامنے موجود تھی، حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں سے وہ تو بھاگتے تھے لیکن ان میں جو حقائق تھے، ان سے ان کے لئے فرار مشکل تھا، یہ زمین ان کے سامنے بچھی ہوئی تھی، یہ پہاڑ موجود تھے، یہ وادیاں موجود تھیں اور ان وادیوں کی راہوں پر ہی وہ چلتے تھے، پیدل بھی چلتے، سوار ہو کر بھی چلتے اور تیر کر بھی چلتے اور اس کے اندر اللہ کے جو فضل و کرم بکھرے ہوئے تھے ان سے وہ استفادہ کرتے تھے اور نہایت ہی آسانی سے وہ استفادہ کرتے تھے۔

یہ حقائق وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس سلسلے میں کسی گہری علمی تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اصول فطرت تھے اور ان کے مشاہدے اور تجربے میں تھے اور ان حقائق کے اندر وہ زندہ رہ رہے تھے، ہاں جوں جوں انسان نے علمی ترقی کی اس نے ان حقائق کے مزید پہلو معلوم کر لیے، جس کے بارے میں قرآن کی ہدایت بھی ہے کہ تم زمین میں پھرو اور نصیحت حاصل کرو۔ (فی ظلال القرآن) اب تو زمین نے اپنے بے شمار خزانے اگل دیے ہیں، شرق تا غرب، شمال تا جنوب میرے رب کی قدرت اور کاریگری کے نقوش دکھائی دیتے ہیں، جن میں کہیں عبرت کا سامان ہے اور کہیں آگے بڑھنے کی راہیں۔

عصر نوح میں پنجتن کی پوجا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ قوم نوح جن پانچ بتوں کی پوجا پاٹ کرتی تھی ان کا قصہ کیا ہے؟

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا {۲۱} وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا {۲۲} وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا {۲۳} وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا {۲۴} نوح

جواب ترجمہ: نوح نے کہا: اے میرے پروردگار! حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں

مانا، اور ان (سرداروں) کے پیچھے چل پڑے جن کو ان کے مال اور اولاد نے نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اور انہوں نے بڑی بھاری مکاری سے کام لیا ہے۔ اور (اپنے آدمیوں سے) کہا ہے کہ: اپنے معبودوں کو ہر گز مت چھوڑنا۔ نہ ود اور سواع کو کسی صورت میں چھوڑنا، اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو چھوڑنا۔ اس طرح انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کر دیا ہے، لہٰذا (یارب) آپ بھی ان کو گمراہی کے سوا کسی اور چیز میں ترقی نہ دیجیے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم میں جو سردار قسم کے لوگ تھے انہوں نے کمزوروں اور ضعیفوں کو بہت ہی فریب دیا، انہیں گمراہ کیا، یہ سردار کمزوروں سے کہتے تھے کہ وہ ایک اللہ کی خاطر اپنے معبودوں کی پوجا پاٹ بالکل ترک نہ کریں، نوح اکیلے اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے، اس کی بات نہیں ماننا۔

اسی طرح یہ بڑے سرداریوں کہتے تھے کہ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑیں، یہ پانچ وہ لوگ تھے جن کی لوگ اللہ کے علاوہ پوجا پاٹ کرتے تھے، ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ نیک لوگ تھے، جب یہ لوگ انتقال کر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ ان نیک لوگوں کی مورتیاں اور صورتیں بنائیں، تاکہ جب وہ ان کی صورتیں اور شکلیں دیکھیں تو اطاعت و فرمانبرداری کرنے پر ان میں نشاط پیدا ہو۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ قوم نوح کے بتوں کو کفار عرب نے لے لیا دومۃ الجندل میں قبیلہ کلب وَد کو پوجتے تھے، ہذیل قبیلہ سُواع کا پرستار تھا اور یغوث قبیلہ مراد کا بت تھا، پھر قبیلہ بنو غُطیف جو صرف کے رہنے والے تھے یہ شہر سباء بستی کے پاس ہے یغوث کی پوجا کرتا تھا، ہمدان قبیلہ یعوق کا پجاری تھا، آلِ ذی کلاع کا قبیلہ حمیر نسر بت کا ماننے والا تھا، یہ سب بت دراصل قوم نوح کے صالح بزرگ اولیاء اللہ لوگ تھے ان کے انتقال کے بعد شیطان نے اس زمانہ کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان بزرگوں کی عبادت گاہوں میں ان کی کوئی یادگار قائم کریں، چنانچہ انہوں نے وہاں نشان بنا دیئے اور ہر بزرگ کے نام پر انہیں مشہور کیا جب تک یہ لوگ زندہ رہے تب تک تو اس جگہ

کی پرستش نہ ہوئی لیکن ان نشانات اور یادگار قائم کرنے والے لوگوں کے مرجانے کے بعد اور علم کے اٹھ جانے کے بعد جو لوگ آئے جہالت کی وجہ سے انہوں نے باقاعدہ ان جگہوں کی اور ان ناموں کی پوجاپاٹ شروع کر دی۔ (بخاری، ابن کثیر)

حضرت محمد بن قیس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ كَانُوا قَوْمًا صَالِحِينَ بَيْنَ آدَمَ وَنُوحٍ، وَكَانَ لَهُمْ أَتْبَاعٌ يَقْتَدُونَ بِهِمْ، فَلَمَّا مَاتُوا قَالَ أَصْحَابُهُمُ الَّذِينَ كَانُوا يَقْتَدُونَ بِهِمْ: لَوْ صَوَّرْنَاهُمْ كَانَ أَشْوَقَ لَنَا إِلَى الْعِبَادَةِ إِذَا ذَكَرْنَاهُمْ. فَصَوَّرُوهُمْ، فَلَمَّا مَاتُوا وَجَاءَ آخَرُونَ دَبَّ إِلَيْهِمْ إِبْلِيسُ فَقَالَ: إِنَّمَا كَانُوا يَعْبُدُونَهُمْ وَبِهِمْ يُسْقَوْنَ الْمَطَرَ، فَعَبَدُوهُمْ، یہ بزرگ عابد، اللہ والے، اولیاء اللہ، حضرت آدم علیہ السلام، اور حضرت نوح علیہ السلام کے سچے تابع فرمان صالح لوگ تھے جن کی پیروی اور لوگ بھی کرتے تھے جب یہ مر گئے تو ان کے مقتدیوں نے کہا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں تو ہمیں عبادت میں خوب دلچسپی رہے گی اور ان بزرگوں کی صورتیں دیکھ کر شوق عبادت بڑھتا رہے گا چنانچہ ایسا ہی کیا جب یہ لوگ بھی مر کھپ گئے اور ان کی نسلیں آئیں تو شیطان نے انہیں یہ گھٹی پلائی کہ تمہارے بڑے ان کی پوجاپاٹ کرتے تھے اور انہیں سے بارش وغیرہ مانگتے تھے چنانچہ انہوں نے اب باقاعدہ ان بزرگوں کی تصویروں کی پرستش شروع کر دی۔ (تفسیر طبری ۲۹، ۶۲، تفسیر ابن کثیر)

حافظ ابن عساکر حضرت شیث علیہ السلام کے قصے میں بیان کرتے ہیں کہ وُلِدَ لِآدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، أَرْبَعُونَ وَلَدًا، عِشْرُونَ غُلَامًا وَعِشْرُونَ جَارِيَةً، فَكَانَ مِمَّنْ عَاشَ مِنْهُمْ: هَابِيلُ، وَقَابِيلُ، وَصَالِحٌ، وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ وَالَّذِي كَانَ سَمَّاهُ عَبْدَ الْحَارِثِ وَوَدٍّ، وَكَانَ وَدٌّ يُقَالُ لَهُ "شِيثَ" وَيُقَالُ لَهُ: "هِبَةُ اللّٰهِ" وَكَانَ إِخْوَتُهُ قَدْ سَوَّدُوهُ، وَوُلِدَ لَهُ سَوَاعٌ وَيَغُوثُ وَيَعُوقُ وَنَسْرٌ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کے چالیس بچے تھے بیس لڑکے بیس لڑکیاں ان میں سے جن کی بڑی عمریں ہوئیں ان میں ہابیل، قابیل، صالح اور عبد الرحمٰن

تھے جن کا پہلا نام عبد الحارث تھا اور وَد تھا جنہیں شیث اور ہبتہ اللہ بھی کہا جاتا ہے، تمام بھائیوں نے سرداری انہیں کو دے رکھی تھی، ان کی اولاد یہ چاروں تھے یعنی سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ (تاریخ دمشق ۱۶۵، ۸)

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اشْتَكَى آدَمُ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَعِنْدَهُ بَنُوهُ: وَدٌّ، وَيَغُوثُ، [وَيَعُوقُ] وَسُوَاعٌ، وَنَسْرٌ قَالَ وَكَانَ وَدٌّ أكبرهم وَأَبَرَّهُمْ بِهِ (ابن ابی حاتم، ابن کثیر) حضرت آدم علیہ السلام بیمار ہوئے تو ان کی بیماری کے وقت ان کی اولاد میں وَد، یغوث، یعوق، سواع اور نسر ان کے پاس تھے، وہ ان سب میں بڑا اور سب سے زیادہ اپنے والد کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ ابو جعفر رحمہ اللہ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگوں نے زید بن مہلب کا ذکر کیا آپ نے فارغ ہو کر فرمایا سنو! وہ اس زمین میں قتل کیا گیا جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی پرستش ہوئی، پھر انہوں نے وَدّ کا ذکر کیا، فرمایا کہ وَكَانَ وَدٌّ رَجُلًا مُسْلِمًا وَكَانَ مُحَبَّبًا فِي قَوْمِهِ، فَلَمَّا مَاتَ عَسْكَرُوا حَوْلَ قَبْرِهِ فِي أَرْضِ بَابِلَ وَجَزِعُوا عَلَيْهِ، فَلَمَّا رَأَى إِبْلِيسُ جَزَعهم عَلَيْهِ، تَشَبَّهَ فِي صُورَةِ إِنْسَانٍ، ثُمَّ قَالَ: إِنِّي أَرَى جَزَعَكُمْ عَلَى هَذَا الرَّجُلِ، فَهَلْ لَكُمْ أَنْ أُصَوِّرَ لَكُمْ مثله، فيكون فِي نَادِيكُم فَتَذْكُرُونَهُ؟ قَالُوا: نَعَمْ. فَصَوَّرَ لَهُمْ مَثَلَهُ، قَالَ: وَوَضَعُوهُ فِي نَادِيهِمْ وَجَعَلُوا يَذْكُرُونَهُ. فَلَمَّا رَأَى مَا بِهِمْ مِنْ ذِكْرِهِ قَالَ: هَلْ لَكُمْ أَنْ أَجْعَلَ فِي مَنْزِلِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْكُمْ تِمْثَالًا مِثْلَهُ، فَيَكُونَ لَهُ فِي بَيْتِهِ فَتَذْكُرُونَهُ؟ قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ: فَمَثَّلَ لِكُلِّ أَهْلِ بَيْتٍ تِمْثَالًا مِثْلَهُ، فَأَقْبَلُوا فَجَعَلُوا يَذْكُرُونَهُ بِهِ، قَالَ: وَأَدْرَكَ أَبْنَاؤُهُمْ فَجَعَلُوا يَرَوْنَ مَا يَصْنَعُونَ بِهِ، قَالَ وَتَنَاسَلُوا ودَرَس أَمْرُ ذِكْرِهِمْ إِيَّاهُ، حَتَّى اتَّخَذُوهُ إِلَهًا يَعْبُدُونَهُ مَنْ دُونِ اللهِ أَوْلَادُ أَوْلَادِهِمْ، فَكَانَ أَوَّلَ مَا عُبِدَ مِنْ غَيْرِ اللهِ: الصَّنَمُ الَّذِي سَمَّوْهُ وَدًّا. (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر)

وَدّ ایک مسلمان آدمی تھا، جس سے لوگ بہت محبت رکھتے تھے، جب وہ مر گیا، یہ لوگ مجاور بن کر اس کی قبر پر بیٹھ گئے اور رونا پیٹنا اور اسے یاد کرنا شروع کیا اور بڑے بے چین اور مصیبت زدہ ہوگئے ابلیس لعین نے یہ دیکھ کر انسانی صورت میں ان کے پاس آکر ان سے کہا کہ اس بزرگ کی یادگار کیوں قائم نہیں کر لیتے؟ جو ہر وقت تمہارے سامنے رہے اور تم اسے نہ بھولو سب نے اس رائے کو پسند کیا ابلیس نے اس بزرگ کی تصویر بنا کر ان کے پاس کھڑی کر دی جسے دیکھ دیکھ کر یہ لوگ اسے یاد کرتے تھے اور اس کی عبادت کے تذکرے کرتے رہتے تھے، جب وہ سب اس میں مشغول ہو گئے تو ابلیس نے کہا تم سب کو یہاں آنا پڑتا ہے اس لئے یہ بہتر ہو گا کہ میں اس کی بہت سی تصویریں بنا دوں تم انہیں اپنے اپنے گھروں میں ہی رکھ لو وہ اس پر بھی راضی ہو گئے اور یہ بھی ہو گیا، اب تک صرف یہ تصویریں اور یہ بت بطور یادگار کے ہی تھے مگر ان کی دوسری پشت میں جا کر براہ راست ان ہی کی عبادت ہونے لگی اصل واقعہ سب فراموش کر گئے اور اپنے باپ دادا کو بھی ان کی عبادت کرنے والا سمجھ کر خود بھی بت پرستی میں مشغول ہو گئے، ان کا نام وَدّ تھا اور یہی پہلا وہ بت ہے جس کی پوجا اللہ کے سوا کی گئی۔

{وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا} انہوں نے بہت مخلوق کو گمراہ کیا اس وقت سے لے کر اب تک عرب و عجم میں اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش شروع ہو گئی اور اللہ کی مخلوق بہک گئی، چنانچہ خلیل اللہ علیہ السلام اپنی دعا میں عرض کرتے ہیں {وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ} میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ یا الٰہی! انہوں نے اکثر مخلوق کو بے راہ کر دیا۔ (سورۃ ابراہیم ۳۶،۳۵)

{وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا} حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے لئے بد دعا کرتے ہیں کیونکہ ان کی سرکشی ضد اور عداوتِ حق خوب ملاحظہ فرما چکے تھے تو کہتے ہیں کہ الٰہی انہیں گمراہی میں اور بڑھا دے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعونیوں کے لئے بد دعا کی تھی کہ {رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى

أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ} (یُونُس: ۸۸)
اے ہمارے پروردگار! ان کے مال تباہ کر دے اور ان کے دل سخت کر دے انہیں ایمان لانا نصیب نہ ہو جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

چنانچہ دعاء نوح علیہ السلام قبول ہوتی ہے اور قوم نوح علیہ السلام بہ سبب اپنی تکذیب کے غرق کر دی جاتی ہے۔ اہل تفسیر نے کہا، حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک انہیں دعوت دیتے رہے جبکہ وہ کفر اور نافرمانی پر قائم رہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رَجَا نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْأَبْنَاءَ بَعْدَ الْآبَاءِ، فَيَأْتِي بِهِمُ الْوَلَدَ بَعْدَ الْوَلَدِ حَتَّى بَلَغُوا سَبْعَ قُرُونٍ، ثُمَّ دَعَا عَلَيْهِمْ بَعْدَ الْإِيَاسِ مِنْهُمْ، وَعَاشَ بَعْدَ الطُّوفَانِ سِتِّينَ عَامًا حَتَّى كَثُرَ النَّاسُ وَفَشَوْا. (تفسیر قرطبی) حضرت نوح علیہ السلام والدین کے بعد ان کی اولادوں سے امید رکھتے رہے، چنانچہ اولادوں کے بعد اولادیں پیدا ہوتی رہیں، یوں سات نسلوں تک معاملہ جا پہنچا، پھر ان سے مایوسی کے بعد ان کے خلاف بد دعا کر دی، پھر طوفان نوح کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور لوگ عام ہو گئے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا، كَانَ قَوْمُ نُوحٍ يَزْرَعُونَ فِي الشَّهْرِ مَرَّتَيْنِ، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم مہینہ میں دو دفعہ فصل کاشت کرتی تھی۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ قوم نوح علیہ السلام کے پانچ معبودان کا ذکر کیا گیا ہے، یہ تو انسان کے خارجی معبود ہیں، جن کی مشرک پرستش کرتے ہیں، مگر ہر شخص کے اندر بھی یہ پانچوں چیزیں پائی جاتی ہیں، جب تک آدمی ان کے پھندے سے آزاد نہ ہو، اس کی عبادت صحیح نہیں ہوتی ان اندرونی معبودان کی تفصیل شاہ صاحب رحمہ اللہ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وَد: جس طرح خارجی دنیا میں مشرکین نے ودّ کو محبت کا دیوتا بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اندرونی طور پر انسان کا اپنا جسم ودّ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ہر انسان اپنے جسم کے بناؤ سنگھار میں مصروف

نظر آتا ہے۔ حجاب طبع بھی یہی ہے کہ انسان اپنے جسم کی پرورش، زیب وزینت، تروتازگی میں لگا ہوا ہے۔ اور ساری عمر لگا رہتا ہے حتیٰ کہ مر جاتا ہے۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کا جسم اس کا ودّ ہے جس کی پرستش ساری عمر کرتا رہتا ہے۔

سواع: انسان کا نفس اندرونی طور پر اس کے لیے سواع ہے جس کی رضا انسان کو ہر حالت میں مطلوب ہوتی ہے۔ انسان تقویٰ و طہارت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کو اپنے نفس کے مقابلے میں ٹھکراتا رہتا ہے۔ اور اپنے نفس کی بات مانتا ہے۔ اس کی پوجا کرتا ہے۔ ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جن کو اس بات کا احساس ہو کہ نفس کو اس حد تک راضی رکھنا چاہیے۔ جس حد تک خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا پہلو نہ نکلے۔ شریعت کا ابطال نہ آئے اور اطاعت میں فرق نہ آئے۔ اگر خدا کی اطاعت اور اس کی رضا کو نفس پر قربان کر رہا ہے۔ تو یہی انسان کا سواع ہے جسکی وہ پرستش کر رہا ہے۔

یغوث: شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یغوث انسان کا خاندان ہے جس میں باپ، بیٹا، بھائی اور دیگر افراد شامل ہیں۔ انسان کو راضی رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ تاکہ یہ بھی بوقت ضرورت اس سے تعاون کریں۔ خاندان کے یغوث کو خوش کرنے کے لیے ہر قسم کی رسومات ادا کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اگر برادری بگڑ گئی تو میرا تمام معاملہ خراب ہو جائے گا۔ لہذا ان کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور شریعت کے قانون کو بھی ترک کر دیتا ہے لہذا یہ خاندان ہی اس کا یغوث ہے۔ ساری عمر اسی کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے۔

یعوق: انسان کا مال اس کے لیے بمنزلہ یعوق کے ہے۔ انسان مال کی محبت میں کم و بیش بڑا شدید ہے۔ مال کے متعلق انسان سمجھتا ہے کہ یہ اس کی تکلیف کو دور کرے گا یہ اس کے لیے یعوق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ یعنی سمجھتا ہے کہ مال اس کو قائم رکھے گا۔ اس لیے انسان مال جمع کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، یہ مال کی محبت کا نتیجہ ہے کہ اس کے فرائض بھی ادا نہیں کرتا، نہ زکوٰۃ ادا

کرتا ہے، نہ صدقہ خیرات کرتا ہے، بلکہ اسے سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے، کہ مشکل وقت میں کام آئے گا، لہذا یہ انسان کے لیے یعوق ہے۔

نسر: شیطان انسان کے لیے نسر ہے، جو اسے ہر وقت بہکاتا رہتا ہے۔ یہ حرص اور غصے کے بازوؤں کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہوتا ہے اور ایسے ایسے وسوسے ڈالتا ہے جس سے انسان کا عقیدہ خراب ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے شرک کرنے والوں کا حال بیان ہوا۔ شیطان کے بہکاوے میں آنا گویا نسر کی پرستش کرنا ہے۔ الغرض یہ اندرونی پانچ معبود ان باطلہ ہیں جن سے ہر آدمی کو واسطہ پڑتا ہے۔ اور جو اس کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ (تفسیر عزیزی، معالم العرفان)

قوم نوح کو سزا کیوں دی گئی؟

سوال قرآن کریم کیا بتاتا ہے کہ قوم نوح کو عذاب کیوں دیا گیا؟ اس آیت کی روشنی میں بتایئے۔

مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا {۲۵} نوح

جواب ترجمہ: ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ ہی سے انہیں غرق کیا گیا، پھر آگ میں داخل کیا گیا، اور انہیں اللہ کو چھوڑ کر کوئی حمایتی میسر نہیں آئے۔

قرآن کریم صاف اور واضح طور پر ہمیں بتاتا ہے کہ قوم نوح کو سخت ترین سزا دی گئی، اس کی وجہ ان کے گناہ تھے، ان کی خطائیں تھیں، ان کی پشت در پشت نافرمانیاں تھیں، بلکہ نافرمانیوں کی انتہاء ہو چکی تھی، مفسرین رحمہم اللہ نے اس سے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ پانی کی سزا تو انہیں دنیا میں ملی۔ مگر آگ کی سزا برزخ میں مل رہی ہے۔ اور یہ سزا بھی برحق ہے۔ اگرچہ یہ مکمل سزا نہیں ہے کیونکہ مکمل سزا تو قیامت کو ملے گی تاہم برزخ میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے۔ آل فرعون کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں کہ انہیں صبح شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ مرنے والا چاہے کسی شکل میں مرے، قبر اور برزخ کا عذاب اس سے ٹل نہیں سکتا۔ اس کے جسم اور روح کا کوئی نہ کوئی حصہ ایسا

ضرور ہوتا ہے۔ جسے تکلیف یا راحت محسوس ہوتی ہے۔ ہاں البتہ عالم برزخ میں وقت کا احساس نہیں ہوتا، جب حشر میں اٹھیں گے تو کہیں گے۔ ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال لیا۔ الغرض قوم کے لوگ ادھر پانی میں ڈبوئے گئے۔ ادھر آگ میں داخل کئے گئے۔

مگر انہوں نے اللہ کے سوا کسی کو مدد گار نہ پایا۔ نہ ود صاحب آئے نہ سواع نے مدد کی نہ یغوث نے فریاد رسی کی نہ یعوق کسی کام آیا اور نہ نسر سے کچھ بن پڑا۔ خدا کے سوا کوئی بھی مافوق الاسباب مدد گار نہ آیا۔ آج بھی صورت تحال یہی ہے کہ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ لوگ خواہ مخواہ وہم میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور شرک میں ڈوبے رہتے ہیں۔ طرح طرح سے اپنا عقیدہ گندہ کرتے ہیں۔ (معالم العرفان للسواتی رحمہ اللہ)

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اپنے بے شمار گناہوں کی وجہ سے، مِن تعلیل کے لیے ہے اور ما کثرت کے معنیٰ کا فائدہ دینے کے لیے زیادہ کر دیا گیا جیسا کہ کثیر ما اور اس جیسے الفاظ میں زیادہ کیا جاتا ہے اور وہ بے شمار گناہ ان کا کفر تھا، جس نے اپنے وقت کے رسول علیہ السلام کو ہزار سال کی مدت تک مختلف قسم کی تکالیف دینے کے ساتھ مخلوط ہو کر قویٰ کی کثافت مہیا کی اور اس کی وجہ سے وہ آسمان سے بارش کے پانی اور زمین سے پھوٹنے والے پانی میں غرق کر دیے گئے اور یہ غرق کرنا صرف روئے زمین سے ان کا شر دور کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ برزخ کا عذاب چکھانے کے لیے تھا، اس لیے کہ فَاُدخِلوا پس وہ غرق ہونے کے بعد کسی فاصلے کے بغیر ایک آگ میں داخل کر دیے گئے، دوزخ کی وعدہ شدہ آگ نہیں کہ اس میں داخل ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔ (تفسیر عزیزی)

دعائے نوح علیہ السلام اور قوم کی ہلاکت

سوال حضرت سیدنا نوح علیہ السلام کی کافروں کے خلاف اور اہل ایمان کے حق میں دعا کیا تھی؟

جواب حضرت نوح علیہ السلام ایک طویل عرصہ تک اپنے لوگوں میں دین کا کام کرتے اور انہیں راہ ہدایت پر لانے کے جتن کرتے رہے، مگر کئی صدیاں گزر گئیں، بلکہ کئی پشتیں ایسی گزر گئیں جنہوں نے راہ حق پر چلنا قبول نہیں کیا، لوگ بتوں کی پوجا کرنے پر کمربستہ ہوگئے تو پیغمبر نوح علیہ السلام نے اپنے طور پر یہ خیال کرلیا کہ اب یہ لوگ کسی صورت حق قبول نہیں کریں گے، چنانچہ انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں ان کافروں کے خلاف سخت بددعا کردی، کہ اللہ! ان کافروں میں سے کوئی بھی روئے زمین پر زندہ نہ چھوڑیے، اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ رہے گا، زمین پر گھومے پھرے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرے گا، اور ان کی پشتوں اور رحموں سے جو بھی آئے گا وہ حق کو چھوڑ کر کفر کی طرف مائل ہوگا، تیرا نافرمان ہی ہوگا۔

پھر نوح علیہ السلام نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور اپنے گھر میں داخل ہونے والے اہل ایمان کے لیے اور باقی مومنین ومومنات کے لیے دعائے خیر فرمائی، اور کافروں کے لیے دنیا وآخرت میں ہلاکت وتباہی کی بددعا فرمائی۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّاراً {٢٦} إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِراً كَفَّاراً {٢٧} رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَاراً {٢٨} نوح.

اور نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بھی رہنے والا مت چھوڑیئے۔ اگر آپ ان کو باقی رکھیں گے تو یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ بدکار اور کافر ہی پیدا ہوگی۔ میرے پروردگار! میری بھی بخشش فرمادیجیے، میرے والدین کی بھی، ہر اس شخص کی بھی جو میرے گھر میں ایمان کی حالت میں داخل ہوا ہے، اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کی بھی اور جو لوگ ظالم ہیں ان کو تباہی کے سوا کوئی اور چیز عطا نہ فرمایئے۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے قلب مبارک پر یہ الہام آگیا تھا کہ اس ناپاک زمین کو غسل دینا مقصود ہے اور ظالموں اور سرکشوں نے اس کو شر وفساد سے بھر دیا ہے، یہ شر اس قدر غالب ہو گیا ہے اور اس قدر جم گیا ہے کہ اس نے دعوت دین کو جامد کر کے رکھ دیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ اب ناقابل اصلاح ہو گئے ہیں اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی وقت اہل زمین ناقابل اصلاح ہو جائیں تو ان پر عام تباہی آتی ہے اور اس طرح اللہ زمین کی تطہیر فرما دیتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام پہنچ چکے تھے، اس لئے انہوں نے دعا فرمائی کہ اے اللہ، ان لوگوں کو ختم کر دے، ظالموں کو بیخ وبن سے اکھاڑ دے، کوئی زندہ وجود باقی نہ رہے، اور انہوں نے دلیل بھی دے دی۔ (ظلال القرآن)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس مقام پر چار مسائل بیان فرمائے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے کب بد دعا کی؟ مسئلہ نمبر ① حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے بارے میں اس وقت بد دعا کی جب آپ علیہ السلام مایوس ہو گئے کہ وہ لوگ آپ علیہ السلام کی اتباع کریں گے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے بعد بد دعا کی جب اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ (هود: ٣٦) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور ان کی امت کو غرق کر دیا، یہ بھی اسی طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيعَ الْحِسَابِ وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ اے اللہ! اے کتاب کو نازل کرنے والے، اے جلد حساب لینے والے اور لشکروں کو شکست دینے والے! انہیں شکست دے دے اور ان میں زلزلہ برپا کر دے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کی بد دعا کا سبب یہ بنا کہ آپ کی قوم کا ایک آدمی اپنے چھوٹے بچے کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا وہ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس سے گزرا اور اپنے بچے سے کہا)احْذَرْ

هٰذَا فَإِنَّهُ يُضِلُّكَ). فَقَالَ: يَا أَبَتِ أَنْزِلْنِي، فَأَنْزَلَهُ فَرَمَاهُ فَشَجَّهُ، فَحِينَئِذٍ غَضِبَ وَدَعَا عَلَيْهِمْ اس سے بچ کر رہنا یہ تجھے گمراہ کر دے گا، اس بچے نے کہا، اے میرے ابا! مجھے نیچے اتارنا، اس کے باپ نے اسے نیچے اتارا۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو پتھر مارا اور آپ کو زخمی کر دیا، اس وقت حضرت نوح علیہ السلام غضب ناک ہوئے اور لوگوں کے خلاف بد دعا کی۔

محمد بن کعب رحمہ اللہ، مقاتل رحمہ اللہ، ربیع رحمہ اللہ، عطیہ رحمہ اللہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، إِنَّمَا قَالَ هٰذَا حِينَمَا أَخْرَجَ اللهُ كُلَّ مُؤْمِنٍ مِنْ أَصْلَابِهِمْ وَأَرْحَامِ نِسَائِهِمْ. وَأَعْقَمَ أَرْحَامَ النِّسَاءِ وَأَصْلَابَ الرِّجَالِ قَبْلَ الْعَذَابِ بِسَبْعِينَ سَنَةً، اس وقت بد دعا کی جب اللہ تعالیٰ نے ہر مومن کو ان کی پشتوں اور ان کی عورتوں کے رحموں سے نکال لیا تھا اور عذاب سے ستر سال پہلے ان کی عورتوں کی رحموں اور مردوں کی پشتوں کو بانجھ کر دیا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا، چالیس سال پہلے بانجھ کر دیا تھا، قتادہ نے کہا عذاب کے وقت ان میں کوئی بچہ نہیں تھا، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا لَوْ أَهْلَكَ اللهُ أَطْفَالَهُمْ مَعَهُمْ كَانَ عَذَابًا مِنَ اللهِ لَهُمْ وَعَدْلًا فِيهِمْ، وَلٰكِنَّ اللهَ أَهْلَكَ أَطْفَالَهُمْ وَذُرِّيَّتَهُمْ بِغَيْرِ عَذَابٍ، ثُمَّ أَهْلَكَهُمْ بِالْعَذَابِ، بِدَلِيلِ قَوْلُهُ تَعَالَى: وَقَوْمَ نُوحٍ لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ [الفرقان: ۳۷] اگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی ہلاک کر دیتا تو یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب ہوتا اور ان میں عدل ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے بچوں اور ان کی اولادوں کو عذاب کے بغیر ہلاک کر دیا، پھر عذاب کے ساتھ ان کو ہلاک کر دیا اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب قوم نوح نے نبیوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرقاب کر دیا۔ (تفسیر قرطبی)

کن لوگوں کے خلاف دعا جائز ہے: مسئلہ نمبر ② ۔ ابن عربی نے کہا، دَعَا نُوحٌ عَلَى الْكَافِرِينَ أَجْمَعِينَ، وَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَنْ تَحَزَّبَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

وَأَلَّبَ عَلَيْهِمْ حضرت نوح علیہ السلام نے کافروں کے خلاف بد دعا کی اور نبی کریم ﷺ نے ان کے خلاف بد دعا کی جنہوں نے مومنوں کے خلاف اکٹھ کیا تھا۔

فی الجملہ یہ بھی کافروں کے خلاف ہی بد دعا تھی جہاں تک معین کافر کا تعلق ہے تو اس کا خاتمہ معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اس کے خلاف بد دعا نہیں کی جاتی کیونکہ اس کا انجام ہمارے نزدیک مجہول ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کا خاتمہ سعادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عتبہ، شیبہ اور ان دونوں کے ساتھیوں کے بارے میں بد دعا کی کیونکہ ان کے انجام کا آپ کو علم تھا اور ان کے حال کے بارے میں پردے کو ہٹا دیا گیا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا بد دعا کی وجہ بیان کرنا۔ مسئلہ نمبر ③ ابن عربی نے کہا، اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے خلاف بد دعا کو آخرت میں مخلوق کی شفاعت سے توقف کا سبب کیوں بنایا ہے؟ ہم عرض کریں گے، اہل علم نے اس بارے میں دو وجوہات ذکر کی ہیں ① وہ بد دعا غضب اور سختی کی وجہ سے پیدا ہوئی جب کہ شفاعت تو رضا اور نرمی کی وجہ سے ہوتی ہے تو آپ کو خوف ہوا کہ کہیں اس پر عتاب نہ ہو اور یہ نہ کہا جائے تو نے کل (دنیا میں) کفار کے خلاف بد دعا کی اور آج ان کے حق میں شفاعت کرتے ہو۔ ② انہوں نے نص اور واضح اجازت کے بغیر ناراضگی کے عالم میں بد دعا کی تھی تو قیامت کے روز اس وبال کا خوف محسوس ہوا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا إِنِّي قَتَلْتُ نَفْسًا لَمْ أُومَرْ بِقَتْلِهَا، میں نے ایک ایسے نفس کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ کہا، میں بھی یہی قول کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں: اگرچہ بد دعا کرنے کا صریح حکم نہیں تھا تاہم آپ کو یہ کہا گیا تھا: أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ (ھود: ۳۶) اس نے آپ کو ان کے انجام سے آگاہ کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف ہلاکت کی بد دعا کی جس طرح ہمارے نبی ﷺ نے شیبہ، عتبہ اور ان جیسے لوگوں کے خلاف بد دعا کی اور یہ الفاظ کہے: اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِهِمْ. جب ان

کے انجام کا علم ہو گیا۔ اس تعبیر کی بنا پر اس میں بد دعا کرنے کے امر کا معنی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر ④ (دَيَّاراً. إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِراً كَفَّاراً)

سری کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ کافر ہے وہ کافر ہے جو گھروں میں رہتا ہے، دیاراً اصل میں یہ دَیوَار تھا، یہ فَیعَال کا وزن ہے، یہ دَارَ، یَدُورُ سے مشتق ہے، واؤ کو یاء سے بدل دیا اور ان میں سے ایک یاء کو دوسری یاء میں ادغام کر دیا جس طرح قیام، اصل میں قِیَوام تھا۔ اگر یہ فعال کا وزن ہوتا تو یہ دوار ہوتا۔ قتبی نے کہا: اصل میں یہ دار ہے یعنی گھر میں فروکش ہونے والا یہ جملہ بولا جاتا ہے: مابالدار دیار یعنی گھر میں کوئی بھی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الدیار سے مراد گھر والا ہے۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر طوفانِ نوح میں خداوند تعالیٰ کسی پر رحم کرتا تو اس کے لائق وہ عورت تھی جو پانی کو ابلتے اور برستے دیکھ کر اپنے بچے کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔ جب پانی وہاں پر بھی جا چڑھا تو بچہ کو اٹھا کر اپنے مونڈھے پر بٹھا لیا جب پانی سر تک جا چڑھا تو اپنے بچے کو ہاتھوں میں لے کر سر سے بلند اٹھا لیا لیکن آخر پانی وہاں تک پہنچ گیا اور ماں بیٹا ڈوب گئے۔ (ابن ابی حاتم بحوالہ گلدستہ تفاسیر)

قوم نوح نے جب پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ بچہ تکذیب نہیں کر سکتا (اور اگر بچہ کسی کی تکذیب کرے بھی تو نا قابل عذاب ہے) اسی سے استدلال کیا جاتا ہے کہ طوفان ساری زمین پر نہیں آیا تھا۔ بلکہ صرف قوم نوح کی زمین پر آیا تھا۔ کیونکہ مختلف ممالک کے رہنے والوں کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ اور نزول عذاب بغیر تکذیب کے ممکن نہیں۔ (گلدستہ تفاسیر)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ قوم نوح کی غرقابی کے احوال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اور جب قوم کا غرق شروع ہوا اور بارش کے پانی نے کثرت کے ساتھ ہجوم کیا اور زمین

کے پانی نے جوش مارا اور حضرت نوح رحمۃ اللہ کشتی میں سوار ہوگئے اور آپ نے دیکھا کہ کافروں نے بھاگ کر بلند مکانات میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لے لی ہے اور ان میں سے بعض نے طوفان آنے سے پہلے حضرت نوح رحمۃ اللہ کی زبان سے اس واقعہ کے رونما ہونے کا سن کر اور جان کر احتیاط کے طور پر پہاڑوں پر شیشے کے محلات بنا لیے اور چند ماہ کے لیے کھانے پینے کا سامان جمع کر چھوڑا تھا، ان شیشے کے محلات میں داخل ہو کر فارغ البال بیٹھے تھے تو آپ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض کفار اس عذاب سے چھٹکارا پالیں اور جہان میں کفر کا بیج پھر باقی رہ جائے، آپ نے بارگاہ خداوندی میں ایک اور دعا مانگی "اے میرے رب! جب تو نے میری دعا قبول فرمائی اور میری قوم کے سرداروں اور ان کے مکاروں کو جو کہ عوام کو فریب دے کر شبہات میں ڈالتے تھے، طوفان کے عذاب میں گرفتار فرمایا، اب تیری جناب میں میری ایک اور گزارش ہے کہ روئے زمین پر نہ چھوڑ خواہ میرے ملک میں ہو یا کسی دوسرے ملک میں کافروں کی جنس سے خواہ مکر و شبہات ڈالنے والے ہوں، خواہ ان کے پیروکار، خواہ میرے ساتھ ملنے والی قوم سے ہوں خواہ اجنبی اور غیر قوم۔ (تفسیر عزیزی)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے یہ قید اس لیے ذکر فرمائی اور یوں نہ کہا کہ کسی سانس لینے والے کو نہ چھوڑ اس لیے کہ آپ کو ابلیس اور اس کی اولاد کا قیامت تک باقی رہنا معلوم تھا اگر روئے زمین کے ہر کافر کی ہلاکت کی درخواست کرتے تو مبرم تقدیر الٰہی کے خلاف واقع ہوتی اور انبیاء علیہم السلام تقدیر الٰہی کے خلاف دعا نہیں کرتے، اسی لیے لفظ دیار اًلائے تاکہ ابلیس اور اس کی اولاد اس میں داخل نہ ہوں، اس لیے کہ ابلیس اور شیاطین زمین میں سکونت اور خانہ داری نہیں کرتے اور اکثر اوقات سطح زمین پر چکر بھی نہیں لگاتے بلکہ ہوا میں اڑتے ہیں۔

اور جب بعض اوقات زمین میں کفار کی بقاء حکمت الٰہی کے تقاضے کے مطابق ہوتی ہے کہ ان کفار سے کسی وقت مخلوق کی ہدایت مقدر ہوتی ہے، گو بالفعل کفر اور گمراہی میں گرفتار ہوتے ہیں، ان

کفار کی طرح جو کہ حضور ﷺ کے زمانے میں کفر میں شدید تھے اور آخر میں اسلام کے ساتھ مشرف ہوگئے اور انہوں نے ہزاروں کو جہاد اور لڑائی کے ساتھ اسلام میں داخل کیا یا ان کفار سے نیک نسل پیدا ہوتی ہے اور وہ خدا کی معرفت اور عبادت کے کام میں قائم رہتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس غرض کی علت کے مقام میں ان دونوں فائدوں کی نفی بیان فرمائی کہ اگر تو ان کو چھوڑ دے تو تیرے تمام بندوں کو تیری عبادت کی راہ سے ضرور گمراہ کریں گے اور اس راہ پر چلنے سے نفرت دلائیں گے تو معرفت اور عبادت کے لیے ان کی ایجاد کی حکمت دگرگوں ہو جائے گی۔ اور وہ بدکار ناشکر کے سوا کچھ نہیں جنیں گے، پس ان سے نیک نسل کی توقع بھی نہیں ہے اور وہ ہر صورت میں برباد کرنے کے قابل ہیں۔ (تفسیر عزیزی)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کفار کے لیے قیامت کے عام اور کلی مواخذے کے نمونے کا عام اور کلی مواخذہ طلب کیا تو ڈر گئے کہ کہیں غضب الٰہی کا جوش اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ ترک اَولیٰ پر جو مجھ سے صادر ہوتا ہے اور عام گناہوں پر جو کہ میری امت کے ایمان والوں سے صادر ہوتے ہیں بھی مواخذہ واقع ہو جائے اس خطرے کو دور کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں ایک اور دعا پیش کی اے میرے پروردگار! مجھے معاف فرما اور جو میرے حق میں ترک اولیٰ یا خطا اجتہادی سے فروگزاشت کا حکم رکھتا ہے، اور میرے والدین کو بخش دے کہ اگرچہ وہ دونوں وفات پاگئے تھے لیکن والدین کے بعد بھی دعائے مغفرت اور حسب طاقت صدقات کے ساتھ نیکی کرنا واجب ہے اور آپ کے والد لامک بن متوشلخ تھے اور آپ کی والدہ شمحا دختر انوش اور یہ انوش اس انوش کے علاوہ ہیں جو کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں۔ (تفسیر عزیزی)

عطا نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے آباء واجداد میں حضرت آدم علیہ السلام تک کوئی کافر نہ تھا، سب مسلمان تھے اور توحید کے عقیدے پر تھے اور آپ کی والدہ محترمہ بھی مسلمان تھیں۔ (عزیزی)

وَلِمَن دَخَلَ بَيۡتِيَ مُؤۡمِنٗا: اور ہر اس شخص کو بخش دے جو کہ میری کشتی میں جو کہ میرا جاری گھر ہے داخل ہو مگر صاحب ایمان ہو، اس لیے کہ آپ کی کشتی میں ابلیس بھی تھا اور وہ بخشش کا مستحق نہ تھا اور ایمان والوں کی بخشش کی اس وجہ سے درخواست کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کسی ایک کی نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے کشتی غرق ہو جائے اور بے گناہ ہلاک ہو جائیں اس لیے کہ عام دنیوی عذابوں میں امتیاز اور تفریق نہیں ہے اسی لیے قوموں کے عذاب میں ان کے بچے اور پاگل بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور جانور بھی تکلیف اٹھاتے ہیں۔

وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ: اور قیامت تک کے تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بخش دے تاکہ ان کے مستقبل کے گناہ اپنے آباء کی کشتی کے غرق ہونے میں اثر نہ کریں۔

وَلَا تَزِدِ ٱلظَّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارٗا: اور ظالموں کے لیے جو کہ شرک و کفر کر کے غرق ہو گئے ہیں اور آگ میں جلائے جاتے ہیں، زیادہ نہ کر مگر تکلیف، دکھ اور عذاب اس لیے کہ اگر انہیں ان کے عذاب میں لمحہ بہ لمحہ زیادتی نہ ہو تو عذاب کی تو انہیں عادت اور الفت ہو جائے اور انہیں اتنا عذاب عذاب ہی معلوم نہ ہو اور یہ بھی مغفرت کے معنوں میں ہے تو انہیں ایمان والوں کے ساتھ ایک قسم کی مغفرت میں شرکت لازم آئے۔

علماء نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا میں قیامت تک کے اہل ایمان کے لیے ایک عظیم بشارت ہے اس لیے کہ کافروں کی ہلاکت کے بارے میں آپ کی دعا یقیناً قبول ہوئی، پس ایمان والوں کی مغفرت کے لیے آپ کی دعا ضرور قبول ہوئی ہو گی اور وہ بخشے گئے۔ (تفسیر عزیزی)

الحمد للہ ثم الحمد للہ، آج سورۃ نوح کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی،

خادم اسلام: محمود الرشید حدوٹی (جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور)

۸ مئی ۲۰۱۹ء، مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ ۷ بجے علی الصبح

حروف بینی: ۳۱ جولائی ۲۰۱۹ء حال وارد حدوٹ مری

الجن

جب جنات نے قرآن سنا

سوال جب جنات نے نبی کریم ﷺ کی تلاوتِ قرآن سنی تو انہوں نے اپنی قوم سے جا کر کیا کہا تھا؟ سورۃ الجن کی ان ابتدائی آیات کی روشنی میں وضاحت فرمائیے، نیز ترجمہ و تفسیر بھی کیجیے۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا {۱} یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا {۲} وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا {۳} وَّاَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَی اللّٰهِ شَطَطًا {۴} وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا {۵} الجن.

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ میرے پاس یہ وحی آئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے میری طرف بات سننے کے لیے دھیان دیا پھر انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔ جو ہدایت کا راستہ بتاتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے رب کے ساتھ ہر گز کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ اور بہت بلند ہے ہمارے رب کی عزت، نہیں بنایا اس نے کسی کو بیوی اور نہ اولاد۔ اور یہ کہ: ہم میں سے بیوقوف لوگ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے تھے جو حقیقت سے بہت دور ہیں۔ اور ہم یہ خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ کی ذات کے بارے میں جھوٹ بات نہ کہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ جب جنوں کی ایک جماعت نے میری تلاوت سنی تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت میں بدیع ہے، اس قرآن کریم کے احکامات اور اس کی خبریں حق و ہدایت کی طرف بلاتی ہیں، ہم اس قرآن کریم پر ایمان لائے اور اس پر عمل کیا، ہم اپنے اس رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہمارے پروردگار

کی عظمت اور جلالت بہت بلند ہے، اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ ہی اس کی اولاد ہے، ہمیں شیطان بے وقوف اللہ کے بارے میں جو بتاتا ہے کہ اس کی بیوی اور اولاد ہے وہ تو حق، صواب اور درستی سے دور ہے۔

مفسر قرآن مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں ”جن پرانی مخلوق ہے جو حضرت آدم اور بنی آدم کی تخلیق سے پہلے سے دنیا میں موجود ہے ان لوگوں میں بھی مومن اور کافر نیک اور بدسب قسم کے افراد ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی ایمان کے مکلف تھے اور ہیں جس طرح بنی آدم میں انسانوں میں کافر اور مشرک ہیں اس طرح جنات میں بھی مشرک اور کافر رہے ہیں اور ان میں مومن بھی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ:

حضور خاتم الانبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین نے ایک دھندہ بنا رکھا تھا۔ انسانوں میں کچھ لوگ کاہن بنے ہوئے تھے یہ لوگ آنے والے واقعات کی خبریں بتایا کرتے تھے اور یہ خبریں شیاطین ان کے پاس لاتے تھے، شیاطین کا یہ طریقہ تھا کہ آسمان کے قریب تک جاتے تھے اور وہاں جو زمین میں پیش آنے والے حوادث کا فرشتوں میں ذکر ہوتا تھا اسے سن لیتے تھے پھر کاہنوں کے کان میں آکر کہہ دیتے تھے۔ کاہن اس بات کو لوگوں میں پھیلا دیتے تھے یہ بات چونکہ اوپر سے سنی ہوئی ہوتی تھی اس لیے صحیح نکل جاتی تھی، سننے والے ان کاہنوں کے معتقد ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو اس کو آنے والے واقعات کا علم نہ ہوتا تو پہلے کیسے بتا دیتا؟ اس طرح سے شیاطین اور کاہنوں نے مل کر انسانوں کو بہکانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو شیاطین کو اوپر پہنچنے سے روک دیا گیا اس کے بعد سے ان میں سے کوئی فرد خبریں سننے کے لیے اوپر پہنچتا تو اس پر انگارے پھینکے جانے لگے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ صورت حال پیش آئی تو شیاطین آپس میں کہنے لگے کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان آڑ لگا دی گئی ہے اور ہم پر انگارے پھینکے جانے لگے ہیں لہٰذا زمین کے

مشارق اور مغارب میں سفر کرو اور دیکھو کہ وہ کیا نئی چیز پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آسمانی خبریں سننے سے روک دیا گیا ہے۔

چنانچہ انہوں نے زمین کے مشارق اور مغارب کا سفر کیا اور اصل صورت حال کا سراغ لگاتے ہوئے گھومتے پھرے۔ ان میں ایک جماعت تہامہ کی طرف آئی (یہ عرب کا وہ علاقہ ہے جس میں حجاز واقع ہے) اس جماعت نے دیکھا کہ مقام نخلہ میں آنحضرت سرور عالم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نماز فجر پڑھا رہے ہیں جب ان کے کانوں میں قرآن کی آواز پہنچی تو خوب دھیان کے ساتھ سننے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہو نہ ہو یہی چیز ہے جو تمہارے خبریں سننے کے درمیان حائل ہو گئی ہے اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف واپس ہو گئے۔ اور ان سے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا، اس پر اللہ تعالیٰ نے قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ نازل فرمائی۔ (بخاری ۲، ۷۳۲)

شیاطین جس آزادی سے آسمان تک جاتے تھے اور وہاں فرشتوں کا جو مذاکرہ دنیاوی امور سے متعلق ہوتا تھا اسے سن کر نیچے آجاتے اور کاہنوں کے کان میں ڈال دیتے تھے یہ سلسلہ تو آنحضرت ﷺ کی بعثت پر ختم ہو گیا۔ لیکن شیاطین نے ایک اور دھندہ نکالا اور وہ یہ کہ نیچے سے لے کر بادلوں تک پر الگا لیتے ہیں، وہاں فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے کان لگا کر پہنچتے ہیں تو ان پر انگارہ پھینک دیا جاتا ہے اس انگارہ کے لگنے سے پہلے کوئی بات سن کر اوپر والے نے اپنے نیچے والے کے کان میں ڈال دی اور ہوتے ہوتے وہ بات کاہن تک پہنچ گئی تو وہ اپنے پاس سے اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں میں خبریں پھیلا دیتا تھا۔ ان خبروں میں کوئی بات سچی نکل آتی ہے تو وہ وہی ہوتی ہے۔ احادیث شریف میں تفصیل وارد ہوئی ہے اور سورۂ الصافات کی آیت اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ میں اسی کو بیان فرمایا ہے کہ شیاطین اوپر سے بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو شہاب ثاقب یعنی روشن انگارہ سے مارے جاتے ہیں۔

سیّدہ عائشہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ کاہن جو بطور پیشین گوئی کچھ بتادیتے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں ہیں، عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کاہن جو بات بیان کرتا ہے ٹھیک نکل جاتی ہے، آپ نے فرمایا وہ ایک صحیح بات وہ ہوتی ہے جسے اچک لیتا ہے اور اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے جیسے مرغی کڑکڑ کرتی ہے پھر وہ اس میں سو سے زیادہ جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ (مشکوٰۃ، بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی سنا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں وہ آپس میں ان فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو عالم بالا میں ہوچکے ہوتے ہیں شیاطین کان لگا کر چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور جو بات سنتے ہیں اسے کاہنوں کے کانوں میں جا کر ڈال دیتے ہیں اور کاہن اس میں اپنے پاس سے سو جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، البخاری، تفسیر انوار البیان)

جنات کیسے سر چڑھے؟

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا {٦} الجن.

جواب ترجمہ: اور یہ کہ: انسانوں میں سے کچھ لوگ جنات کے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، اس طرح ان لوگوں نے جنات کو اور سر چڑھا دیا تھا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”عرب میں یہ جہالت بہت پھیلی ہوئی تھی، جنوں سے غیب کی خبریں پوچھتے، ان کے نام کی نذر و نیاز کرتے چڑھاوے چڑھاتے اور جب کسی قافلہ کا گزر یا پڑاؤ کسی خوفناک وادی میں ہوتا تو کہتے کہ اس حلقہ کے جنوں کا جو سردار ہے ہم اس کی پناہ میں آتے ہیں تاکہ وہ اپنے ماتحت جنوں سے ہماری حفاظت کرے، ان باتوں سے جن اور زیادہ مغرور

ہو گئے اور سر چڑھنے لگے، دوسری طرف اس طرح کی شرکیات سے آدمیوں کے عصیان وطغیان میں بھی اضافہ ہوا جب انہوں نے خود اپنے اوپر جنوں کو مسلط کر لیا تو وہ ان کے اغوا میں کیا کمی کرتے، آخر قرآن نے آکر ان خرابیوں کی جڑ کاٹی۔ (تفسیر عثمانی)

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ ”زمانہ جاہلیت میں جب لوگ اپنے سفر کے دوران کسی جنگل میں قیام کرتے تو اس جنگل کے جنات کی پناہ مانگتے تھے۔ یعنی اس جنگل کے جنات سے یہ درخواست کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنی پناہ میں لے کر تکلیف پہنچانے والی مخلوقات سے بچائیں۔ اس عمل سے جنات یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم انسانوں سے افضل ہیں، کیونکہ وہ ہماری پناہ کے محتاج ہیں۔ اس طرح ان کی گمراہی میں اور اضافہ ہو گیا۔ (حاشیہ آسان ترجمہ قرآن)

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو ایام جاہلیت میں متعارف تھا اور آج بھی کئی معاشروں میں یہ بات متعارف ہے کہ جنوں کو زمین اور انسانوں پر اقتدار حاصل ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کو نفع نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ اور یہ کہ بعض اراضی اور سمندروں اور فضا میں یہ جن محکوم ہیں، اور ان کے سردار ان پر حکمران ہیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ کسی، غیر آباد جگہ جاتے یا کسی جنگل اور پہاڑ میں ہوتے تو یہ اس علاقے کے سردار جن کی پناہ مانگ لیتے کہ اس کے زبردست جن کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔ یہ پناہ مانگنے کے بعد، وہاں شب باشی کرتے۔

شیطان کو یہ طاقت دے دی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے قلوب پر اثر انداز ہو، (ماسوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں، ایسے لوگ اس کی دسترس سے بچے رہتے ہیں) لیکن انسانوں میں سے جو شخص شیطان کی طرف جھکتا ہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دیتا۔ اس لئے کہ شیطان انسانوں کا دشمن ہے۔ یہ دراصل انسان کو گمراہ کرتا ہے، اور اسے اذیت دیتا ہے۔ (تفسیر ظلال القرآن)

بعثت سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا {۷} الجن

جواب ترجمہ: اور بات یہ ہے کہ انہوں نے خیال کیا جیسا تم نے خیال کیا ہے کہ اللہ کسی کو دوبارہ زندہ نہ فرمائے گا۔

جن قوم سے گفتگو کرتے ہیں کہ جس طرح بعض انسان جنوں کی پناہ مانگتے تھے اسی طرح وہ بھی یہ گمان رکھتے تھے جس طرح تم گمان رکھتے ہو کہ اللہ رسول نہ بھیجے گا۔ لیکن دیکھ لو اللہ نے تو رسول بھیج دیا اور رسول کو یہ قرآن بھی دے دیا ہے جو رشد و ہدایت کا سامان فراہم کر رہا ہے یا مفہوم یہ ہے کہ ان کے عقائد یہ تھے جس طرح تمہارے ہیں کہ اللہ قیامت میں کسی کو نہ اٹھائے گا لہٰذا انہوں نے قیامت کے لئے کوئی تیاری نہ کی اور رسول خدا نے جس انجام سے ڈرایا تھا اس کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اللہ کسی کو نہیں اٹھائے گا۔

یہ دونوں ظن و گمان حقیقت کے مطابق نہ تھے، یہ جاہلانہ خیالات پر مبنی تھے اور اس پوری کائنات کی حکمت و تخلیق سے بیخبری پر مبنی تھے، اللہ نے تمام مخلوق کو یوں پیدا کیا ہے کہ اس کے اندر خیر کی صلاحیت بھی تھی اور شر کی صلاحیت بھی تھی، (جس طرح اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو بھی دوہری صلاحیت دی گئی ہے، خیر کی بھی اور شر کی بھی، ہاں ان میں سے بعض نے اپنے آپ کو شر مجسم کر لیا مثلاً ابلیس، جس نے اپنے آپ کو رحمتِ خداوندی سے محروم کر لیا اور خالص شر بن گیا) اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر خیر کی معاونت کی، رسولوں کا مشن قرار پایا کہ وہ انسانوں کے اندر پائی جانے والی خیر کی صلاحیت کو ابھاریں اور ان کی فطرت میں جو خیر کی استعداد ہے اسے جلا دیں، لہٰذا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو نہ بھیجے گا۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب ہم آیت میں بعث سے مراد " رسولوں کا بھیجنا" لیں، اگر بعث سے مراد آخرت میں اٹھانا ہے تو پھر بھی یہ بات حکمت تخلیق کے خلاف ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی نیکی اور بدی کا حساب و کتاب اس دنیا میں پورا نہیں ہو جاتا، لہٰذا اللہ کی حکمت تخلیق اور عدل کے تقاضے کے مطابق بھی ضروری ہے کہ ایسا جہاں ہو جہاں مظلوموں کے ساتھ انصاف کیا جائے، نیکوکاروں کو انعام اور بدکاروں کو سزا دی جائے اور حساب و کتاب بے باک ہو اور جو جس مقام کا حیات دنیا کے مطابق، اہل بنتا ہو، اس میں جائے، لہٰذا اس بات کا کوئی موقع و مقام نہیں ہے کہ اللہ کسی کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا، یہ اعتقاد حکمت الٰہیہ کے خلاف ہے، عدل و انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔

چنانچہ اس انداز میں جنوں نے اپنی قوم کے غلط خیالات کو درست کرنے کی سعی کی اور قرآن نے یہ بات مشرکین عرب کے غور کے لئے نقل کی کہ جن تو خود اپنے خیالات پر نظر ثانی کر رہے ہیں تم کیا کر رہے ہو۔

اس آخری رسالت کے اثرات اس پوری کائنات پر مرتب ہو گئے ہیں، کائنات کے اطراف میں قوائے طبعیہ بھی بدل گئی ہیں، زمین و آسمان میں انتظامی تبدیلیاں آگئی ہیں تاکہ وہ اپنی وہ تمام کاروائیاں ترک کر دیں جو اس آخری رسالت کے ساتھ متفق نہیں ہیں، ہر قسم کی غیب دانی کا دعویٰ ترک کر دیں اور یہ کہ وہ اعلان کر دیں کہ اس کائنات میں وہ کچھ قوت بھی نہیں رکھتے۔ (ظلال القرآن)

جنات آسمانوں سے خبریں نہیں لا سکتے

سوال کیا جنات آسمانی خبروں کے حصول کی خاطر وہاں سے چوری کر سکتے ہیں؟ سورۃ الجن کی ان آیات کی روشنی میں وضاحت فرمایئے، آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ﴿۸﴾ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ الجن

جواب ترجمہ: اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولنا چاہا تو ہم نے پایا کہ وہ بڑے سخت پہرے داروں اور شعلوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور بیشک ہم آسمان کے مواقع میں باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے سو جو شخص اب سننا چاہے وہ اپنے لیے ایک شعلہ تیار پاتا ہے۔

جنات اس کی طاقت نہیں رکھتے کہ وہ آسمانی خبریں وہاں سے چوری کر کے لائیں، قرآن کریم میں ہے جنات کہہ رہے ہیں کہ ہم جنوں کے گروہ نے آسمان تک پہنچنا چاہا، تاکہ وہاں کے رہنے والوں کی باتیں سن سکیں مگر ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ وہاں تو بے شمار فرشتے پہریدار ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں، ان کے علاوہ وہاں تو شعلہ زن انگارے ہیں جو قریب آنے والوں پر پھینکے جاتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ہم نے آسمان میں ایسی جگہ بنا رکھی تھی جہاں سے ہم اس کی خبریں سن لیتے تھے، اب ایسا نہیں ہوتا کیونکہ گھات لگے انگارے پڑتے ہیں، جو جلا دیتے ہیں اور ہلاک کر دیتے ہیں، ان دو آیات میں ابطال ہے نجومیوں اور شعبدہ بازوں کا جو غیب دانی کے دعویدار ہیں اور اپنے کذب وافترا بازی کے ذریعے کمزور عقل والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

علامہ قطب شہید فرماتے ہیں "یہ واقعات جو جنوں کے ذریعہ قرآن نے نقل کیے ہیں، بتاتے ہیں کہ اس آخری رسالت سے قبل کے زمانے میں، جس میں رسول نہ تھا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں، جنوں کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ عالمِ بالا کی طرف جاتے تھے اور عالمِ بالا میں اس زمین اور کائنات کے بارے میں جو احکام صادر ہوئے تھے یا فرشتوں کے درمیان زیر بحث آتے تھے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرشتوں کو جو احکام برائے نفاذ صادر کرتا تھا، یہ جن عالم بالا میں بعض مقامات تک پہنچ کر گن سن لے لیتے تھے اور پھر ان سچی معلومات کے ساتھ بہت سی غلط معلومات جمع کر کے، یہ جن دنیا میں کاہنوں، قیافہ دانوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو دیتے اور یہ لوگ ان حقیقی معلومات کو شیطانوں کے آمیزے کے ساتھ مزید اپنے مفاد کی چیزیں ملا کر لوگوں میں پھیلاتے، ان کو گمراہ کرتے اور اس

طرح شیطانی منصوبہ چلتا رہتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضور ﷺ سے قبل یہ نظام کس طرح چلتا تھا، اس کی تفصیلات قرآن نے نہیں دی ہیں اور نہ یہ تفصیلات جاننے کی کوئی ضرورت ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا، شیاطین بادلوں تک پہنچ کر فرشتوں سے سن لیا کرتے تھے، مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت آپ کی آسمانی وحی کی حفاظت کے لئے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان یہ خبریں سننے کے لئے اوپر آتا تو اس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی شیاطین و جنات کو فکر ہوئی اور تحقیق حال کے لئے دنیا کی مشرق و مغرب میں وفود بھیجے پھر مقام نخلہ میں آنحضرت ﷺ سے ایک وفد جنات کا قرآن سن کر ایمان لانا سورۃ جن میں ذکر فرمایا گیا۔

شہاب ثاقب بعثت نبوی سے پہلے بھی تھے مگر ان کے ذریعہ دفع شیاطین کا کام آپ کے زمانہ سے ہوا، یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا عربی میں انقضاص الکوکب کہتے ہیں۔ یہ تو دنیا میں قدیم زمانہ سے ہوتا آیا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی تخصیص ہے، جواب یہ ہے کہ شہاب ثاقب کا وجود تو پہلے سے تھا خواہ اس کی حقیقت وہ ہو جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں کہ زمین سے کچھ آتشیں مادے فضا میں پہنچتے ہیں وہ کسی وقت بھڑک اٹھتے ہیں یا یہ ہو کہ خود کسی ستارہ اور سیارہ سے یہ آتشیں مادہ نکلتا ہو، بہر حال اس کا وجود اگرچہ ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔ (معارف القرآن)

جنات غیب دان نہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا {۱۰} الجن

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نہیں جانتے کہ جو لوگ زمین میں ہیں ان کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے بارے میں ہدایت کا ارادہ فرمایا ہے۔

یہ تمام غیبی امور صرف اللہ کے علم کے حوالے ہیں، جن کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ پس پردہ تقدیر سے کیا چیز نمودار ہوتی ہے، آیا انسانوں پر کوئی مصیبت آرہی ہے اور وہ گمراہی میں مزید آگے جائیں گے یا ان کے لئے ہدایت اور رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں، انہوں نے ہدایت کو شر کے مقابلے میں ذکر کیا گویا حقیقی خبر ہے ہی ہدایت۔

جب وہ ذریعہ ہی اس بات کی تردید کر دے، جس کی طرف کاہن اپنا یہ دعویٰ منسوب کرتے تھے کہ وہ اپنے مزعومہ افکار وہاں سے لیتے ہیں، تو پھر کاہنوں کے مزعومہ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے، جنوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ تو علم غیب نہیں جانتے، لہذا بات ختم ہوگئی، ہر قسم کے زعم باطل قرار پائے اور کاہنوں اور عرافوں کے دعوؤں کا اعتبار جاتا رہا، یہ بات ثابت ہوگئی کہ غیب صرف اللہ جانتا ہے، لہذا نہ کوئی غیب کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ پیشین گوئی کر سکتا ہے، یوں قرآن کریم نے انسانی عقل کو ہر قسم کے اوہام و خرافات سے پاک کر دیا اور ان تمام مزعومات کے دروازے بند کر دیئے، جو کیے جاسکتے تھے اور اعلان کر دیا کہ اب انسانی عقل سن رشد کو پہنچ گئی ہے اور انسانی افکار کے اندر اوہام و خرافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (ظلال القرآن)

جنات مسلمان یا کافر؟

سوال کیا جنات میں مسلمان اور کافر ہوتے ہیں؟

جواب جی ہاں جنات میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی، ارشاد

وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا {۱۱} الجن.

اور بے شک ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف طریقوں پر تھے۔

یہ جنوں کے قول کی حکایت ہے جب جنوں نے اپنے ساتھیوں کو حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی تو اس وقت انہوں نے ایک دوسرے کو کہا کہ قرآن سننے سے پہلے ہم میں سے کچھ صالح تھے اور ہم میں سے کچھ کافر تھے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ کا معنی ہے کہ صالحین سے صالحیت میں کم ہیں۔ یہ کلام اس کے زیادہ مشابہ ہے جس نے اسے ایمان اور شرک پر محمول کیا ہے۔

كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا: یعنی ہم مختلف جماعتیں تھیں، سدی نے یہ تعبیر کی ہے۔ ضحاک نے کہا، مختلف دین رکھنے والے تھے۔ قتادہ نے کہا، متضاد خواہشات رکھنے والے تھے، معنی یہ ہے کہ تمام جن کافر نہیں تھے بلکہ مختلف تھے ان میں سے کچھ کفار تھے اور کچھ صالح مومن اور کچھ غیر صالح مومن تھے۔ مسیب نے کہا، ہم مسلمان، یہودی، نصرانی اور مجوسی تھے۔

سدی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان، کنا طرائق قددا۔ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، جنوں میں بھی تمہاری طرح قدریہ، مرجئہ، خوارج، رافضیہ، شیعہ اور سنی تھے۔ ایک قوم نے یہ تعبیر کی کہ قرآن سننے کے بعد ہم مختلف تھے ہم میں سے کچھ مومن اور ہم میں سے کچھ کافر تھے یعنی ہم میں سے کچھ صالح اور کچھ ایسے مومن تھے جو صالحیت میں انتہاء تک پہنچے تھے یعنی ہم میں سے کچھ صالح اور کچھ ایسے مومن تھے جو صالحیت میں انتہا تک نہیں پہنچے ہوئے تھے پہلی تعبیر اچھی ہے کیونکہ جنوں میں سے کچھ ایسے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی کہ انہوں نے کہا، (ہم نے ایسی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی

گئی ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے) یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ تورات پر ایمان رکھتے تھے جن کو انہوں نے ایمان کی دعوت دی تھی یہ ان کی طرف سے مبالغہ ہے نیز اس قول میں کوئی فائدہ نہیں کہ ہم اب مومن اور کافر میں منقسم ہوئے ہیں۔

طرائق، طریقہ کی جمع ہے۔ یہ انسان کا مذہب ہے یعنی ہم مختلف جماعتیں تھیں، یہ قول کیا جاتا ہے، القوم طرائق، یعنی مختلف مذاہب پر ہے۔ قدد سے مراد راستوں کی مثل ہے یہ طرائق کے لیے تاکید ہے اس کا واحد قدۃ ہے۔ (قرطبی)

اللہ کو کوئی عاجز نہیں کر سکتا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا {۱۲} وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا {۱۳} الجن

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور بھاگ کر اس کو ہرا نہیں سکتے۔ اور بیشک بات یہ ہے کہ جب ہم نے ہدایت کو سن لیا تو ہم اس پر ایمان لے آئے سو جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آیا سو اسے نہ کسی کمی کا خوف ہے اور نہ کسی طرح کے ظلم کا۔

جنات نے اپنی قوم کو ڈراتے ہوئے کہا کہ ہم پر یہ بات واضح ہو گئی ہے ہم ہمہ وقت اللہ کی مٹھی میں ہیں اللہ تعالیٰ جب چاہے ہمیں گرفت میں لے سکتا ہے، جب وہ ہمیں پکڑنا چاہے تو ہم کہیں زمین میں چھپ کر اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے اور نہ ہی آسمانوں میں بھاگ کر اس کی گرفت سے باہر جاسکتے ہیں۔

سید قطب فرماتے ہیں" ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کو اس زمین میں ان پر پوری پوری قدرت حاصل ہے، یہ بھی وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے بھاگ بھی نہیں سکتے، یعنی بندہ رب کے سامنے بہت ضعیف ہے اور تمام مخلوق کا مقابلہ نہیں کر سکتا یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی یہ گروہ اللہ کی قدرت اقتدار اور غلبے کا شعور رکھتا تھا۔

یہ تھے وہ جن، جن کے ہاں بعض انسان دور جاہلیت میں پناہ لیتے تھے اور مشرکین عرب تو اپنی حاجات میں جنوں کو پکارتے تھے اور انہوں نے ان جنوں اور رب تعالیٰ کے درمیان رشتہ داری کا عقیدہ بھی تصنیف کر لیا تھا، جبکہ یہ جنات اپنی عاجزی، اور اللہ کی قدرت کا اقرار کرتے ہیں، یہ اپنی ضعیفی اور اللہ کے اقتدار کی بات کرتے ہیں، یہ اپنی عاجزی اور اللہ کی قہاری و جباری کا عقیدہ رکھتے ہیں، یہ بات وہ صرف اپنی قوم سے ہی نہیں کہتے بلکہ مشرکین مکہ سے بھی کہتے تھے کہ حقیقی قوت صرف اللہ کے پاس ہے جو اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ (ظلال القرآن)

وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَى آمَنَّا بِهِ: اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، اب جب کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے اور ہدایت کا پیغام سننے والے ہر شخص کا فریضہ یہی ہے، یہ لوگ قرآن کو یہاں ہدایت کا نام دیتے ہیں، کیونکہ قرآن کی اصل ماہیت ہدایت ہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ہدایت ہے اور ان کو اپنے رب پر پورا اعتماد بھی ہے، جس طرح ہر ایمان لانے والے کو اپنے آقا پر ہونا چاہیے۔ (ظلال القرآن)

فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا: اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا، اسے کسی حق تلفی یا ظلم (یعنی طاقت سے زیادہ کام دینے) کا خوف نہ ہو گا، ایک مومن ایمان کے بعد اللہ پر پورا پورا بھروسہ کرنے لگتا ہے اور اسے اللہ کے عدل پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور یہی ہے ایمان کی حقیقت کہ اللہ عادل ہے، وہ کسی مومن کا حق نہیں مارتا، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، نہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ڈیوٹی دیتا ہے، اللہ مومن بندے کو اس کے استحقاق سے ذرہ بھر بھی محروم نہیں کرتا اور اللہ اپنے بندے کو رھق سے بھی بچاتا ہے، رھق کے معنی ہیں طاقت سے زیادہ جہد و مشقت میں ڈالنا، لہٰذا کوئی اور شخص بھی ایک مومن پر ظلم کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا کیونکہ مومن اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مومن بعض اوقات اس دنیا کی سہولیات سے محروم رہتا ہے لیکن یہ محرومیاں بخس کے مفہوم میں نہیں آتیں۔

بعض اوقات ایک مومن کو اذیتیں بھی دی جاتی ہیں اور یہ اس زمین کی بعض چھوٹی قوتوں کی طرف سے ہوتی ہیں، لیکن یہ اذیتیں رھق کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون کس قدر مشقت برداشت کرنے کا اہل ہے اور کون کس قدر سہولیات کا اہل ہے اور اللہ بعض بندوں کو مشقتوں میں ڈال کر ان کو اپنے قریب کرتا ہے اور یہ ان کے لئے مفید ہوتی ہیں۔

لہٰذا ایک مومن نفسیاتی لحاظ سے حق تلفی اور قوت برداشت سے زیادہ مشقت اٹھانے سے محفوظ ہوتا ہے، اس لیے اسے کسی حق تلفی سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے اور یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہیے کہ اس پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ یہ تصور انسان کے اندر اطمینان، آرام اور سکون پیدا کر دیتا ہے۔ انسان قلق، چبھن اور بے چینی محسوس کرتا، یہاں تک کہ وہ اگر مشقت میں ہو پھر بھی جزع فزع نہیں کرتا، نہ ڈرتا ہے، نہ اپنے اوپر دروازے بند کرتا ہے، وہ مشقت کو آزمائش سمجھتا ہے، صبر کرتا ہے اور اللہ سے فراخی کی امید رکھتا ہے اور اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے، لہٰذا امارت وغربت اور ضعف وقوت دونوں حالتوں میں وہ فائدے میں رہتا ہے اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور جنوں کے اس گروہ نے اس حقیقت کو بہت ہی اچھے انداز سے ذہن نشین کرایا اس کے بعد یہ لوگ اب ہدایت وضلالت کی حقیقت ذہن نشین کراتے ہیں اور ہدایت وضلالت پر جزاء وسزا کا ذکر کرتے ہیں۔ (تفسیر ظلال القرآن)

مسلمان اور ظالم کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا {۱۴}وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا {۱۵}الجن.

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم میں سے بعض مسلمان ہیں اور بعض ظالم ہیں سو جس شخص نے اسلام قبول کر لیا تو ان لوگوں نے بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ اور جو لوگ ظالم ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ : اور یہ کہ " ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کی اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا" انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈلی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ : قاسطون قاسط کی جمع ہے، قاسط کے معنی ظالم اور حق سے ایک طرف ہونے والے کے ہیں، عدل و نیکی سے منحرف ہونے والے کے ہیں، جنوں نے ان کو مسلمانوں کے مقابل لاکر ذکر کیا ہے اور اس کے اندر ایک لطیف اشارہ ہے، کہ ایک مسلمان عادل اور مصلح ہوتا ہے اور اس کا فریق مقابل ظالم اور مفسد ہوتا ہے۔

فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا: جس نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا" انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈلی"۔ یہاں ان کے اس فعل کو لفظ " تحروا" سے تعبیر کیا۔ نہایت گہری سوچ سے راہ ہدایت تلاش کرنا اور اس کے بالمقابل ہے گمراہی اور ضلالت۔ " تحری" کے معنی ہوتے ہیں نہایت دقت سے راہ صواب کو اختیار کرنا اچھی طرح سوچ کر اور اچھی چھان بین کرکے، یہ نہیں کہ جدھر منہ ہوا ادھر چل دیا، بغیر سوچ سمجھ کے، یعنی اسلام قبول کرتے ہی وہ راہ صواب تک پہنچ گئے، اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام عین راہ نجات ہے اور یہ بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے۔ (ظلال القرآن)

وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا: جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں، یعنی ان کے جہنمی ہونے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور جب یہ جہنم میں پھینکے جائیں گے تو جہنم کی آگ ان کی وجہ سے اس طرح تیز ہو گی جس طرح خشک ایندھن کی وجہ سے آگ زیادہ مشتعل ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات کو بھی جہنم کا عذاب ہو گا اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ نیک جن جنت کے بھی مستحق ہوں گے، یہی حقیقت ہے، کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور چیز کا عقیدہ اختیار کرے، اگر کوئی کرتا ہے تو وہ باطل ہو گا اور جو کچھ قرآن کہتا ہے بلا جدال

درست ہو گا، لہٰذا جو بات جنوں پر صادق ہے وہی انسانوں کا انجام بھی ہو گا، یہاں تک تو قرآن نے جنوں کی باتیں ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیں۔ (ظلال القرآن)

سیدھی راہ چلنے کا فائدہ نہ چلنے کا نقصان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا {۱۶} لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا {۱۷} الجن

جواب ترجمہ: اور (اے پیغمبر! اہل مکہ سے کہو کہ مجھ پر) یہ (وحی بھی آئی ہے) کہ اگر یہ لوگ راستے پر آکر سیدھے ہو جائیں تو ہم انہیں وافر مقدار میں پانی سے سیراب کریں۔ تاکہ اس کے ذریعے ان کو آزمائیں۔ اور جو کوئی اپنے پروردگار کی یاد سے منہ موڑے گا۔ اللہ اسے چڑھتے ہوئے عذاب میں پرو دے گا۔

یعنی اگر جن وانس حق کی سیدھی راہ پر چلتے تو ہم ان کو ایمان وطاعت کی بدولت ظاہری وباطنی برکات سے سیراب کر دیتے اور اس میں بھی ان کی آزمائشیں ہوتیں کہ نعمتوں سے بہرہ ور ہو کر شکر بجالاتے اور طاعت میں مزید ترقی کرتے ہیں یا کفران نعمت کر کے اصل سرمایہ بھی کھو بیٹھتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ اس وقت مکہ والوں کے ظلم وشرارت کی سزا میں حضور ﷺ کی دعا سے کئی سال کا قحط پڑا تھا، لوگ خشک سالی سے پریشان ہو رہے تھے، اس لیے متنبہ فرما دیا کہ اگر سب لوگ ظلم و شرارت سے باز آکر اللہ کے راستہ پر چلیں جیسے مسلمان جنوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو قحط دور ہو اور باران رحمت سے ملک سرسبز وشاداب کر دیا جائے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آب کثیر سے مراد وسیع رزق کیونکہ پانی حصول رزق کا سبب ہے (سبب بول کر مسبب بطور مجاز مراد لیا گیا) جس طرح رزق سے بارش اس آیت میں مراد ہے وَمَا اَنْزَلَ اللّٰه

مِنَ السَّمَآءِ مِن رِّزق فَاَحیَا بِهِ الاَرضَ، (آسمان سے غلہ نہیں بلکہ پانی اترتا ہے جو زمین کی سرسبزی کا ذریعہ ہے) مراد یہ ہے کہ اگر وہ دین فطرت پر قائم رہے تو ہم ان کو بکثرت مال اور آرام کی زندگی عطا کریں گے اس آیت کا مفہوم وہی ہے جو آیت {وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ} (الْمَائِدَةِ:٦٦) کا ہے (اور اگر وہ تورات اور انجیل اور جو کتاب (اب) ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پابندی کرتے تو وہ اپنے اوپر اور اپنے پاؤں کے نیچے ہر طرف سے (اللہ کا رزق) کھاتے)

اور اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں واضح فرمایا ہے {وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ} (الْأَعْرَافِ: ٩٦) میں بیان کیا گیا ہے۔ (اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے)

لِنَفتِنَهم فِيهِ: یعنی اس سیرابی یا عطاء فراخی کی غرض تھی ان کی آزمائش ہم کو ان کا امتحان لینا مقصود تھا کہ (ہماری نعمت کا وہ) کس طرح شکر ادا کرتے ہیں۔

اہل مکہ پر قحط :ابو جہل اور مکہ کے دوسرے کفار جب ایمان نہ لائے تو سات سالہ قحط میں مبتلا کر دیئے گئے اور ایسا کال پڑا کہ لوگ گوبر کھانے لگے اور آخر بدترین حال میں جنگ بدر میں مارے گئے لیکن وہ ایمان دار جو دین الٰہی پر قائم رہے اللہ نے ان کو قیصر وکسریٰ کی حکومتیں عطا فرمائیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ایک قول یہ کیا گیا ہے یہاں اس سے مراد تمام مخلوق ہے اگر ساری مخلوق حق، ایمان اور ہدایت کے راستہ پر استقامت کا مظاہرہ کرتی اور وہ مطیع ومومن ہوتی تو ہم اسے کثیر پانی سے سیراب کرتے تاکہ ہم آزمائیں کہ ان نعمتوں پر ان کا شکر کیسا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمایا أَيْنَمَا كَانَ الْمَاءُ كَانَ الْمَالُ، وَأَيْنَمَا كَانَ الْمَالُ كَانَتِ الْفِتْنَةُ، جہاں کہیں ماء کا ذکر ہے اس سے مراد مال ہے اور جہاں کہیں مال کا ذکر ہے اس سے مراد آزمائش ہے، لَأَسْقَيْنَاهُمْ، کا معنیٰ ہے ہم دنیا میں ان پر وسعت کر دیتے۔ ماء غدق کو مال کثیر کے لیے بطور ضرب المثل ذکر کیا کیونکہ خیر اور رزق سب بارش کی وجہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے بارش کو خیر اور رزق کی جگہ رکھ دیا۔ (تفسیر قرطبی)

حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا، كَانَ وَاللهِ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَامِعِينَ مُطِيعِينَ، فَفُتِحَتْ عَلَيْهِمْ كُنُوزُ كِسْرَى وَقَيْصَرَ وَالْمُقَوْقِسِ وَالنَّجَاشِيِّ، فَفُتِنُوا بِهَا، (الجامع لاحکام القرآن) اللہ کی قسم، نبی کریم ﷺ کے صحابہ احکام کے سننے والے اور اطاعت کرنے والے تھے ان پر کسریٰ، قیصر مقوقس اور نجاشی کے خزانے کھول دیے گئے تو اسی مال کی وجہ سے انہیں آزمائش میں ڈالا گیا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مَا يُخْرِجُ اللهُ لَكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا قَالُوا: وَمَا زَهْرَةُ الدُّنْيَا؟ قَالَ: بَرَكَاتُ الْأَرْضِ (مسلم) جن چیزوں سے میں تمہارے بارے میں خوف کھاتا ہوں ان میں سے سب سے خوفناک امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر زہرۃ الدنیا نکالے گا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یہ زہرۃ الدنیا کیا چیز ہے؟ فرمایا، زمین کی برکات۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، فَوَاللهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَإِنَّمَا أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا (كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ قَبْلَكُمْ) فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ، اللہ کی قسم! میں تمہارے بارے میں فقر سے نہیں ڈرتا، میں تمہارے بارے میں اس چیز سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر فراخ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر

فراخ کی گئی تھی تم اس میں باہم مقابلہ کروگے جس طرح انہوں نے باہم مقابلہ کیا تو وہ تمہیں ہلاک کردے گی جس طرح اس نے انہیں ہلاک کر دیا تھا۔

وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا: یعنی اللہ کی یاد سے منہ موڑ کر آدمی کو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ایسے راستہ پر چل رہا ہے جہاں پریشانی اور عذاب ہی چڑھتا چلا آتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مال تھوڑا ہو یا بہت اگر تقویٰ نہ ہو تو ایسے مال میں کوئی بھلائی نہیں یہی زندگی کی تنگی ہے جو لوگ حق سے روگرداں ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی مال دار اور کیسے ہی فراخ دست ہوں لیکن ان کی زندگی تنگ ہی ہوتی ہے کیونکہ ان کو خیال ہوتا ہے کہ (موجودہ مال صرف ہو گیا تو) اس کی جگہ دوسرا مال ان کو نہیں ملے گا اللہ کے متعلق بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں تنگ ہی گزرتی ہیں۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قناعت ان سے چھین لی جاتی ہے اس لئے ان کو سیری حاصل ہی نہیں ہوتی۔

دنیاداروں سے قناعت چھین لی جاتی ہے وہ ہمیشہ کمائی کی دھن میں لگے رہتے ہیں کماتے ہیں اور مال کا چوکیدارہ کرتے ہیں اور ہر وقت مال کے ضائع ہونے کا ان کو اندیشہ لگا رہتا ہے باہمی بغض و حسد کی یہی بنیاد ہے دشمنوں اور حاسدوں کی کثرت ان کو چین نہیں لینے دیتی یہ ہی عذاب الیم اور تنگی حیات ہے وہ نہیں جانتے کہ صوفیاء کی زندگی کیسی خوشگوار گزرتی ہے ذکر الٰہی سے اطمینان قلب اور کشائش صدر کا حصول تھوڑے پر قناعت، دنیا سے استغناء، مخلوق پر مہربانی ان کے خصوصی اوصاف ہوتے ہیں، مصائب سے بھی خوش ہوتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں کیونکہ ان کو تکالیف سے گناہوں کا کفارہ اور حسن ثواب کے حصول کی امید ہوتی ہے فراخی حال اور آسائش کا تو ذکر ہی کیا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے دنیا اور آخرت کی راحت عطا فرماتا ہے۔

يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا، یہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے جب بھی وہ اس پر اپنے ہاتھ رکھیں گے تو ہاتھ پگھل جائیں گے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا

معنیٰ عذاب کی مشقت اور سختی ہے۔

لغت میں بھی یہ معلوم و مشہور ہے کہ، صعد کا معنیٰ مشقت ہے تو کہتا ہے، تَصَعَّدَنِي الْأَمْرُ، یہ جملہ تو اس وقت بولتا ہے جب معاملہ تجھ پر مشکل ہو جائے۔ اس معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، مَا تَصَعَّدَنِي شَيْءٌ مَا تَصَعَّدَتْنِي خُطْبَةُ النِّكَاحِ، یعنی جتنا مشکل خطبہ نکاح ہے میرے لیے اتنی مشکل کوئی چیز نہیں۔ اور عَذَابٌ صَعَدٌ کا معنیٰ ہے سخت عذاب۔ اور الصَّعَدُ صَعِدَ کا مصدر ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے صَعِدَ صَعَدًا وَصُعُودًا، اس لفظ کے ساتھ عذاب کی صفت ذکر کی گئی ہے کیونکہ یہ عذاب اس شخص پر بلند ہو جاتا ہے جسے عذاب دیا جاتا ہے، جسے برداشت کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ ابو عبیدہ نے کہا، الصعد مصدر ہے تقدیر کلام یوں ہو گی عَذَابًا ذَا صَعَدٍ یعنی مشقت والا عذاب اور بلندی کی طرف چلنے میں مشقت ہوتی ہے صعود سے مراد پیچ دار گھاٹی ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ هُوَ صَخْرَةٌ مَلْسَاءُ فِي جَهَنَّمَ يُكَلَّفُ صُعُودَهَا، فَإِذَا انْتَهَى إِلَى أَعْلَاهَا حُدِرَ إِلَى جَهَنَّمَ، جہنم میں ملائم چٹان ہے جس پر چڑھنے کا انہیں مکلف بنایا جائے گا، جب وہ اس کی بلندی تک پہنچیں گے تو انہیں جہنم کی طرف گرا دیا جائے گا۔

کلبی کہتے ہیں کہ يُكَلَّفُ الْوَلِيدُ بْنُ الْمُغِيرَةِ أَنْ يَصْعَدَ جَبَلًا فِي النَّارِ مِنْ صَخْرَةٍ مَلْسَاءَ، يُجْذَبُ مِنْ أَمَامِهِ بِسَلَاسِلَ، وَيُضْرَبُ مِنْ خَلْفِهِ بِمَقَامِعَ حَتَّى يَبْلُغَ أَعْلَاهَا، وَلَا يَبْلُغُ فِي أَرْبَعِينَ سَنَةً. فَإِذَا بَلَغَ أَعْلَاهَا أُحْدِرَ إِلَى أَسْفَلِهَا، ثُمَّ يُكَلَّفُ أَيْضًا صُعُودَهَا، فَذَلِكَ دَأْبُهُ أَبَدًا، (تفسیر القرطبی) ولید بن مغیرہ کو جہنم میں ایک پہاڑ پر چڑھنے پر مجبور کیا جائے گا، جو پہاڑ ملائم چٹان کا ہو گا، اسے زنجیروں کے ساتھ سامنے سے کھینچا جائے گا اور پیچھے سے گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا یہاں تک کہ اس کی چوٹی پر پہنچے گا وہ چالیس سال تک اس کی بلندی پر نہیں پہنچے گا، جب وہ اس کی بلندی پر پہنچے گا تو اسے اس کی پستی کی طرف گرا دیا جائے گا، پھر اسے اس کی چوٹی پر چڑھنے پر مجبور کیا جائے گا، ہمیشہ اس کا یہی طریقہ ہو گا۔

مسجدوں میں غیر اللہ کو نہ پکارو

سوال مسجدیں اللہ کے گھر ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کی جاسکتی، ان میں اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارا جاسکتا، اس آیت کی روشنی میں تفسیر و ترجمہ کیجیے۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا {۱۸} الجن.

جواب اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لئے ہیں پس تم لوگ مت پکارو اللہ (وحدہ لاشریک) کے ساتھ کسی کو بھی۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ: مساجد مسجد کی جمع ہے، مسجد اسم ظرف ہے جس کا معنیٰ ہے سجدہ گاہ، سجدہ کرنے کی جگہ، وہ عبادت گاہ جو نماز کے لیے وقف کر دی جاتی ہے، اس معنیٰ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بتائی جارہی ہے کہ مسجد اللہ کی عبادت و بندگی کے لیے بنائی جاتی ہے، اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا: اس لیے مسجد میں عبادت اور سجدہ ریزی صرف اللہ ہی کے لیے کی جاسکتی ہے، اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کسی اور کو پکارا جاسکتا ہے، کیونکہ اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ ریز ہونا، اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارنا، کسی اور سے مافوق الاسباب مدد چاہنا یہ سراسر شرک ہے اور شرک اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی فیصلہ کیا ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ گار کو چاہوں تو معاف کر دوں مگر مشرک کو کبھی معاف نہیں کروں گا، باقی گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کی سزا جہنم میں بھگتنے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے جب کہ کافر اور مشرک یہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اس لیے مسلمان کو مسلمان اور مؤحد رہنا چاہیے، اپنے عقیدہ میں شرک کی آمیزش نہیں کرنا چاہیے۔

اسی طرح مساجد (مسجد) جیم کی زبر کے ساتھ ہو تو مصدر میمی ہے، اس کا معنیٰ سجدہ گاہ کی بجائے سجدہ ہو گا، اس لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ سجدہ صرف اللہ ہی کے لیے ہے، کسی اور کو سجدہ کرنا جائز

نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مساجد مسجد بفتح الجیم کی جمع ہو جو مصدر میمی بمعنے سجدہ آتا ہے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں اور جو شخص غیر اللہ کو اعانت کے لئے پکارتا ہے گویا وہ اس کو سجدہ کرتا ہے۔ غیر اللہ کے سجدہ سے اجتناب کرو۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یوں تو خدا کی ساری زمین اس امت کے لیے مسجد بنادی گئی ہے۔ لیکن خصوصیت سے وہ مکانات جو مسجدوں کے نام سے خاص عبادت الٰہی کے لیے بنائے جاتے ہیں، ان کو اور زیادہ امتیاز حاصل ہے، وہاں جا کر اللہ کے سوا کسی ہستی کو پکارنا ظلم عظیم اور شرک کی بدترین صورت ہے، مطلب یہ ہے کہ خالص خدائے واحد کی طرف آؤ اور اس کا شریک کر کے کسی کو کہیں بھی مت پکارو خصوصاً مساجد میں جو اللہ کے نام پر تنہا اسی کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہیں۔

بعض مفسرین نے "مساجد" سے مراد وہ اعضا لیے ہیں جو سجدہ کے وقت زمین پر رکھے جاتے ہیں، اس وقت مطلب یہ ہو گا کہ یہ خدا کے دیے ہوئے اور اس کے بنائے ہوئے اعضاء ہیں، جائز نہیں کہ ان کو اس مالک و خالق کے سوا کسی دوسرے کے سامنے جھکاؤ۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آیت وان المساجد للہ اور بلاشبہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سے مراد ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی زمین پر سوائے مسجد حرام اور مسجد ایلیا یعنی بیت المقدس کے اور کوئی مسجد نہ تھی۔ (ابن ابی حاتم، در منثور)

حضرت اعمش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنات نے کہا یا رسول اللہ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم آپ کے ساتھ نمازوں میں آپ کی مسجد میں حاضر ہوا کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آیت وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا اور بیشک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں بس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو، یعنی نماز پڑھو اور لوگوں کے ساتھ اختلاط نہ رکھو۔ (ابن ابی حاتم)

روایت ہے کہ یہود و نصاریٰ جب اپنے عبادت گھروں میں داخل ہوئے تو اپنے رب کے ساتھ شریک کرتے تو ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اس کی وحدانیت بیان کیا کریں۔ (ابن المنذر، تفسیر در منثور)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آیت وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا سے مراد ہے کہ یہود اور نصاریٰ جب اپنی عبادت گاہوں اور گرجاگھروں میں داخل ہوتے تو اللہ کے ساتھ شرک کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں تو عبادت خالص اللہ کے لیے کرو۔ (تفسیر در منثور)

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیر اللہ کے لیے ہر طرح کے سجدے کرنے کی ممانعت ہو جاتی ہے سجدہ عبادت کا ہو یا سجدہ تعظیمی ہو ان سب سجدوں کی ممانعت ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی سجدہ جائز اور مباح نہیں ہے پہلے تو بادشاہوں میں رسم تھی کہ دربار میں آنے والے ان کو سجدے کیا کرتے تھے اور اب بہت سے پیروں اور فقیروں نے یہ طریقہ نکال رکھا ہے کہ مرید ان کے پاس آتے ہیں یا رخصت ہوتے ہیں تو انہیں سجدہ کرتے ہیں یہ حرام ہے اور شرک ہے۔ (انوار البیان)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں چھ مسائل بیان فرمائے ہیں مساجد سے کیا مراد ہے؟ مسئلہ نمبر ①۔ اس آیت کا تعلق قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ کے ساتھ ہے یعنی کہہ دو، میری طرف وحی کی گئی ہے کہ مساجد اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں خلیل نے یوں تقدیر کلام کی ہے، لِاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ کیونکہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، بیوت سے مراد وہ مقامات ہیں جو ادیان کے حاملین عبادت کے لیے بناتے ہیں۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قَالَتِ الْجِنُّ كَيْفَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَ الْمَسَاجِدَ وَنَشْهَدَ مَعَكَ الصَّلَاةَ وَنَحْنُ نَائُونَ عَنْكَ؟ فَنَزَلَتْ: وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ، جن نے کہا کہ ہمارے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مساجد میں آئیں اور آپ کے ساتھ نماز پڑھیں جب کہ ہم تو آپ سے دور ہوتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت بجالانے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے کہا: اس سے مراد تمام جگہیں ہیں کیونکہ ساری زمین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسجد ہے۔ آپ فرماتے ہیں تم جہاں بھی ہو نماز پڑھ لو۔ تم جہاں بھی نماز پڑھو گے وہ مسجد ہے۔ صحیح میں ہے وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، میرے لیے زمین مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنادی گئی ہے۔

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور طلق بن حبیب رضی اللہ عنہ نے کہا، مساجد سے مراد وہ اعضاء ہیں جن پر بندہ سجدہ کرتا ہے وہ دو قدم، دو گھٹنے، دو ہاتھ، اور چہرہ ہے۔ هٰذِهِ الْأَعْضَاءُ أَنْعَمَ اللهُ بِهَا عَلَيْكَ، فَلَا تَسْجُدْ لِغَيْرِهِ بِهَا، فَتَجْحَدَ نِعْمَةَ اللهِ، یہ اعضاء ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر انعام کیا ہے تو ان اعضاء کے ساتھ غیر کو سجدہ نہ کر اگر تو ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرے گا۔

عطاء رحمۃ اللہ نے کہا، مَسَاجِدُكَ سے مراد تیرے وہ اعضاء ہیں جن کے بارے میں تجھے حکم دیا گیا کہ تو ان پر سجدہ کرے، تو انہیں خالق کے سوا کے لیے ذلیل نہ کر۔ صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، أُمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ: الْجَبْهَةِ وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى أَنْفِهِ وَالْيَدَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَأَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں، پیشانی اور اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنے اور دونوں کندھوں کی طرف۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهُ سَبْعَةُ آرَابٍ، جب بندہ سجدہ کرے تو اس کے ساتھ اس کے سات اعضاء سجدہ کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے الْمَسَاجِدُ هِيَ الصَّلَوَاتُ، أَيْ لِأَنَّ السُّجُودَ لِلّٰهِ، مساجد سے مراد نمازیں ہیں کیونکہ سجدے اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الْمَسَاجِدُ هُنَا مَكَّةُ الَّتِي هِيَ الْقِبْلَةُ وَسُمِّيَتْ مَكَّةَ الْمَسَاجِدِ، لِأَنَّ كُلَّ أَحَدٍ يَسْجُدُ إِلَيْهَا. یہاں مساجد سے مراد مکہ ہے جو قبلہ ہے مکہ مکرمہ کو مساجد کا نام دیا کیونکہ ہر ایک اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتا ہے پہلا قول ان تمام اقوال سے زیادہ نمایاں ہے۔

مسجد حرام اور مسجد نبوی کی فضیلت۔ مسئلہ نمبر ②۔ للہ میں اضافت شرف اور رتبہ کے اظہار کے لیے ہے، پھر ان مساجد میں سے بیت عتیق کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (الحج: ۲۶) میرے گھر کو پاک کرو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، لَا تُعْمَلُ الْمَطِيُّ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، سواریوں کو تین مساجد کے علاوہ کسی مسجد کے لیے کام میں نہ لایا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، میری اس مسجد میں پڑھی جانے والی ایک نماز مسجد حرام کے سوا باقی تمام مسجدوں میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔

ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا، ایک سند سے یہ روایت مروی ہے جس میں کوئی کجی نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا باقی مساجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے کیونکہ مسجد حرام میں پڑھی جانے والی ایک نماز میری مسجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے اگر یہ صحیح ہو تو مسجد حرام کی فضیلت میں یہ ایک نص ہو گی۔

مساجد کی اضافت غیر کی طرف کرنے کا جواز۔ مسئلہ نمبر ③۔ مساجد اگرچہ ملک اور شرافت کے اظہار کے لیے اللہ کی ہیں تاہم علامت کے طور پر غیر کی طرف بھی منسوب ہوتی ہیں تو کہا جاتا ہے، مسجد فلاں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ضامر گھوڑوں میں حیفاء سے ثنیۃ الوداع تک دوڑ کرائی اور جن گھوڑوں کو ضامر نہیں بنایا جاتا تھا اس کی دوڑ ثنیہ سے مسجد بنی زریق تک کرائی۔ یہ اضافت

محلیت کے اعتبار سے ہے گویا وہ محل ان کے قبلہ میں ہے بعض اوقات ان کے وقف کرنے کے اعتبار سے ہوتی ہے پل اور قبرستانوں کے خاص کرنے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں اگرچہ دوسری چیزوں کی تخصیص میں اختلاف ہے۔

مسجد میں کون سے کام جائز ہیں؟ مسئلہ نمبر ④۔ مساجد اللہ کے لیے ان میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا جاسکتا تاہم ان میں اموال کی تقسیم جائز ہے، ان میں صدقات رکھنا بھی جائز ہے، یہ سب مساکین میں مشترک ہے اور ان میں جو آئے وہ اس سے کھالے، اس میں مقروض کو روک لینا بھی جائز ہے، اس میں قیدی کو باندھ دینا بھی جائز ہے، اس میں سونا بھی جائز ہے مریض کا رہنا جائز ہے، پڑوسی کا اس میں دروازہ کھولنا جائز ہے، شعر جب باطل سے پاک ہو تو اس کا پڑھنا جائز ہے۔

اس آیت کے نزول کا سبب۔ مسئلہ نمبر ⑤۔ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَداً۔ مسجد حرام میں مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اس پر انہیں شرمندہ کرنا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ كَانَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى إِذَا دَخَلُوا كَنَائِسَهُمْ وَبِيَعَهُمْ أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ، فَأَمَرَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ وَالْمُؤْمِنِينَ أَنْ يُخْلِصُوا لِلّٰهِ الدَّعْوَةَ إِذَا دَخَلُوا الْمَسَاجِدَ كُلَّهَا، یہود اور نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں داخل ہوتے تو اللہ کے ساتھ شرک کرتے اللہ نے اپنے نبی کو اور مومنوں کو حکم دیا کہ وہ جب مساجد میں داخل ہوں تو عبادت کو اللہ کی ذات کے لیے خالص کریں، مسجدوں میں کسی بت وغیرہ کی پوجا نہ کریں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ الْمَعْنَى أَفْرِدُوا الْمَسَاجِدَ لِذِكْرِ اللّٰهِ، وَلَا تَتَّخِذُوهَا هُزُوًا وَمَتْجَرًا وَمَجْلِسًا، وَلَا طُرُقًا، وَلَا تَجْعَلُوا لِغَيْرِ اللّٰهِ فِيهَا نَصِيبًا، اس سے مراد یہ ہے کہ مسجدوں کو اللہ کے لیے خالص کرو، انہیں ہنسی مذاق کی جگہ، تجارتی منڈی، بیٹھنے کی جگہ اور راستہ نہ بنائیں اور ان مساجد میں غیر اللہ کے لیے حصہ نہ بنائیں۔

صحیح کی حدیث ہے، آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ نَشَدَ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهَذَا، جو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرے تو تم یہ کہو، اللہ تعالیٰ اسے تم پر نہ لوٹائے کیونکہ مساجد اس کے لیے نہیں بنائی گئیں۔

مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے نکلنے کی دعا۔ مسئلہ نمبر ⑥۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا، فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ كَانَ إِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى، جب نبی کریم ﷺ مسجد میں داخل ہوتے تو اپنا دایاں پاؤں آگے رکھتے تھے۔

اور یہ آیت پڑھتے تھے وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللهِ أَحَداً، اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں تم اللہ کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔ اور یہ دعا پڑھتے تھے اَللّٰهُمَّ أَنَا عَبْدُكَ وَزَائِرُكَ وَعَلَى كُلِّ مَزُورٍ حَقٌّ وَأَنْتَ خَيْرُ مَزُورٍ فَأَسْأَلُكَ بِرَحْمَتِكَ أَنْ تَفُكَّ رَقَبَتِي مِنَ النَّارِ، اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرا زائر ہوں، ہر زیارت کیے جانے والے پر حق ہے اور تو بہترین زیارت کیے جانے والوں میں سے ہے۔ میں تیری رحمت کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری گردن کو آگ سے آزاد کر دے۔

اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ فَإِذَا خَرَجَ مِنَ الْمَسْجِدِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرَى، جب نبی کریم ﷺ مسجد سے باہر نکلتے تو اپنا دایاں پاؤں آگے رکھتے اور یہ دعا کرتے، اَللّٰهُمَّ صُبَّ عَلَيَّ الْخَيْرَ صَبًّا وَلَا تَنْزِعْ عَنِّي صَالِحَ مَا أَعْطَيْتَنِي أَبَدًا وَلَا تَجْعَلْ مَعِيشَتِي كَدًّا، وَاجْعَلْ لِي فِي الْأَرْضِ جَدًا، اے اللہ! مجھ پر بھلائی کو انڈیل دے انڈیل دینا، جو تو نے مجھے اچھائی عطا کی ہے کبھی بھی مجھ سے نہ چھین، میری زندگی کو مخصوص مشقت نہ بنا دے اور زمین میں میرے لیے غنا مقدر کر دے۔ (تفسیر قرطبی)

آج دکھ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری بعض مسجدوں میں کچھ وہ لوگ جو اپنے کو عاشقانِ رسول کہتے ہیں وہ اللہ کے نبیوں اور ولیوں کو پکارتے ہیں، ایسا کرنے میں وہ بہت فخر محسوس کرتے ہیں،

مجھے یاد ہے ایک بار میں ایک مسجد میں لوگوں کو اسی آیت کے ذیل میں سمجھا رہا تھا کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں ان میں اللہ ہی کو پکارا جائے، کسی نبی اور ولی کو مسجدوں میں نہ پکارا جائے۔

میں نے بڑے زور دار انداز میں لوگوں سے عرض کیا کہ دیکھیں! آج جن مسجدوں سے اللہ کو پکارا جانا چاہیے تھا ان سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں امداد کن امداد کن، از ہر غم آزاد کن، در دین و دنیا شاد کن یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ، میرے انہی الفاظ پر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، پوری مسجد میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی تھی۔

عبادت کے لیے قیام نبوی اور جنات کا اجتماع

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا {۱۹} قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا {۲۰} قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا {۲۱} قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا {۲۲} اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا {۲۳} الجن.

جواب ترجمہ: اور یہ کہ: جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو ایسے معلوم ہوا جیسے یہ لوگ اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ کہہ دو کہ: میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں، اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں مانتا۔ کہہ دو کہ: نہ تمہارا کوئی نقصان میرے اختیار میں ہے، اور نہ کوئی بھلائی۔ آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور میں ہر گز اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پا سکتا۔ لیکن اللہ کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغاموں کو ادا کرنا میرا کام ہے اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو بیشک اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جنات نے جب وادی نخلہ میں حضور ﷺ کی زبانی تلاوت قرآن

سنی تو اس طرح آگے بڑھ بڑھ کر عقیدت کا اظہار کرنے لگے کہ گویا ایک دوسرے کے سروں پر چڑھے چلے جاتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنات اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ کے اصحاب کی اطاعت و چاہت کی حالت یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں اور اصحاب پیچھے ہوتے ہیں تو برابر اطاعت واقتداء میں آخر تک مشغول رہتے ہیں گویا ایک حلقہ ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی توحید کا اعلان لوگوں میں کرتے ہیں تو کافر لوگ دانت چبا چبا کر الجھ جاتے ہیں، جنات وانسان مل جاتے ہیں کہ اس امر دین کو مٹادیں اور اس کی روشنی کو چھپالیں مگر اللہ کا ارادہ اس کے خلاف ہو چکا ہے، یہ تیسرا قول ہی زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ میں تو صرف اپنے رب کا نام ورد زبان رکھتا ہوں اور کسی اور کی عبادت نہیں کرتا، یعنی جب دعوت حق اور توحید کی آواز ان کے کان میں پڑی جو مدتوں سے غیر مانوس ہو چکی تھی تو ان کفار نے ایذاء رسانی مخالفت اور تکذیب پر کمر باندھ لی حق کو مٹا دینا چاہا اور رسول اللہ ﷺ کی عداوت پر سب متحد ہو گئے۔

اس وقت ان سے رسول ﷺ نے کہا کہ میں تو اپنے پالنے والے (وحدہ لاشریک لہ) کی عبادت میں مشغول ہوں میں اسی کی پناہ میں ہوں اسی پر میرا توکل ہے وہی میرا سہارا ہے مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ رکھو کہ میں کسی اور کے سامنے جھکوں یا اس کی پرستش کروں، میں تم جیسا انسان ہوں تمہارے نفع نقصان کا مالک میں نہیں ہوں، میں تو اللہ کا ایک غلام ہوں اللہ کے بندوں میں سے ایک ہوں، تمہاری ہدایت ضلالت کا مختار ومالک میں نہیں سب چیزیں اللہ کے قبضے میں ہیں میں تو صرف پیغام رساں ہوں، اگر میں خود بھی اللہ کی معصیت کروں تو یقیناً اللہ مجھے عذاب دے گا اور کسی سے نہ ہو سکے گا کہ مجھے بچالے، مجھے کوئی پناہ کی جگہ اس کے سوا نظر ہی نہیں آتی، میری حیثیت صرف مبلغ اور رسول کی ہے۔

بعض تو کہتے ہیں الا کا استثنا (لا املک) سے ہے یعنی میں نفع و نقصان ہدایت و ضلالت کا مالک نہیں، میں تو صرف تبلیغ کرنے والا، پیغام پہنچانے والا ہوں۔

اور ہو سکتا ہے کہ (لن یجیرنی) سے یہ استثناء ہو یعنی اللہ کے عذابوں سے مجھے صرف میری رسالت کی ادائیگی ہی بچا سکتی ہے، جیسے اور جگہ ہے یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ (المآئدہ:٦٧) اے رسول! آپ کی طرف جو آپ کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اسے پہنچا دیں اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچالے گا۔

نافرمان کے لئے ہمیشہ والی جہنم کی آگ ہے جس میں سے نہ نکل سکیں نہ بھاگ سکیں۔ جب یہ مشرکین جن وانس قیامت والے دن ڈراؤنے عذابوں کو دیکھ لیں گے اس وقت ظاہر ہو جائے گا کہ کمزور مددگاروں اور بے وقعت گنتی والوں میں کون کون شامل تھا؟ یعنی مومن موحد یا یہ مشرک، حقیقت یہ ہے کہ اس دن مشرکوں کا برائے نام بھی کوئی مدد کرنے والا نہیں ہو گا اور اللہ کے لشکروں کے مقابلہ پر ان کی گنتی بھی کچھ نہ ہو گی۔

قیامت کے دن سب پتا چل جائے گا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا {٢٤} قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا {٢٥} الجن

جواب ترجمہ: یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو اس وقت جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور تر ہیں اور عدد کے اعتبار سے کس کی جماعت کم ہے۔ آپ

فرمادیجئے میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا میرے رب نے اس کے لیے کوئی مدت دراز مقرر فرمارکھی ہے۔

نبیوں کو کمزور سمجھنے والے، نبیوں کے پیروکاروں کو کمزور سمجھنے والے، انہیں نظر حقارت سے دیکھنے والے اس دنیا میں بڑی اکڑفوں میں رہتے ہیں، تکبر کرتے اور غرور میں مبتلا رہتے ہیں، دنیا میں یہ سلسلہ چلتا آیا ہے اور شاید چلتا ہی رہے گا، مخالفین مخالفت کرتے رہیں گے، شرک کرتے رہیں گے، حق سے اعراض کرتے رہیں گے، تمسخر اور استہزا کرتے رہیں گے، تکالیف دیتے رہیں گے اور ستاتے رہیں گے، لیکن جب وعدہ کا وقت آن پہنچے گا، ہنگامہ یوم النشور بپا ہو جائے گا تو اس وقت انہیں پتا چلے گا کہ کمزور کون ہے اور طاقت ور کون ہے؟ لشکر وسپاہ کس کے پاس زیادہ ہیں اور کس کے پاس کم ہیں۔

دنیوی مال ومتاع کی کمی کے باعث نبیوں اور ان کے پیروکاروں کو کمزور سمجھنے والوں کو اس دن پتا چلے گا کہ کمزور کون ہے؟ تعداد کس کی کم ہے؟ کیونکہ دولت ایمان وایقان کے بغیر مال کی کثرت اور دولت کی ریل پیل کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔

ایمان وایقان کی دولت جس کے پاس ہوگی وہ مال ومتاع، سازوسامان کے بغیر بھی کامیاب وکامران ہوگا، نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں لیے لوگوں کو اپنی کامیابی کا پروانہ دکھاتا ہوا جنت کی طرف چل پڑے گا، جب کہ ایمان کی دولت سے محروم شخص ہر چیز سے محروم ہو جائے گا، اگر وہ دنیا میں تاج سلطانی سجائے پھرتا تھا تو وہاں ایمان کے بغیر یہ کام نہیں آئے گا، اگر دنیا میں وہ لشکر وسپاہ کا سربراہ تھا تو ایمان وایقان کے بغیر آخرت میں یہ مفید نہیں، وہاں کف افسوس ملتا پھرے گا، کہ اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے، سب کچھ غارت ہو چکا ہے۔

یہاں قوت، طاقت، جتھوں کے بل بوتے پر انکار حق کرنے والے آخرت میں سخت پچھتائیں گے، افسوس کریں گے، انگشت بدنداں ہوں گے ہمیں یہاں اب مال کام آئے گا نہ لشکر وسپاہ، نہ اولاد کام آئے گی نہ دوست یار، اسی وقت نتارا ہو جائے گا کہ کون ٹھیک تھا اور کون خطا پر تھا، مگر کیا فائدہ ہوگا۔

علمُ الغیب، اِطلاعِ غیب

سوال کیا اللہ تعالیٰ کسی پر غیب کو ظاہر کرتا ہے؟ ان آیات کی روشنی میں واضح کریں۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ الجن.

جواب ترجمہ: وہ غیب کا جاننے والا ہے سو اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا۔ سوائے کسی پیغمبر کے جسے اس نے (اس کام کے لیے) پسند فرمالیا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے کچھ محافظ لگا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس شخص پر غیب ظاہر کرتا ہے جسے اپنی پیغام رسانی کے لیے چن لیا ہو اور پسند کر لیا ہو، اس کے علاوہ کسی کے لیے ظاہر نہیں کرتا، ان آیات میں اللہ تعالیٰ اسی بات کو واضح فرمارہے ہیں، اللہ تعالیٰ جل شانہ نگاہوں سے پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے، وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دیتا، ہاں وہ لوگ جن کو اللہ نے چن لیا ہے یا جنہیں پسند کر لیا ہے ان کو اس غیب میں سے کچھ کی اطلاع دے دیتا ہے، وہ بھی اس طرح کہ اس غیبی علم کے ساتھ فرشتوں کا حفاظتی دستہ روانہ کرتا ہے، جو جنات کی کارستانیوں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ کہیں وہ کوئی چیز اس میں سے لے نہ اڑیں۔ پھر وہ انہیں کاہنوں تک پہنچا کر کوئی شیطانی کھیل نہ کھیلیں۔

قرآنی کریم میں متعدد بار لفظ غیب کا استعمال ہوا ہے، غیب کا معنیٰ ہے جو چیز پوشیدہ ہو، جو چیز حاضر نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز غائب، پوشیدہ اور مخفی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کو اس معنیٰ میں عالم الغیب کہا جاتا ہے کہ جو چیز لوگوں سے اور باقی مخلوقات سے مخفی اور پوشیدہ ہوتی ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے، اس سے کوئی چیز پوشیدہ اور مخفی نہیں ہوتی۔

غیب کا معنیٰ و مفہوم: ابو منصور عبد المالک بن محمد الثعالبی غیب کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غیب ہر وہ چیز ہے جو آنکھوں سے غیب ہو، اگرچہ دلوں میں حاصل ہو (فقہ اللغہ) امام لغت ابو الفتح

ناصر بن عبد السید المطرزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیب وہ چیز ہے جو آنکھوں سے غائب ہو اگرچہ قلوب میں حاصل ہو۔(مغرب)امام محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیب وہ چیز ہے جو تجھ سے غائب ہو۔(مختار الصحاح)مجد الدین فیروزآبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیب ہر وہ چیز ہے جو تجھ سے غائب ہو۔(القاموس)مرتضیٰ الزبیدی الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں غیب ہر وہ چیز ہے جو آنکھوں سے غائب ہو، برابر ہے کہ دلوں میں حاصل ہو یا حاصل نہ ہو۔(تاج العروس)

قرآن کریم کی آیت یومنون بالغیب کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یعنی جو چیز ان سے غائب ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خبر دی ہے وہ غیب ہے مثلاً بعث، جنت اور نار اور ہر وہ چیز جو ان کی نگاہوں سے اوجھل مگر ان کو آپ نے اس کی خبر دی ہے۔(ازالۃ الریب للشیخ صفدر)علامہ ابو الفضل محمد بن عمر الجمال القرشی فرماتے ہیں کہ کسی چیز کا ظاہر نہ ہونا غیب کہلاتا ہے۔(صراح)

امام اہل سنت مولانا سرفراز خان رحمہ اللہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ازالۃ الریب میں ائمہ لغت سے منقول غیب کی تعریفات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ائمہ لغت نے ان عبارات میں غیب کی جو تعریف کی ہے وہ اس بات کو ملحوظ رکھ کر کی ہے کہ غیب کا تعلق جو ناپدید شدن یا غائب ہونے کی ہے وہ مخلوق کی بہ نسبت ہے نہ کہ خالق کی بہ نسبت اور وہ العیون(آنکھوں) القلوب(دلوں) اور عنک وغیرہ الفاظ سے اسی حقیقت کو آشکارا کرنا چاہتے ہیں، اگرچہ ان عبارات کے پیش نظر غیب کے مفہوم میں بعض صورتوں میں جزوی طور پر کچھ اختلاف ہو گا مگر اصل مسئلہ پر اس کی کوئی زد نہیں پڑتی جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔(ازالۃ الریب)

اہل علم نے غیب کا اصطلاحی معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ غیب اسے کہتے ہیں جو حواس خمسہ (انسانی پانچ حواس) اور عقلی ہدایت یعنی غور و فکر کے بغیر معلوم نہ ہو وہ غیب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات، انسان اللہ کی ذات کو حواس خمسہ (پانچ حواس) سے نہیں جان سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو غور و فکر سے نہیں جانا جاسکتا، ہاں غور و فکر سے یہ پتا چلایا جاسکتا ہے کہ یہ کائنات ہستی رواں دواں ہے، اس میں نت نئے

نئے حادثات رونما ہورہے ہیں، نبض ہستی چل رہی ہے تو اسے چلانے والا بھی تو کوئی ہو گا، جیسے چرخہ کاتنے والی کا دماغ اس طرف اس وقت متوجہ ہو گیا تھا کہ جب میرا چرخہ میرے چلائے بغیر نہیں چلتا تو کائنات کو چلانے والے کے بغیر کیسے چل سکتی ہے۔

کائنات میں جب حوادث وواقعات رونما ہورہے ہیں تو یقیناً انہیں رونما کرنے والا کوئی ہو گا، وہی ذات ہے جسے اللہ کہا جاتا ہے، تو غور وفکر کرنے سے اللہ معلوم ہو گیا، غور وفکر کے بغیر اللہ معلوم نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ ذات غیب ہے۔

حواس خمسہ سے مراد انسان کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے والے پانچ حواس، جس طرح ان حواس سے اللہ کو نہیں جانا جاسکتا، اسی طرح اللہ کی بنائی ہوئی جنت کو نہیں جانا جاسکتا، دوزخ کو نہیں جانا جاسکتا، اسی طرح غور وفکر کے بغیر بھی ان چیزوں کو نہیں جانا جاسکتا، ہاں غور وحوض کے بعد انہیں جانا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جو لوگ اچھائی کرتے ہیں، برائی سے بچتے ہیں ان کا صلہ انہیں ملنا چاہیے، برائی اور شرارت کرنے والوں کو سزا ملنا چاہیے تو یہ کام اس جہاں میں ہوں گے، اچھائی اور بھلائی کا صلہ جنت اور برائی کا صلہ دوزخ ہے، تو جنت ودوزخ غور وفکر سے معلوم کی جاسکتی ہیں، بدون غور وفکر جنت ودوزخ معلوم نہیں ہو سکتیں، اس لیے جس طرح اللہ کی ذات غیب ہے، جنت اور دوزخ بھی غیب ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”علم غیب کے معنیٰ لغت میں تو کسی مخفی شے کے جان لینے کے ہیں لیکن شریعت میں علم غیب کا لفظ لغت نہیں بلکہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ چھپی ہوئی یا غائب اشیاء کے جان لینے کے نہیں بلکہ اس علم کے ہیں جو عادی وسائل کے واسطہ کے بغیر خود بخود حاصل ہو، یعنی وہ اسباب عادیہ سے غائب ہو اور جو ان کے ذریعہ نمایاں نہ ہو۔

مثلاً ہم حواس خمسہ کے ذریعہ محسوسات کا علم حاصل کریں تو اسے علم غیب نہیں کہا جائے گا، گو علم سے پہلے محسوسات ہم سے غائب اور مخفی نہیں اور بلحاظ لغت ان کے علم کو علم غیب کہنے کی گنجائش ہے، لیکن پھر بھی اصطلاحی علم غیب نہ ہو گا، کیونکہ ان محسوسات کا علم ہم نے ان اسباب کے ذریعہ حاصل کیا جو عادتاً اس علم کے حصول کے قدرتی اسباب ہیں، یا مثلاً ہم نے سوچ بچار عقل و تدبر اور فکر و نظر سے چند نامعلوم نتائج معلوم کر لیے جو بلاشبہ ہمارے لحاظ سے غیب تھے لیکن نہیں کہا جائے گا کہ ہمیں علم غیب حاصل ہو گیا، کیونکہ ان نتائج کا ادراک ہمیں فکر و نظر اور سوچ بچار کے وسیلہ سے ہوا، جو اس کام کے حاصل کرنے کے طبعی اسباب مانے جاتے ہیں اور اسباب طبعیہ کے توسط سے جو علم حاصل ہوا سے اصطلاح میں علم غیب نہیں کہا جاتا۔

یا مثلاً تجربہ سے ہمیں بہت سی مخفی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو ناتجربہ کاروں کو معلوم نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی ان مخفیات (پوشیدہ باتوں) کے علم کو علم غیب نہیں کہیں گے کیونکہ تجربہ خود آلات علم میں سے ہے، جو عادتاً تجرباتی علوم کے لیے بطور سبب اور وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے۔

یا مثلاً اہل اللہ اور اولیائے کرام کو کشف والہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے جو یقیناً ایک مخفی امر تھا تو لغتاً تو اسے علم غیب کہہ سکیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا، لیکن شرعاً علم غیب نہ کہیں گے کیونکہ کشف والہام بھی بہر حال حصول علم کا ایک قدرتی اور عادی وسیلہ ہے جو مخصوص افراد کو دیا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے اسرار پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ (علم غیب ۱۳، ۱۲)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں "بہر حال علم کے حسّی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے، ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہو گا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلاواسطہ اسباب از خود ہو، تو حاصل یہ نکل آیا کہ علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کے لیے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر خدا کو جب بھی علم ہو گا اور جیسا بھی ہو گا وہ عطاء الٰہی ہو گا، اور مذکورہ وسائل میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطہ

سے ہو گا، خواہ وحی سے ہو یا کشف والہام سے، تجربے سے ہو یا حواس سے، یا عقل وخرد سے یعنی ظاہری وسائل کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے۔

اس لیے علم غیب خاصہ خداوندی نکل آتا ہے اور نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ کسی بھی بشر کو علم غیب حاصل نہیں جبکہ کوئی بھی غیر اللہ بلاتوسط اسباب خود بذاتہ عالم (الغیب) نہیں ہو سکتا، خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، ملائکہ ہوں یا ارواح قدسیہ، یہ الگ بات ہے کہ انبیاء اور بالخصوص سردار انبیاء ﷺ کا علم تمام مخلوقات کے علم سے بدرجہا زائد اور فائق ہے، اس لیے کسی پیغمبر پر بھی عالم الغیب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن حکیم نے علم غیب کو حصر کے ساتھ جگہ جگہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف منسوب اور اسی کے ساتھ مخصوص بتلایا ہے۔ (علم الغیب ۱۴)

غیب کی اقسام: غیب کی دو اقسام ہیں، ایک ذاتی اور دوسرا عطائی۔ مولانا غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں "ایک وہ غیب ہے، جس کو جاننے کا کوئی سبب اور ذریعہ ہو، خواہ اس کا سبب عقل ہو یا اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی دی ہوئی خبر ہو، مثلاً ہم نے جنت اور دوزخ کے وجود کو عقل کے ذریعہ جانا، لیکن جنت میں ثواب کی تمام تفاصیل اور دوزخ میں عذاب کی تمام اقسام کو محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا، ان کے علم کا ذریعہ صرف اللہ تعالیٰ کی وحی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں پر وحی فرماتا ہے اور انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کو خبر دیتے ہیں۔

اور غیب کی دوسری قسم وہ ہے جس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اس غیب کو عقل سے جانا جاسکتا ہو نہ وحی سے، جیسے اللہ تعالیٰ کے علوم غیر متناہیہ، ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور مخلوق کے لیے اس کے علم کی کوئی سبیل نہیں ہے، اس غیب کو ذاتی کہتے ہیں۔ اور غیب کی پہلی قسم کو غیب عطائی کہتے ہیں، دوسری قسم کو علم غیب ذاتی کہتے ہیں، اس کی یہ تعریف بھی ہے کہ جو غیب تعلیم اور بتانے کے بغیر ہو وہ غیب ذاتی ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے غیر پر عالم الغیب کا اطلاق جائز نہیں۔ (تبیان القرآن)

قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایسے کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم غیب کا ذکر کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ عالم الغیب ذات فقط اللہ ہی کی ہے، ارشادفَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ (۲۰)(یونس)تو کہہ دے غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ(النمل ۶۴) آپ فرمادیجیے، خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ۔ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ(سورۃ ھود)اور اللہ ہی کے پاس ہے چھپی ہوئی بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف رجوع ہے ہر چیز کا۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (الانعام ۵۹)اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا۔وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ(۱۸۸) (الاعراف)اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کرلیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی۔

حکیم الاسلام قاری طیب رحمہ اللہ ان آیات کے تحت لکھتے ہیں ”پہلی آیت میں مثبت انداز میں انما کے ساتھ علم غیب کا اثبات صرف اللہ کے لیے کیا گیا جو حصر کا کلمہ ہے، دوسری میں نفی عام کے بعد استثنائی کلمہ سے علم غیب کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا جو حصر کی ترکیب ہے، تیسری آیت میں تقدیم خبر تاخیر مبتدا کے ساتھ مرجع الامر اور عالم الغیب صرف ذاتِ حق کو بتلایا گیا جو حصر کا اسلوب ہے اور چوتھی آیت میں سید الاولین والآخرین نے حکماً اور مامور ہو کر اپنے سے علم غیب کی نفی فرمائی اور جب آپ کو ہی علم غیب نہیں جو کمالات بشری کے منتہا اور خاتم ہیں تو مخلوقات میں کون رہ جاتا ہے جس کے لیے یہ کمال ثابت کیا جائے۔

اس لیے نتیجتاً علم غیب کا استحقاق اور ثبوت حصر کے ساتھ صرف حق تعالیٰ کے لیے ہی رہ جاتا ہے اور حاصل یہ نکل آیا کہ عطائے علم حقیقی علم غیب نہیں ہو سکتا، اس لیے ثابت ہوا کہ قرآنی تصریحات کے مطابق علم غیب صرف اللہ رب العزت کو ہے اور کسی کو نہیں۔ (علم الغیب، ۱۴، ۱۵)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اس سے دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ علم غیب کا لفظ مخفیات اور مغیبات ہی کے ساتھ خاص نہ ہو گا جبکہ اس کے معنیٰ مخفی ہی شے کے جاننے کے نہیں بلکہ بلا سبب وبالذات جاننے کے ہیں، خواہ وہ چھپی ہوئی ہو یا کھلی ہوئی، اس لیے آسمان وزمین کا جاننا، ذروں اور ستاروں کا علم اور ستارے کی حرکات کا علم بھی علم غیب ہو سکتا ہے، اگر بلا توسط اسباب عادیہ ہو یعنی عطاء غیر نہ ہو بلکہ ذاتی ہو اور ظاہر ہے کہ علم کسی وسیلہ اور ذریعہ کا محتاج نہیں بلکہ ذاتی ہے، اس لیے جو اپنے ذاتی علم سے جو چیز بھی جانتا ہے شرعاً اسے علم غیب کہیں گے خواہ وہ شے معلوم لغوی غیب ہو یعنی مخفی ہو یا لغوی شاہد ہو یعنی مشاہد ہو، غرض نہاں وعیاں سب کے علم کو علم غیب کہیں گے جبکہ وہ بالذات ہو نہ کہ محض مخفی شے کے علم کو علم غیب کہا جائے گا ورنہ ظاہر ہے کہ کسی شے کا غیب یا مخفی ہونا ہمارے لحاظ سے ہے نہ کہ حق تعالیٰ کے لحاظ سے کہ اس کے سامنے تو ہر چیز ہمہ وقت حاضر اور عیاں ہے، اگر چھپی ہوئی اور اوجھل شے کے جاننے کا نام علم غیب ہوتا تو حق تعالیٰ کو کسی وقت بھی عالم الغیب نہ کہہ سکتے کہ وہاں کوئی چیز بھی غیب یعنی مخفی اور اوجھل ہے ہی نہیں، اس سے واضح ہے کہ ذات حق میں علم غیب کے معنیٰ مخفیات کے علم کے نہیں بلکہ بالذات علم کے ہیں جو اسباب عادیہ کے واسطہ کے بغیر اور ان سے بالاتر ہو کر محض ذات سے ہو اور ذات ہی علوم کے لیے منشاء انکشاف ہو اور یہ صرف اسی کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے۔ (علم الغیب)

علامہ سید نور الحسن شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”علم غیب، علم کل، علم محیط و علم بسیط خاصہ خداوندی ہے، اللہ عالم الغیب والشہادہ کے سوا نہ کسی کو علم غیب ہے نہ علم کل، ہر کسی کا علم محدود ہے،

غیر محدود و محیط علم ایک اللہ رب العزت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم قرآن حکیم میں اپنے علم کی وسعت و بیکرانی اور کلیت و ہمہ گیری سے متعلق نہایت بسط و تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور بار بار متعدد اسلوب و انداز سے اپنی ذات واحد کے لیے علم غیب و علم کل کا اثبات فرمایا ہے۔ (توحید اور شرک کی حقیقت ۱۶۷)

شاہ صاحب رحمہ اللہ متعدد آیات اور اسالیب تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں "جہاں اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں اٹھارہ مختلف اسلوب و انداز سے ۳۴۱ بار اپنے لیے صفت علم کا بیان اور علم غیب، علم کل، علم محیط اور علم بسیط کا اثبات فرمایا ہے، وہاں اپنے سوا کسی برگزیدہ سے برگزیدہ مخلوق کسی فرشتہ یا ولی یا نبی حتیٰ کہ امام الانبیاء والمرسلین حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک دفعہ بھی اس کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ الٹا ان سے علم قیامت وغیرہ علوم کی نفی کی ہے، علیٰ ہذا تمام ماسوی اللہ کے لیے علم غیب کی نفی فرمائی ہے۔ (توحید اور شرک کی حقیقت ۱۷۷)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اپنے محبوب و مقبول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے اعلان کرایا، فرمایا قُل لَّا یَعلَمُ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ الغَیبَ اِلَّا اللہ (نمل) آپ کہہ دیجیے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب نہیں جانتا، بجز اللہ تعالیٰ کے۔ زمین و آسمان کی کوئی خاکی، نوری یا ناری مخلوق الغیب نہیں جانتی، غیب اگر جانتا ہے تو صرف ایک اللہ جانتا ہے، علم غیب خاصہ خداوندی ہے، کتنے ظالم ہیں وہ لوگ جو خود اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کا ادعاء باطل کرتے ہیں، جن کی زبان پاک سے اللہ رب العزت نے یہ اعلان کرایا کہ زمین و آسمان میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا مگر اللہ۔ تو عالم الغیب ہونے کی صفت اللہ رب العزت کے ساتھ خاص ہے یہ صفت کسی مخلوق کے لیے ثابت نہیں۔ (توحید اور شرک کی حقیقت)

اطلاع علی الغیب: علم غیب کسی کو حاصل نہیں، غیب کی کنجیاں صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اللہ کی مخلوق کو ان کنجیوں اور ان خزانوں تک رسائی نہیں ہے، ہاں اتنی بات کا قرآن کریم نے ضرور ذکر

فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض غیوب پر مطلع فرمادیتے ہیں، ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پر مطلع نہیں کرتے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہیں منتخب فرمالیتے ہیں۔ (سورۃ آل عمران ۱۷۹) عام لوگوں کو بلاواسطہ کسی غیب پر اطلاع نہیں دی جاتی ہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو غیب کی جس بات پر چاہیں اطلاع دے دیتے ہیں (توحید و شرک)

اس مقام پر سورۃ الجن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ (الجن) اللہ عالم الغیب ہے، سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر اپنے کسی چنے ہوئے پیغمبر کو تو اس کے آگے اور پیچھے محافظ (فرشتے) چلاتا ہے۔

تو غیب حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اللہ اپنے برگزیدہ و پسندیدہ رسولوں کو اپنے غیب کی جس بات پر چاہے اطلاع دے دیتا ہے، اور یہ اطلاع بذریعہ وحی ہوتی ہے اور وحی کے ساتھ فرشتوں کا چوکی پہرہ ہوتا ہے۔ (توحید و شرک کی حقیقت ۱۸۲)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”ترجمہ سے آیت کا مفہوم ظاہر ہے، غور اس پر کیجیے کہ اس معجزانہ کلام میں حق تعالیٰ کو یکہ و تنہا بلاشرکت غیرے عالم الغیب ثابت کرنے کی بناء اس پر رکھی گئی ہے کہ وہی تنہا بلاشرکت غیرے اطلاع دہندہ (اطلاع دینے والا) غیب ہے، اس کے بتانے اور ظاہر کرنے سے کسی کو غیب کی اطلاع ہو سکتی ہے، ورنہ کوئی صورت نہیں، وجہ ظاہر ہے کہ کسی شے کا پتہ دینے والا وہی ہو سکتا ہے جس کے علم میں وہ شے ہو اور پتہ لینے والا وہی ہو سکتا ہے جو اس شے اور اس کے علم سے خالی ہو، ورنہ اگر پتہ دینے والا اس سے بھرپور نہ تھا تو اس نے پتہ کس چیز کا دیا؟ اور پتا لینے والا اگر اس سے خالی نہ تھا تو اسے لینے اور دوسرے کے آگے اپنی احتیاجی ظاہر کرنے

کی کیا ضرورت تھی؟ اس لیے حق تعالیٰ کا اطلاع دہندہ غیب (غیب کی اطلاع دینے والا) ہونا، اس کے عالم الغیب ہونے کی دلیل نکلتا ہے۔

گویا ابتدا آیت میں کلمہ عالم الغیب ایک دعویٰ ہے اور فلا یظھر اس کی دلیل ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ اطلاع دہی اسی کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ آیت کا نظم اور انداز بیان بتلا رہا ہے تو عالم الغیب ہونا بھی لامحالہ اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیے جو آیت کا مدعا ہے۔ پس آیت کے منطوق کا حاصل یہ نکلا کہ وہی یکہ و تنہا عالم الغیب ہے اور وہی بلا شرکت غیرے اطلاع دہندہ غیب ہے۔ (علم غیب ۲۳)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ آگے چل کر لکھتے ہیں "علی غیبہ کے کلمہ سے غیب کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اور بالفاظ دیگر غیب کو اپنی ذاتی چیز بتلا کر واضح فرما دیا کہ وہ اطلاع دہندہ غیب اور عالم الغیب اس لیے ہے کہ اس نے کسی سے اطلاع پا کر غیب کی اطلاع نہیں دی اور وہ کسی کے بتائے سکھائے سے غیب دان نہیں ہوا، بلکہ غیب اس کی اپنی ذاتی چیز ہے اور وہ بذاتہ عالم الغیب ہے، بخلاف انبیاء و رسل کے کہ وہ اگر غیب کی باتیں امت کو بتاتے ہیں تو نہ اس لیے کہ یہ غیب ان کی ذات میں تھا یا وہ از خود اس پر ازل سے مطلع تھے، بلکہ اللہ کے بتانے اور سکھانے پر انہوں نے غیبی حقائق پر اطلاع پائی اور اطلاع دی، اس لیے انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو "علم الغیب" نہیں کہہ سکتے کہ ان کا یہ علم بالواسطہ ہے، گو قطعی اور یقینی ہے، اس لیے علی غیبہ کے کلمہ سے واضح ہو گیا کہ ذات خداوندی غیب دان اور اطلاع دہندہ غیب اس لیے ہے کہ غیب اس کی ذاتی چیز ہے اور وہ غیب پر بذاتہ مطلع ہے، جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ (علم غیب ۲۸)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ طویل گفتگو کے بعد فرماتے ہیں کہ "حاصل یہ نکلا کہ جیسے اس آیت میں لفظ من رسول کا تقاضا یہ ہے کہ اطلاع غیب کا متقاضی اور مستحق رسالت کا وصف ہے اور یہ کہ اطلاع غیب منجانب اللہ رسول ہی کو ہونی چاہیے، نہ کہ غیر رسول کو، ایسے ہی لفظ من رسول ہی اس کا بھی متقاضی ہے کہ وہ اطلاع کردہ غیب وصفِ رسالت کے حسبِ حال بھی ہو اور ظاہر ہے کہ رسالت کے

حسبِ حال غیب وہی ہو سکتا ہے جو شرعی احکام اور انہیں مؤثر بنانے والے حوادث سے تعلق رکھتا ہو نہ کہ اگلے پچھلے دنیا کے روزمرہ کے تمام حوادث اور جزئی قصوں سے متعلق ہو، پس وصفِ رسالت اپنے غیر متعلق علوم کا متقاضی نہیں ہے۔

اس سے صاف نکل آیا کہ من رسول کے لفظ کا فطری تقاضا اور قواعد فن کا اقتضاء یہ ہے کہ رسول جمیع غیب پر مطلع نہ ہوں بلکہ اطلاع خداوندی سے صرف اتنے ہی غیب سے باخبر ہوں جو ہدایت ورہنمائی کے لیے ضروری ہو، خواہ وہ حوادث کا علم ہو یا احکام کا، تکوین کا ہو یا تشریع کا، اس لیے خدا اور رسول کے علم کی برابری کا تخیل خواہ وہ کسی بھی نوعیت سے ہو اور خواہ اس پر ذاتی کا عنوان رکھا جائے یا عطائی کا لیبل چسپاں کیا جائے، لفظ من رسول کے تقاضوں کے خلاف، بلکہ ان تقاضوں کی تردید کرنے کے مترادف ہے۔

جس کا منصوبہ وہی باندھ سکتا ہے جو قرآنی اسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو، اس لیے خدا اور رسول میں یہ علمی مساوات کا تخیل اور رسول کے لیے علم ماکان مایکون کا منصوبہ اس آیت سے پادر ہوا ہو جاتا ہے، جو اس آیت کو آڑ بنا کر قائم کیا گیا تھا۔ (علم غیب)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ بہت ہی خوبصورت تعبیر فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ "تعلیم غیب کو اظہار غیب اور اطلاع غیب کے عنوان سے تعبیر فرمایا، عطاء غیب سے نہیں، جس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ رسولوں کو علم کا یہ حصہ بعینہ سپرد نہیں کر دیا جاتا، صرف اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے، جس کے معنیٰ یہ نکلے کہ رسولوں کا یہ علم ذاتی تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ علم غیب کہلائے، عطائی بھی نہیں بن سکتا، بلکہ صرف اطلاعی ہو سکتا ہے کیونکہ اول تو اظہار کے معنیٰ لغت ہی میں عطاء کے نہیں کہ اظہار غیب کو عطائے غیب کہا جائے اور رسولوں کے علم کو عطائی علم کا عنوان دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ عطاء علم کے معنیٰ مخلوق میں اس لیے بھی نہیں بن سکتے کہ عطاء دے دینے کو کہتے ہیں اور دے دینے کی حقیقت کسی شے کو اپنے سے جدا کر کے منتقل کر دینے کی ہے، اپنے پاس رکھ کر اس کی اطلاع کر دینے کو عطاء نہیں کہتے، اور ظاہر ہے کہ علم حق تعالیٰ کی اپنی صفت ہے، اس کا حق تعالیٰ سے جدا ہو کر منتقل ہو جانا محال ہے، ورنہ بصورت منتقلی وہ صفتِ ذات باقی نہیں رہ سکتی جو عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ پس حق تعالیٰ بلاشبہ معطی اور عطاء کنندہ ہیں، مگر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کی حد تک، جو ذات کے اندر نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات یا ذاتیات کے حق میں معطی نہیں ہیں، کہ اپنی ذات دوسرے کو دے کر خدا بنا دیں اور خود معاذ اللہ خدا نہ رہیں یا اپنی صفات اسے دے دیں اور خود معاذ اللہ معرّیٰ عن الصفات (صفات سے خالی) رہ جائیں۔ اسے فلاسفہ اور بندگانِ عقل گوارا کریں، بندگانِ خدا کبھی برداشت نہیں کر سکتے، ہاں! ذات اور ذاتیات کی اطلاع فرما دینا ان کی شانِ کریمی سے بعید نہیں، سو اطلاع کی صورت میں اطلاع کردہ شے ان سے جدا نہیں ہوتی اور دوسرے تک بعینہ نہیں پہنچ جاتی بلکہ اس شے کی مثال اور تصویر پہنچتی ہے، جس کے معنیٰ یہ نکلے کہ اطلاعی علم حکایت علم ہوتا ہے، عین علم نہیں، عین علم اصل عالم کی ذات ہی میں قائم رہتا ہے، کیونکہ عین علم یا اصل علم کے معنیٰ یہ ہیں کہ عالم میں اس کی جڑ اور اس کا منشاء قائم ہے، اور وہ اس کی ذات کا جوہر اور عین ہے جو بلا وسیلہ اور بلا توسطِ اسباب خود بخود اس میں موجزن، ہمہ وقت اس کے سامنے حاضر اور اس میں سے امنڈ تا رہتا ہے۔

جس میں نہ نسیان کا دخل ہے، نہ بھول چوک کا خلل، نہ کہیں سے اسے لانے کی ضرورت ہے، نہ منتقل کرانے کی، جیسے کوئی اپنی ذات کو نہیں بھول سکتا، ایسے ہی اپنی خُوبُو اور اپنی صفاتِ نفس کو بھی نہیں بھول سکتا کیونکہ بھول چوک ہمیشہ باہر سے حاصل شدہ چیز میں ہوتی ہے، جو اپنی اور اپنے قبضہ کی نہ ہو، خود اپنی اندرونی چیزوں میں نہیں ہوتی، یہی شان خالق کے علم کی بھی ہے کہ وہ ذات میں جڑ پکڑے ہوئے ہے، یعنی خود ذات ہی منشاء انکشاف ہے، جس سے علم اس کی ذاتیات میں سے ہے۔ (ایضاً)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "قرآن حکیم نے اپنے اعجازی نظم اور معجزانہ اسلوب بیان سے مسئلہ علم الغیب کو نکھار کر صاف کر دیا اور اس میں کسی شرک پسند کے لیے مشرکانہ واہموں کی گنجائش نہیں چھوڑی، بالخصوص آیت اظہار غیب اس بارے میں ایک جامع ترین ہدایت نامہ ہے، جس نے اس مسئلہ کو ہر قسم کے زمانی، مکانی، ذاتی، عرضی، دوامی اور ہنگامی شرکاء سے بری کر کے اور اللہ کی علمی توحید کو ہر شک وشبہ سے پاک کر کے مسئلہ کے ہر مثبت اور منفی پہلو کو کھول دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً اس نے ① لفظ "عالم الغیب" سے ابتدا کر کے اللہ کے عالم الغیب ہونے کا اعلان کیا۔ ② پھر اسے "اطلاع دہندہ غیب" بتا کر علم غیب کو اس کا خاصہ ثابت کیا، جس سے ہر غیر اللہ سے علم غیب کی نفی ہو گئی۔ ③ پھر "علی غیبہ" کے لفظ سے علم غیب کو اس کا ذاتی علم ثابت کیا، جس سے ہر مخلوق کے حق میں ذاتی علم کی نفی ہو گئی۔ ④ پھر تلقین غیب کو "اطلاعِ غیب" کا عنوان دے کر غیر اللہ کے لیے صرف اطلاعی علم ثابت کیا، جس سے عطائی علم کی مخلوق سے نفی ہو گئی تاکہ خالق کی ذات کسی بھی حصہ علم سے خالی نہ سمجھی جائے۔ ⑤ پھر حق تعالیٰ کے علم غیب کے اثبات کے لیے فعل کے بجائے صفت کا صیغہ (عالم الغیب) استعمال کر کے علم خداوندی کو ازلی، ابدی اور دوامی واستمراری ثابت کیا، جس سے غیر اللہ کے لیے علم دوامی کی نفی ہو گئی، اور مخلوق کا علم ہنگامی اور عارضی ثابت ہوا۔

⑥ پھر "اظہار غیب" کے کلمہ سے اسے غیب کی اطلاع دینے میں فاعل مختار ثابت کیا، جس سے تمام وسائل علم غیب کے اطلاع دہندہ غیب ہونے کی نفی ہو گئی۔ ⑦ پھر ظہور غیب کو "اطلاع خداوندی" کے ساتھ مقید اور منحصر ثابت کر کے ہر استدلالی علم کو علم غیب ہونے سے خارج کیا، جس سے فنی طور پر مستقبل کی باتیں بتلانے والوں کے غیب داں ہونے کی نفی ہو گئی۔ ⑧ پھر کلمہ "من رسول" کے اقتضاء سے رسول کے لیے علم کلی کی نفی ہو گئی اور بشر کے لیے علم ماکان ومایکون کا سوال ختم ہو گیا۔ ⑨ پھر اسی من رسول کے کلمہ سے رسول کے لیے علم جزئی ثابت کر کے خدا اور رسول کے علم کا

فرق واضح کیا کہ خدا کا علم محیط اور کلی ہے اور رسول کا اس کے لحاظ سے جزئی اور محدود جس سے خدا اور رسول کے علم میں مساوات کا تخیل منفی ہو گیا۔

⑩ پھر اس علم کو پیغمبر کے حق میں اطلاعی کہہ کر "من رسول" ہی کے کلمہ سے امت کے حق میں اسے "رسالاتی" علم ثابت کیا، جس سے امت کے حق میں اس کے اطلاعی علم ہونے کی بھی نفی ہو گئی، بلکہ یہی غیبی علم اس کے حق میں استدلالی ہو گیا۔ تلک عشرۃ کاملہ (علم غیب ۵۳، ۵۲)

دور کی کوڑھیاں لانے والے کچھ نام نہاد اہل علم نے اس آیت کا خانہ ساز مفہوم بیان کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے علم غیب اور کلی علم غیب کو ثابت کرنے کی اپنی سی ہمیشہ کوشش کی ہے، مگر اللہ جزائے خیر دے ان درویش صفت علماء کرام کو جو ان ملحدین کی گالیاں کھا کر بھی کبھی بدمزہ نہیں ہوئے اور ارباب تفسیر کے ارشادات کی روشنی میں اس آیت کی درست تفسیر کر کے حق اور سچ کا ہمیشہ پرچار کیا۔

امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں ان لوگوں کے استدلالات نقل فرمائے اور انہیں جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس آیت سے بھی فریق مخالف کا جناب نبی کریم ﷺ کے کلی غیب پر استدلال بالکل مردود ہے، اولاً اس لیے کہ یہ آیت غزوہ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھی جو شوال ۳ھ میں پیش آیا تھا اور یہ آیت سورۃ آل عمران کی ہے جس کے بعد قرآن کریم کی سولہ سورتیں نازل ہوئی ہیں (دیکھیے اتقان ج ۱ ص ۲۵ وغیرہ)

اگر اس سے کل علم غیب مراد ہوتا تو مناسب یہی تھا کہ اس کے بعد ایک حرف بھی قرآن کریم کا آنحضرت ﷺ پر نازل نہ ہوتا حالانکہ دیگر احکام کے علاوہ صرف قرآن کریم کی سولہ سورتیں اس کے بعد نازل ہوئی ہیں، پھر یہ بات کس طرح مانی جا سکتی ہے کہ اس آیت سے کل علم غیب مراد ہے؟ اور اگر واقعی اس سے کل علم غیب مراد ہوتا تو اس کے بعد نفی علم غیب کی کوئی آیت نازل نہ ہوتی

حالانکہ سورۃ نساء، سورۃ النور، سورۃ المنافقون اور خصوصیت سے سورۃ التوبہ (جو سب سے آخری سورت ہے) میں نفی علم غیب کی صاف اور صریح متعدد آیات موجود ہیں۔ (ازالۃ الریب ص ۵۰۱)

ثانیاً: حضرات مفسرین کرام نے بھی اس آیت سے بعض علم غیب مراد لیا ہے، تمام علم غیب اور جمیع ماکان ومایکون کا علم اس آیت سے کسی کے نزدیک مراد نہیں، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اور علامہ خازن رحمہ اللہ کی عبارتوں کے ترجمے ہم نے بحوالہ مفتی احمد یار خان صاحب پیش کر دیے ہیں کہ ان میں ببعض المغیبات اور علی بعض علم الغیب کی قید موجود ہے، ان کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (ازالۃ الریب)

اور امام بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ {وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ} فَيُطْلِعُهُ عَلٰى بَعْضِ عِلْمِ الْغَيْبِ، نَظِيْرُهُ قَوْلُهُ تَعَالٰى: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَسُوْلٍ" (سُوْرَةُ الْجِنِّ الْآيَتَانِ: ۲۶،۲۷) وَقَالَ السُّدِّيُّ: مَعْنَاهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اجْتَبَاهُ، (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن ج ۲ ص ۱۴۱) اور لیکن اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے سو اس کو بعض علم غیب پر مطلع کر دیتا ہے اور اس کی نظیر یہ آیت ہے عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا اور سدی کہتے ہیں کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب پر مطلع نہیں کرتا لیکن ان کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے، یعنی لکن سے استثناء منقطع ہے متصل نہیں)

اور علامہ معین رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَيُخَيِّرُهُ بِبَعْضِ الْمَغِيْبَاتِ" اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے تو ان کو بعض مغیبات کی خبر دے دیتا ہے۔ (جامع بیان ص ۶۴)

اور قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَيُطْلِعُهٗ عَلَى الْبَعْضِ مِنْ عُلُوْمِ الْغَيْبِ اَحْيَانًا كَمَا اِطَّلَعَ نَبِيُّهٗ ﷺ عَلٰى اَحْوَالِ الْمُنَافِقِيْنَ (تفسیر

مظہری ج ۲ ص ۱۸۵) اور لیکن اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے تو اس کو احیانا بعض علوم غیب پر مطلع کر دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (احد کے موقع پر بعض) منافقین کے حالات پر آنحضرت ﷺ کو مطلع کر دیا تھا۔

ان تفاسیر سے معلوم ہوا کہ الغیب سے بعض علم غیب مراد ہے اور یہی دوسرے دلائل اور براہین کے پیش نظر حق اور متعین ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معنیٰ مراد لینا ہرگز جائز اور صحیح نہیں ہے۔ (ازالۃ الریب)

مسئلہ علم غیب، اطلاع غیب اور انباء غیب پر علماء کرام، مشائخ عظام نے بہت ہی عمدہ کام کیا ہے، ان میں ازالۃ الریب فی عقیدہ علم الغیب اس موضوع پر بہت ہی تفصیلی اور مدلل کتاب ہے، جو مولانا سرفراز خان صاحب نے تحریر فرمائی ہے، اسی طرح مولانا قاری محمد طیب صاحب نے علم غیب پر بہت ہی بہترین علمی اور استدلالی بحث کی ہے۔ ہماری اس تفسیر میں موقع بہ موقع اس موضوع پر لکھا گیا ہے، وہ انہی اکابر اور مشائخ کے خوان علم کی ریزہ چینی ہے۔ یہاں ہم طوالت کے خوف سے مزید بحث سے گریز کر رہے ہیں۔

خلاصہ کے طور پر یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو غیب کی بہت سی خبریں عطا فرمائی ہیں، ان کو انباء غیب، اخبار غیب اور اطلاع غیب کہا جاتا ہے، آپ ﷺ کو انباء، اخبار اور اطلاع میں سے جس قدر اللہ تعالیٰ نے سرفراز فرمایا ہے، نوازشات کی بارش فرمائی ہے وہ اپنی ساری مخلوق میں سے کسی اور پر نہیں ہوئی، جس قدر علوم و معارف آپ ﷺ کے سینہ اطہر پر القاء کیے گئے ہیں وہ اپنی مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں دیے گئے۔

ان علوم میں اللہ کی ذات، اللہ کی صفات، ان کے اسرار و رموز اور ان کی حکمتیں، عبادات، معاملات، اخلاق، سلطنت، حلال و حرام، جائز و ناجائز، کار ثواب اور کار عقاب کے بہت سے علوم، یوم

میثاق، یوم آفرینش، سابقہ انبیاء ورسل اور ان کی امتوں سے متعلقہ متعدد حالات، اسی طرح اپنے زمانہ کی بے شمار خبریں، قیامت تک رونما ہونے والے بہت سے واقعات اور بہت سے فتنوں، زلزلوں کی خبریں، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل، قیامت کی نشانیاں، قبر وبرزخ کے حالات، میدان محشر کی ہولناکیاں، جنت کی نعمتوں، دوزخ کی سزاؤں وغیرہ سے متعلق بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ کے بتانے سے آپ ﷺ نے اپنی امت کو بتائیں۔

جس قدر اور جتنے بھی علوم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے وہ اپنی باقی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیے، مگر قرآن کریم کی روشن تعلیمات سے ایک بات مضبوطی کے ساتھ ہمیں ملتی ہے کہ علم غیب خاصہ خداوندی ہے، اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں کوئی بھی شریک نہیں ہے، جو اللہ کی اس صفت کو کسی نبی ولی، پیر فقیر میں مانے گا وہ اللہ کے قرآن کا منکر ہے، جو قرآن کریم کا منکر ہے وہ اللہ کا منکر ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا منکر ہے اور ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں "میں نے اپنی کتابوں میں تصریح کر دی ہے کہ اگر تمام اولین و آخرین کا علم جمع کیا جائے تو اس علم کو علمی الٰہی سے وہ نسبت ہر گز نہیں ہو سکتی جو ایک قطرہ کے کروڑویں حصہ کو سمندر سے ہے، کیونکہ بہ نسبت متناہی کی متناہی کے ساتھ ہے اور وہ غیر متناہی کی متناہی سے۔ (الملفوظ ج ا ص ۴۶، بحوالہ تفسیر تبیان القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے علوم کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کا علم ایسا ہے جیسے قطرہ کے مقابلہ میں سمندر ہو اور اللہ کے علم کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے علم کی وہ نسبت بھی نہیں ہے جو قطرہ اور سمندر میں ہوتی ہے۔ کیونکہ قطرہ اور سمندر میں متناہی کی نسبت متناہی کی طرف ہے اور آپ کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف نسبت متناہی کی نسبت غیر متناہی کی طرف ہے۔ امام احمد رضا کے نزدیک عالم الغیب اللہ تعالیٰ کی صفت مخصوصہ ہے۔ (بحوالہ تفسیر تبیان القرآن)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں "بعض ناواقف غیب اور انباء الغیب میں فرق نہیں سمجھتے اس لئے وہ انبیاء اور خصوصاً خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے علم غیب کلی ثابت کرتے ہیں اور آپ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ذرہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کھلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نعوذ باللہ منہ۔ اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلا دے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے جب ان کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہیں، وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوت و رسالت کی نفی ہو جاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں۔ (تفسیر معارف القرآن)

فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ پر قرآن میں سے کوئی آیت نازل نہیں فرمائی مگر اس کے ساتھ چار فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کو نبی مکرم ﷺ تک پہنچا دیتے ہیں، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ (ابن مردویہ) تفسیر در منثور میں ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر آنے والی وحی کے وقت جبریل علیہ السلام کے ساتھ چار محافظ فرشتے ہوتے تھے۔

محافظ مقرر کرنے کی وجہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا {۲۸} الجن.

جواب ترجمہ: تاکہ وہ ظاہر کردے کہ تحقیق انہوں نے پہنچادیے ہیں اپنے رب کے احکام اور اس نے احاطہ کیا ہوا ہے، اس چیز کا جو ان کے آگے ہیں اور اس نے گن رکھی ہے ہر چیز گنتی کے لحاظ سے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں "لیعلم تاکہ ظاہر کردے میرا پروردگار، اور یہاں لام بمعنیٰ حتیٰ ہے اس لیے کہ غرض اور غایت کے درمیان قوی مناسبت ہے، ایک کا لفظ دوسرے کے لیے بطور استعارہ لانا جائز ہے اور یہی وجہ ہے کہ لفظ حتی کو جو کہ غایت کے لیے موضوع ہے، تعلیل اور بیان کے مقام میں اکثر استعمال کرتے ہیں جب کہ لام کو جو کہ غرض کے لیے موضوع ہے، بیان غایت کے مقام میں اگرچہ بطریق مجاز سہی استعمال کرتے ہیں جیسے لِدُوا لِلمَوتِ وَابنُوا لِلخَرَاب اور جیسے فَالتَقَطَهُ آلُ فِرعَونَ لِيَكُونَ لَهم عَدُوًّا وَّحَزَنًا اور حاصل کلام یہ ہے کہ یہ احتیاط اور چوکی داری کا سلسلہ جاری رہتا ہے حتی کہ میرے پروردگار کا حالی علم جو واقع ہونے والی چیزوں کے ساتھ ان کے وقوع کے وقت متعلق ہوتا ہے تعلق قبول کرے۔

اَن قَد اَبلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِم: کہ تحقیق اس رسول ملکی اور رسول انسانی اور چوکیداروں نے اپنے پروردگار کے تمام پیغام پہنچادیے اور عام مکلفین پر حجت لازم ہوگئی اور گزشتہ کلام میں رسول کے صیغہ مفرد کے باوجود یہاں جمع کا صیغہ وارد کرنا اسی لیے ہے کہ اکثر اوقات نزول وحی اور اسے مکلفین تک پہنچانا ملکی اور انسانی رسولوں اور چوکی داروں کی جماعت سب کے دخل سے ہوتا ہے، گو اس کا حامل صرف رسول ہو جیسے اس کھانے کا تھال جو بادشاہ اپنے مقربین کے لیے بھیجتا ہے، اسے اٹھانے والا ایک ہوتا ہے اور دوسروں کو اطلاع نہیں ہوتی کہ اس میں کیا ہے، لیکن مشعل بردار اور محافظ ضرور ہمراہ ہوتے ہیں اور اس کا پہنچانا ان سب کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

وَاَحَاطَ بِمَالَدَيْهِمْ: اور ان کے پروردگار نے اس سب کا احاطہ فرمایا ہے جو کچھ ان کے پاس علوم مخزونہ ،اخلاق،عادات اوراحکام وحی سے ہےاور اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنا رسولوں اور وحی کے چوکیداروں کے احوال کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام ذہنی اور خارجی موجودات کو عام ہے۔

وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا: اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے حتیٰ کہ دریا کی موجوں، بیاباں کی ریت، درختوں کے پتوں اور بارش کے قطروں کے شمار کو جانتا ہے تو اس سے کیا بعید ہے کہ اس نے رسولوں اور وحی کے محافظوں کے احوال کا احاطہ کر رکھا ہو۔(تفسیر عزیزی)

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں" اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص ہے جس کے علم میں ہر چیز کے اعداد و شمار ہیں۔ اس کو پہاڑوں کے اندر جتنے ذرے ہیں ان کا بھی عدد معلوم ہے، ساری دنیا کے دریاؤں میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اس کے علم میں ہے ہر بارش کے قطروں اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کے اعداد و شمار کا اسی کو علم ہے۔ اس میں پھر علم غیب کلی کا ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا واضح کر دیا کہ کسی کو مذکورہ استثناء سے غلط فہمی نہ ہو جائے۔(معارف القرآن)

اللہ نے ہر چیز کا عددی احاطہ کر رکھا ہے پہاڑوں کے وزن کی تعداد، دریاؤں کے ناپ کی تعداد، بارش کے قطروں کی تعداد، درختوں کے پتوں کی تعداد، غرض ان تمام چیزوں کی تعداد جو رات کے اندھیرے یا دن کی روشنی میں ہوں اللہ کو معلوم ہیں۔(گلدستہ تفاسیر)

الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ آج سورۃ الجن کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے،

خادم اسلام: محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۱۵ مئی ۲۰۱۹ء ۹ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ بوقت رات ڈیڑھ بجے

حروف بینی: ۳، اگست ۲۰۱۹ء، یکم ذوالحج ۱۴۴۰ھ حال وارد حدوٹ مری

المزمل

چادر اوڑھنے والے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ مزمل سے کون سی ہستی مراد ہے؟

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ{۱} المزمل.

جواب ترجمہ: اے چادر میں لپٹنے والے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے کہا کہ تم اس آدمی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نام رکھو جس سے لوگ کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں پھر انہوں نے کہا یہ کاہن ہے، بعض نے کہا یہ کاہن نہیں، پھر انہوں نے کہا یہ مجنون ہے تو دوسروں نے کہا یہ مجنون نہیں ہے پھر کچھ لوگوں نے کہا یہ جادوگر ہے تو دوسروں نے کہا یہ جادوگر نہیں ہے۔

پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ ایک دوست کو اپنے دوست سے جدا کر دیتا ہے تو اس پر مشرک متفرق ہو گئے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی آپ اپنے کپڑوں میں لپٹ گئے اور اپنے اوپر چادر اوڑھ لی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا یا ایہا المزمل اے کپڑا اوڑھنے والے۔ (طبرانی فی الاوسط، الدلائل)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس مقام پر فرماتے ہیں "اس پر اہل علم و عرفاں کا اتفاق ہے کہ یہاں المزمل سے مراد ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مزمل اصل میں متزمل تھا، متزملٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے کپڑے لپٹ کر سوتا ہے، پھر یہاں تاء کو زاء میں بدل دیا گیا، جس طرح مدثر اصل میں متدثر تھا، یہاں بھی تاء کو دال میں بدل دیا گیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اختلاف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کپڑا کیوں لپیٹتے تھے؟ اس کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں، ① امام تفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب

جبریل علیہ السلام پہلی بار نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ اس خیال سے گھبرا گئے کہ انہیں کسی جن نے چھو لیا ہے، تو آپ ﷺ کانپتے ہوئے پہاڑی سے واپس تشریف لائے اور فرمارہے تھے مجھے کمبل اوڑھاؤ، پھر جب آپ ﷺ کو کمبل اوڑھا دیا گیا تو اسی حالت میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کو آواز دی یاایھا المزمل اے کپڑا لپیٹنے والے۔ (تفسیر کبیر)

② کلبی نے کہا کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھنے کے لیے اپنے اوپر چادر لپیٹ لی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یاایھا المزمل، اے چادر لپیٹنے والے۔

③ ایک قول یہ کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ رات کو چادر اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے اس حالت میں آپ ﷺ کو آواز دی گئی کہ اے چادر لپٹ کر سونے والے اٹھیے اور عبادت میں مشغول ہو جایئے۔

④ ایک قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موانست کے لیے ان کی چادر اوڑھ کر رات کو سوئے ہوئے تھے تو آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے چادر اوڑھنے والے! رات کو اٹھیے، گویا کہ آپ ﷺ سے یہ فرمایا گیا کہ اپنے نفس کا حصہ چھوڑیے اور عبادت میں مشغول ہو جایئے۔

⑤ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے عظیم الشان کام کو اٹھانے والے، کیونکہ زمل کا معنیٰ اٹھانا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ لَيْسَ الْمُزَّمِّلُ بِاسْمٍ مِنْ أَسْمَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَمْ يُعْرَفْ بِهِ كَمَا ذَهَبَ إِلَيْهِ بَعْضُ النَّاسِ وَعَدُّوهُ فِي أَسْمَائِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَإِنَّمَا الْمُزَّمِّلُ اسْمٌ مُشْتَقٌّ مِنْ حَالَتِهِ الَّتِي كَانَ عَلَيْهَا حِينَ الْخِطَابِ، وَ كَذَلِكَ الْمُدَّثِّرُ (تفسیر القرطبی) علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے کہا، مزمل نبی کریم ﷺ کے ناموں میں سے نہیں اور نہ ہی اس میں یہ مشہور ہے جس طرح بعض لوگ اس طرف گئے ہیں اور اسے نبی کریم ﷺ کے اسماء میں شمار کیا

ہے، مزمل اسم مشتق ہے جو اس حالت میں اشتقاق کیا گیا جو خطاب کے وقت آپ کی تھی، اسی طرح مدثر بھی آپ ﷺ کا نام نہیں ہے۔

اس نام کے ساتھ خطاب کرنے میں دو فائدے ہیں ایک تو شفقت و محبت کا اظہار ہے کیونکہ عرب جب مخاطب کے ساتھ شفقت کرنے اور عتاب کے ترک کرنے کا ارادہ کرتے تو اسے ایسے نام کے ساتھ پکارتے جو اس حالت میں مشتق ہوتا جس حالت پر وہ ہوتا، جس طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ شیر خدا کو فرمایا، جب وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہوئے تو رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے اور ان کے پہلو پر مٹی لگی ہوئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ اے ابوتراب! اٹھو، مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان پر ناراض نہیں اور ان پر شفقت کا اظہار تھا۔ اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ کا فرمان ہے، قُمْ يَا نَوْمَانُ اے نومان، اٹھو، جب کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سوئے ہوئے تھے مقصود ان پر شفقت و نرمی کا اظہار تھا اور ناراضگی و عتاب کو ترک کرنا مقصود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے یہ جو ارشاد فرمایا ہے، يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ، اس میں بھی اُنس اور شفقت کا اظہار ہے تاکہ آپ ﷺ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض نہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہر وہ آدمی جو چادر لے کر رات کو سویا ہوا ہو اس کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ رات کے وقت عبادت کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے بیدار ہو کیونکہ فعل سے جو اسم مشتق ہوتا ہے اس میں مخاطب کے ساتھ ہر آدمی شریک ہوتا ہے جو ایسا عمل کر رہا ہو اور اس صفت کے ساتھ موصوف ہو۔ حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ لکھتے ہیں " کہ اس سورت میں خرقہ پوشی کے لوازم اور شروط بیان ہوئی ہیں "۔ گویا یہ سورت اس شخص کی سورۃ ہے جو درویشوں کا خرقہ پہنے اور اپنے تئیں اس رنگ میں رنگے۔

لغت عرب میں "مزمل" اس شخص کو کہتے ہیں جو بڑے کشادہ کپڑے کو اپنے اوپر لپیٹ لے اور آنحضرت ﷺ کا معمول ایسا تھا کہ جب نماز تہجد اور قرآن شریف کی تلاوت کے لیے رات کو اٹھتے تھے تو ایک کمبل دراز اوڑھ لیتے تھے، تا سردی سے بدن محفوظ رہے اور وضو و نماز کی حرکات میں کسی طرح کا حرج واقع نہ ہو۔ نیز اس عنوان کے اختیار کرنے میں ان لوگوں کو ہوشیار کرنا ہے جو کپڑوں میں لپٹے ہوئے رات کو آرام کر رہے ہوں کہ رات کا ایک معتدبہ حصہ اللہ کی عبادت میں گزاریں۔ (تفسیر عزیزی)

مفسر قرآن حضرت صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یہ سورۃ قرآن کریم کی نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے، سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نزول کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ پہلے اور دوسرے رکوع میں بارہ مہینے کا فرق ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ الاتقان فی علوم القرآن میں اور دوسرے مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ پر سب سے پہلی جو وحی غار حرا میں نازل ہوئی، وہ سورہ اقرا کی پہلی پانچ آیتیں ہیں یعنی، اقرا باسم ربک الذی سے لے کر مالم یعلم تک اس کے متصل دوسرے نمبر پر سورۃ فاتحہ بھی وہیں نازل ہوئی۔ اور آپ کو وضو کا طریقہ بھی وہیں بتلایا گیا۔ نزول وحی سے دوسرے دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا فرمائی اور ام المومنین خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا نے نماز ادا کی۔

نزول کے تیسرے نمبر کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے، بعض فرماتے ہیں کہ تیسرے نمبر پر سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نازل ہوا، اس کے بعد سورۃ مدثر، پھر سورۃ ن اور پھر دوسری سورتیں۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

حضرت حکیم الامت، مجدد الملۃ شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "یہ خطاب آنحضرت ﷺ کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اور مزمل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول

اللہ ﷺ کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی رسول اللہ ﷺ تو یہ چاہتے تھے کہ یہ کم بخت ایمان لائیں تاکہ جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹا تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت ﷺ شدت غم ورنج وحزن سے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یاایھا المزمل نداء خطاب میں فرمایا گیا تاکہ آنحضر ﷺ کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء (دشمنوں کے ہجوم) اور ان کے طعن وتشنیع سے تنگ آگیا ہو اس وقت محبوب خاص اسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے۔

تو دیکھیے اس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی کتنی لذت معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یاایھا المزمل کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے ندا دے کر آنحضرت ﷺ کو دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض ارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں۔

چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح فرمایا ہے کہ اِصبِر عَلٰی مَا یَقُولُونَ وَسَبِّح بِحَمدِ رَبِّكَ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اوپر کی مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو ہم کو دیکھو، دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں آؤ تم ہم سے باتیں کرو، وہ کام کرو اور آنحضرت ﷺ کو تو یہ تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا مگر امت میں اور اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات ہوتے ہیں۔

اور اس مقام پر لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال وحزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ ﷺ کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق

ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی وضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا غم غایت شفقت اور رحم کے تھا آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفسَكَ (الخ) شاید ان کے ایمان نہ لانے پر جان دیدیں گے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شَیر وشِیر

نیک لوگوں کو اپنے اوپر مت قیاس کرو اگرچہ شَیر (شین پر زبر) اور شِیر (شین کے نیچے زیر) (دودھ) کو لکھنے میں ایک ہی ہیں مگر معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ (اشرف التفاسیر)

نماز تہجد اور ترتیل قرآن کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا {۲} نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا {۳} اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا {۴} المزمل.

جواب ترجمہ: رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔ رات کا آدھا حصہ، یا آدھے سے کچھ کم کرلو۔ یا اس سے کچھ زیادہ کرلو، اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ راتوں کے وقت کپڑے لپیٹ کر سو رہنے کو چھوڑیں اور تہجد کی نماز کے قیام کو اختیار کرلیں، جیسے دوسرے مقام پر صالحین کی صفت بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (السَّجْدَةِ:۱۶) ان کے پہلو بستروں سے الگ ہوتے ہیں اور اپنے رب کو خوف اور لالچ سے پکارتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے دیتے رہتے ہیں۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَكَذَلِكَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُمْتَثِلًا مَا أَمَرَهُ اللهُ تَعَالَى بِهِ مِنْ قِيَامِ اللَّيْلِ، وَقَدْ كَانَ وَاجِبًا عَلَيْهِ وَحْدَهُ، رسول اللہ ﷺ ساری عمر اس حکم کی بجا آوری کرتے رہے تہجد کی نماز صرف آپ پر واجب تھی۔ (امت پر واجب نہیں ہے)

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو سورۃ الاسراء میں حکم دیتے ہوئے فرمایا{وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا} (الإسراء:۷۹) رات کو تہجد پڑھا کریں یہ حکم صرف آپ کے لیے ہے آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود میں پہنچانے والا ہے۔

تہجد باب تفعل کی مصدر ہے، اس کا ایک معنٰی ہے سونا، دوسرا معنٰی ہے جاگنا، عربی میں ھجد الرجل اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی رات کو سو جائے، اور اسی طرح عربی میں سو کر اٹھنے کے بعد جو شخص نماز پڑھے اس کے لیے کہا جاتا ہے ھجد، متہجد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سو کر اٹھنے کے بعد نماز پڑھے، یا بغیر سوئے تہجد کی نیت سے نماز پڑھنے کو تہجد کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم، سنت نبی کریم ﷺ اور اجماع امت کی روشنی میں دیکھا جائے تو تہجد کی نماز سنت مؤکدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عباد الرحمان کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا{وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا} (الفرقان ۶۴) وہ لوگ اپنے رب کے لیے راتیں سجدوں اور قیام میں گزار دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کی صفت بیان فرمائی ہے {كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (۱۷) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ} (۱۸) (الذاریات) وہ لوگ راتوں کو بہت کم سوتے ہیں، وہ بوقت سحر اللہ سے معافی مانگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں کا تذکرہ یوں فرمایا{تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۱۶) فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ

لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ}(۱۷) (السجدہ)، خواب گاہوں سے ان کے پہلو دور ہوتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور طمع سے پکارتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، پس کوئی نہیں جانتا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے، یہ بدلہ ہے اس چیز کا جو وہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ {يَتْلُونَ آيَاتِ اللهِ آنَاءَ اللَّيل وَهُمْ يَسْجُدُونَ} (آل عمران ۱۱۳) وہ رات کی گھڑیوں میں اس وقت اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں جب وہ سجدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ {وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالأَسْحَارِ} (آل عمران ۱۷) وہ بوقت سحر استغفار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والے ان لوگوں کی شان و مقام بیان فرمایا ہے، جو راتوں کو قیام کرتے ہیں اور انہیں اس چیز کا علم ہوتا ہے کہ ہم رب العالمین کی بارگاہ عالی میں حاضری دے رہے ہیں، اللہ نے ان جانکاروں کے مرتبے اور مقام کو ان لوگوں کے مقابلے میں بیان فرمایا ہے جو نہیں جانتے کہ یہ قیام اللیل کیا ہوتا ہے، علم کیا ہوتا ہے، جانکاری کیا ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا {أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيل سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الأَلْبَابِ} (الزمر ۹) بھلا (کیا ایسا شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے) جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا ہے، کبھی سجدے میں، کبھی قیام میں، آخرت سے ڈرتا ہے، اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے؟ کہو کہ: کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ (مگر) نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

سورۃ المزمل میں اللہ تعالیٰ نے صلاۃ اللیل کی عظمتِ شان بیان کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ کو یوں ارشاد فرمایا {يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّل {۱} قُمِ اللَّيل إِلَّا قَلِيلًا {۲} نِصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا {۳} أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا {۴}} (المزمل) اے چادر میں لپٹنے والے! رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ

کر باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔ رات کا آدھا حصہ، یا آدھے سے کچھ کم کر لو۔ یا اس سے کچھ زیادہ کر لو، اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو، سورۃ الاسراء میں آپ ﷺ کو تہجد پڑھنے کا حکم دیا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا {٢٣} فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا {٢٤} وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا {٢٥} وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا {٢٦} (الانسان) (اے پیغمبر) ہم نے ہی آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے پروردگار کے حکم پر ثابت قدم رہو، اور ان لوگوں میں سے کسی نافرمان یا کافر کی بات نہ مانو۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح و شام ذکر کیا کرو۔ اور کچھ رات کو بھی اس کے آگے سجدے کیا کرو، اور رات کے لمبے وقت میں اس کی تسبیح کرو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا {وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ} (ق ۴۰) اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدوں کے بعد بھی۔ سورۃ الطور میں ارشاد فرمایا {وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ} (الطور ۴۹) اور کچھ رات کو بھی اس کی تسبیح کرو، اور اس وقت بھی جب ستارے ڈوبتے ہیں۔

ان ارشادات کے مطالعہ سے اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ صلوٰۃ اللیل کی اللہ کے ہاں کتنی اہمیت ہے، اللہ کے ہاں عبادت شبانہ کی کیا شان ہے کہ اپنے حبیب ﷺ کو نماز تہجد کا حکم دیا گیا، بلکہ اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے یہاں اس حکم کے ساتھ ہی مقدار بھی بیان فرمادی کہ آدھی رات یا کچھ کم و بیش۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں مزمل کا ایک تو وہی مشہور معنیٰ بیان فرمایا، جو ہم لکھ چکے ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک معنیٰ اور کیا کہ اے قرآن کے مفہوم کو اچھی طرح اخذ کرنے والے تو آدھی رات تک تہجد میں مشغول رہا کر، یا کچھ بڑھا گھٹا دیا کر۔

خود نبی کریم ﷺ کی تعلیمات عالیہ میں بھی تہجد کی ترغیب دی گئی، فرمایا أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهرُ اللهِ المُحَرَّم، وَأَفضَلُ الصَّلَاةِ بَعدَ الفَرِيضَةِ صَلَاةُ اللَّيلِ (مسلم کتاب الصیام) رمضان المبارک کے بعد افضل روزہ اللہ کے مہینے محرم کا روزہ ہے، اور فرض نماز کے بعد افضل نماز تہجد کی ہے۔

ترغیب کے ساتھ خود ذات اقدس کا اپنا عمل جو تھا وہ کتنا قابل رشک تھا، یہاں تک روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کے لمبے قیام اللیل کے باعث قدمین مبارک متورم ہو جاتے تھے، ام المومنین قیام اللیل کی طویل عبادت کو دیکھ کر بول پڑیں کہ یارسول اللہ! آپ ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر طویل اور لمبی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے انہیں تسلی کراتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا شکر گزار بندہ بننا پسند کرتا ہوں۔

بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے أَنَّ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ حَتَّى تَتَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ: لِمَ تَصْنَعُ هَذَا يَا رَسُولَ اللهِ وَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: أَفَلَا أُحِبُّ أَنْ أَكُونَ عَبْدًا شَكُورًا فَلَمَّا كَثُرَ لَحْمُهُ صَلَّى جَالِسًا، فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَرْكَعَ قَامَ فَقَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ (بخاری)

اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ رات کو قیام کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے قدمین سوجھ جاتے تھے، حضرت عائشہ نے پوچھا، یارسول اللہ! آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، کیا میں یہ پسند نہ کروں کہ میں اللہ کا شکر گزار بندہ بن جاؤں؟ جب سوجھن زیادہ ہو جاتی تو بیٹھ کر پڑھتے تھے، جب رکوع کرنا چاہتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور پڑھتے پھر رکوع کرتے تھے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا کہ آپ ﷺ نفلی نماز کھڑے ہو کر پڑھتے یا بیٹھ کر پڑھتے ثواب ایک جتنا ہی تھا، محدثین ایک وضاحت یہ فرماتے ہیں کہ

آپ ﷺ جو نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے اس میں رکوع اور سجدہ بھی اسی حالت سے کرتے تھے، اگر کھڑے ہو کر پڑھتے تو کھڑے ہونے کی حالت سے رکوع اور سجدے میں جاتے تھے، یہاں جو بات دکھائی دے رہی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے اور جب رکوع کرنا چاہتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، پھر تلاوت میں سے تیس چالیس آیات باقی والی تلاوت کرتے پھر رکوع اور سجدہ کرتے تھے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ، فَقِيلَ لَهُ: غَفَرَ اللهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ: أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا (بخاری) نبی کریم ﷺ (قیام اللیل میں) کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے قدمین سوجھ جاتے تھے، اس پر آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ معافی کا تقاضا ہے کہ اللہ کی بندگی اور عبادت کے ذریعے اس کا اور زیادہ شکر ادا کیا جائے جس نے معافی کا پروانہ عطا کیا ہے۔ اصحاب رسول میں سے ایک عاشق صادق نے آپ ﷺ کی نماز اور تلاوت کی منظر کشی کرتے ہوئے کیا ہی خوب انداز میں آپ ﷺ کی مدح کی، فرمایا

وَفِينَا رَسُولُ اللهِ يَتلُو كِتَابَهُ ... إِذَا انشَقَّ مَعرُوفٌ مِّنَ الفَجرِ سَاطِعُ

يَبِيتُ يُجَافِي جَنبَهُ عَن فِرَاشِهِ ... إِذَا استَثقَلَت بِالكَافِرِينَ المَضَاجِعُ

ترجمہ: ① اور ہمارے درمیان اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں، جو ہمیں اللہ کی کتاب تلاوت کر کے سناتے ہیں، جب صبح صادق کا نور پھوٹنے لگتا ہے اور روشنی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

② آپ ﷺ رات اس حال میں گزارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (یعنی نماز تہجد میں مشغول رہتے ہیں) جب کہ کافروں کے بستر ان پر بھاری پڑتے ہیں (اور وہ غفلت کی نیند میں ڈوبے رہتے ہیں)

تہجد اور قیام اللیل کی اہمیت اور فضیلت بہت سی روایات سے معلوم ہوتی ہے، ایک روایت میں تو قیام اللیل کو دخول جنت کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے، حضرت عبد اللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ شریف تشریف لائے تو لوگ آپ ﷺ کی طرف جلدی جلدی دوڑ پڑے اور یہ کہا جارہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ آگئے، رسول اللہ ﷺ آگئے، رسول اللہ ﷺ آگئے، (تین بار)، تو میں بھی لوگوں میں آگیا، تاکہ میں آپ ﷺ کو دیکھوں، جب میں نے آپ ﷺ کا چہرہ دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا، جو بات میں نے آپ ﷺ کو گفتگو کرتے ہوئے سنی وہ یہ تھی، آپ ﷺ نے فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (ابن ماجہ، قیام اللیل قحطانی) اے لوگو! السلام علیکم کو عام کرو، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو، اور رات کو اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں، تو تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کیا خوب ترجمانی کی

أَلَهَتْكَ لَذَّةُ نَوْمَةٍ عَنْ خَيْرِ عَيْشٍ ... مَعَ الْخَيْرَاتِ فِي غُرَفِ الْجِنَانِ

تَعِيشُ مُخَلَّداً لَا مَوْتَ فِيهَا ... وَتَنْعَمُ فِي الْجِنَانِ مَعَ الْحِسَانِ

تَيَقَّظْ مِنْ مَنَامِكَ إِنَّ خَيْراً ... مِنَ النَّوْمِ التَّهَجُّدُ بِالْقُرْآنِ

(قیام اللیل محمد بن نصر المروزی، قیام اللیل ابن ابی الدنیا و قحطانی)

ترجمہ: نیند کی لذت تجھے بہترین عیش سے غافل رکھتی ہے، باوجودیکہ بھلائیاں جنت کے بالاخانوں میں ہیں، تو ہمیشہ وہاں زندگی گزارے گا موت نہیں آئے گی، جنت میں حوروں کے ساتھ خوش عیشی کرے گا، اپنی نیند سے بیدار ہو، تہجد میں قرآن کریم کی تلاوت نیند سے بہتر ہے۔

تہجد کی نماز اور قیام اللیل جنت کے بالاخانوں میں بلندی درجات کا سبب ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ فِي الْجَنَّةِ غُرَفًا تُرَى ظُهُورُهَا مِنْ

بُطُونِهَا وَبُطُونُهَا مِنْ ظُهُورِهَا، فَقَامَ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: لِمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: لِمَنْ أَطَابَ الْكَلَامَ، وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَأَدَامَ الصِّيَامَ، وَصَلَّى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ (ترمذی) جنت میں کچھ بالاخانے ہیں، جن کا ظاہر ان کے باطن سے اور باطن ظاہر سے دیکھا جاسکتا ہے، یہ سن کر ایک دیہاتی کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا، یارسول اللہ! یہ کس کے لیے ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کے لیے ہو گا جو اچھا کلام کرے گا، کھانا کھلائے گا، روزوں پر دوام اختیار کرے گا، رات کو اس وقت نماز پڑھے گا جب لوگ سو رہے ہوں گے۔

تہجد کا اہتمام کرنے والے لوگ نیکوکاروں میں شامل ہوں گے، اللہ کی رحمت اور اللہ کی بنائی ہوئی جنت کے مستحق ہوں گے، قرآن کریم میں ان کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ رات کو کم سوتے ہیں، سحر کے وقت یہ لوگ استغفار کرتے ہیں۔

یہ تہجد گزار لوگ ہی ہیں جن کو قرآن کریم میں عباد الرحمان کہا گیا، انہیں نیک بندے کہا گیا، اللہ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ رات کی تاریکی میں سجدے اور قیام میں راتیں گزار دیتے ہیں، ان کے کامل ایمان کی گواہی رب تعالی نے دی ہے، جہاں ان کے بارے میں واضح کیا گیا کہ یہی لوگ تو ہماری آیات پر ایمان وایقان رکھتے ہیں، جب ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو یہ لوگ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح خواں ہو جاتے ہیں، یہ لوگ رب کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے، رات کو ان کے پہلو ان کے بستروں سے جدا رہتے ہیں، یہی تو وہ خوش بخت وخوش نصیب ہیں جو اپنے رب کو خوف وطمع سے یاد کرتے اور اللہ کے عطا کردہ مالوں سے راہ خدا میں لٹاتے ہیں۔

یہی تو وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ لوگ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، سجدہ ریزیاں کرتے ہیں، رب کے حضور مجسمہ عجز وانکسار بن کر ایستادہ رہتے ہیں، یہ آخرت کی ہولناکی سے خوف زدہ رہتے ہیں، یہ لوگ رحمت رب سے پر امید رہتے ہیں، یہ علم والے لوگ ہیں، علم والے اور جاہل مساوی نہیں ہو سکتے۔

تہجد سے انسانی خطائیں مٹ جاتی ہیں، حضرت سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ، وَهُوَ قُرْبَةٌ إِلَى رَبِّكُمْ، وَمَكْفَرَةٌ لِلسَّيِّئَاتِ، وَمَنْهَاةٌ لِلإِثْمِ (ترمذی) تم پر رات کا قیام لازم ہے، کیونکہ یہ تم سے پہلے والے نیکو کار لوگوں کا طریقہ ہے، تہجد تمہارے رب کے قریب ہونے کا ذریعہ ہے، گناہوں کے مٹنے کا سبب ہے، گناہوں کو روکنے والی ہے۔

ترمذی شریف میں ہی حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں، فرمایا وَتَكْفِيرٌ لِلسَّيِّئَاتِ، وَمَطْرَدَةٌ لِلدَّاءِ عَنِ الجَسَدِ (ترمذی) تہجد، قیام اللیل برائیوں کو مٹاتی ہے اور جسم سے بیماریوں کو دور پھینکتی ہے۔ ماہ محرم الحرام کے روزے رمضان کے روزوں کے بعد افضل ہیں اور فرض نمازوں کے بعد افضل ترین نماز تہجد اور قیام اللیل ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمانے لگے يَا مُحَمَّدُ، عِشْ مَا شِئْتَ فَإِنَّكَ مَيِّتٌ، وَأَحْبِبْ مَنْ أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مَفَارِقُهُ، وَاعْمَلْ مَا شِئْتَ فَإِنَّكَ مَجْزِيٌّ بِهِ ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ شَرَفُ الْمُؤْمِنِ قِيَامُ اللَّيْلِ وَعِزُّهُ اسْتِغْنَاؤُهُ عَنِ النَّاسِ (مستدرک حاکم)

اے محمد! آپ چاہے جتنا زندہ رہیں ایک دن آپ کی رحلت ہوگی، آپ جس سے محبت رکھیں سو رکھیں پھر اس سے جدائی ہوگی، آپ جو مرضی عمل کریں آپ کو اس کا بدلہ دیا جائے گا، پھر جبریل نے فرمایا کہ اے محمد! مومن کا شرف اور عزت قیام اللیل (تہجد کی نماز) میں ہے اور مومن کی عزت لوگوں سے بے پروائی برتنے میں ہے۔

تہجد گزاری اور قیام اللیل ایسا اعزاز ہے کہ اس کی وجہ سے انسان پر رشک کیا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

دوآدمیوں پر رشک ہو سکتا ہے، ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن کریم کی دولت عطا فرمائی ہے پھر وہ اسے رات اور دن کی گھڑیوں میں کھڑے ہو کر پڑھتا ہے اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے مال و دولت سے سرفراز فرمایا ہوا ہو اور وہ اسے دن اور رات کی گھڑیوں میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ (مسلم و بخاری)

بخاری و مسلم شریف کی روایت میں اغتباط ورشک ان دوآدمیوں پر کیا جاسکتا ہے جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی نعمت عطا فرمار کھی ہو اور وہ اسے راہ حق میں اڑاتا اور لٹاتا ہے، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت کی دولت دے رکھی ہو اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور اسے سکھاتا ہو۔

قیام اللیل میں تلاوت عظیم غنیمت: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من قَامَ بِعَشرِ آيَاتٍ لَم يُكْتَب مِنَ الغَافِلِينَ وَمَن قَامَ بِمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ القَانِتِينَ وَمَن قَامَ بِأَلفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ المُقَنطَرِينَ** (الترغیب) جس شخص نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں نہیں لکھا جائے گا، جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا وہ قانتین میں لکھا جائے گا، جس نے ہزار آیات کے ساتھ قیام کیا وہ مقنطرین میں لکھا جائے گا۔ قانتین کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ، اللہ کی بندگی خشوع وخضوع سے کرنے والا، اللہ کے لیے عاجزی وانکساری کرنے والا، مقنطرین یہ قنطار سے ہے، قنطار اگرچہ ایک خاص پیمانے کو کہا جاتا ہے، مگر اس سے مراد کثرت مال ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ ایسے بندے کے لیے ڈھیروں اجر لکھا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ إِذَا رَجَعَ إِلَى أَهْلِهِ أَنْ يَجِدَ ثَلَاثَ خَلِفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ؟ قَالَ: قُلْنَا: نَعَمْ، قَالَ: فَثَلَاثُ آيَاتٍ يَقْرَؤُهُنَّ فِي الصَّلَاةِ خَيْرٌ لَهُ مِنْهُنَّ۔** (مسلم شریف) کیا تم میں کوئی پسند کرتا ہے کہ جب

گھر واپس آئے تو تین اونٹنیاں حاملہ بڑی اور موٹی اس کو مل جائیں، ہم نے عرض کیا کہ بے شک ضرور پسند کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تین آیتیں جن کو تم میں سے کوئی نماز میں پڑھ لے وہ تین حاملہ بڑی اور موٹی اونٹنیوں سے افضل ہیں۔

کتنے عرصہ میں قرآن کریم مکمل کرنا چاہیے؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ قرآن کریم مکمل کرنے کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کتنی ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ان کے جواب میں قرآن کریم کی تکمیل کی مدت مقرر فرمادی۔

فرمایا کہ چالیس دن میں مکمل کرنا چاہیے، پھر فرمایا کہ ایک مہینے میں مکمل کرنا چاہیے، پھر فرمایا کہ پندرہ دن میں مکمل کرنا چاہیے، پھر فرمایا کہ دس دن میں مکمل کرنا چاہیے، پھر فرمایا کہ سات دن میں مکمل کرنا چاہیے، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ قوت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تین دن سے کم جو قرآن کریم مکمل کرے گا وہ اسے سمجھ نہیں سکے گا۔ (قیام اللیل للقحطانی)

معلوم ہوا کہ قرآن کریم زیادہ سے زیادہ چالیس دن میں مکمل کرنا چاہیے، اس سے بھی پہلے مکمل کرنا ہو تو تیس دن، اس سے کم کرنا ہو تو پندرہ دن، اس سے کم میں مکمل کرنا ہو تو دس دن، اس سے کم میں مکمل کرنا ہو تو سات دن میں کیا جاسکتا ہے، مگر تین دن سے کم میں کسی صورت مکمل نہ کرے کیونکہ اس سے کم مدت میں وہ اپنی قرأت کو سمجھ نہ پائے گا، جب کہ قرآن کریم کی تلاوت اور قرأت سے مقصود اس کو سمجھنا بھی ہے۔

قیام اللیل کا افضل وقت: تہجد اور قیام اللیل کا افضل اور بہترین وقت وہ ہے جب رات کا تیسرا حصہ گزر جائے، جب کہ صلاۃ اللیل رات کے ابتدائی، درمیانی اور آخری تینوں حصوں میں جائز ہے، نماز تہجد کا وقت آدھی رات کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ عشاء پڑھ کر سو جائے، پھر اٹھ کر نماز تہجد ادا کرے، حضرت اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

نبی کریم ﷺ کی صلاۃ اللیل (رات کی نماز) کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسی ہوتی تھی؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا كَانَ يَنَامُ أَوَّلَهُ وَيَقُومُ آخِرَهُ، فَيُصَلِّي، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى فِرَاشِهِ، فَإِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ وَثَبَ، فَإِنْ كَانَ بِهِ حَاجَةٌ، اغْتَسَلَ وَإِلَّا تَوَضَّأَ وَخَرَجَ (بخاری باب من نام اول اللیل واحیاء آخرہ) آپ ﷺ رات کے شروع حصہ میں نیند فرماتے اور آخری حصہ میں بیدار ہوتے اور نماز ادا فرماتے۔ پھر اپنے بستر پر واپس آجاتے، پھر جب مؤذن اذان کہتا تو آپ ﷺ اٹھ جاتے تھے، اگر غسل کی ضرورت ہوتی تو غسل فرمالیتے تھے ورنہ وضو کرکے نماز کے لیے نکل جاتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ایسی ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تہجد کی نماز کے لیے مسلمان کو کس قدر آسانی ہے، جس طرح اسے آسانی لگتی ہے تہجد کی نماز ادا کرلے، مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ افضل وقت یہی ہے جس کا بخاری شریف میں ذکر موجود ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بہت زیادہ قریب رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے، اگر تجھ سے اس گھڑی میں جس قدر اللہ کا ذکر ہوسکے تو تو کر گزر۔ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، حضرت نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر رات میں آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں، اس وقت جب کہ رات کا آخری تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے، پھر فرماتے ہیں مَن يَّدعُونی فَأَستَجِيبَ لَهُ؟ مَن يَّسأَلنی فَأُعطِيهِ؟ مَن يَّستَغفِرنی فَأُغفِرَ لَهُ؟ [فَلَا يَزَالُ كَذَلِكَ حَتَّى يُضِيءَ الفَجرُ (قیام اللیل) کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اس کا سوال پورا کروں، کون ہے جو مجھ سے استغفار کرے تو میں اسے معاف کردوں، یہ ندا و پکار طلوع فجر تک لگاتار رہتی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ إِنَّ فِی اللَّيلِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا عَبدٌ مُسلِمٌ يَسأَلُ اللهَ خَيراً مِن أَمرِ الدُّنيَا وَالآخِرَةِ إِلَّا أَعطَاهُ إِيَّاهُ، وَذَلِكَ

كُل لَيلَةٍ (قیام اللیل) بے شک رات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں بندہ مومن امور دنیا یا امور آخرت میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے تو اللہ وہ چیز اسے عطا فرمادیتے ہیں، اور یہ بات تمام راتوں میں ہوتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَحبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللهِ صَلَاةُ دَاوُدَ عَلَيهِ السَّلَامُ، وَأَحَبُّ الصِّيَامِ إِلَى اللهِ صِيَامُ دَاوُدَ، وَكَانَ يَنَامُ نِصفَ اللَّيلِ، وَيَقُومُ ثُلُثَهُ، وَيَنَامُ سُدُسَهُ، وَيَصُومُ يَوماً وَيُفطِرُ يَوماً، وَلَا يَفِرُّ إِذَا لَاقَى (قیام اللیل) اللہ کو نمازوں میں سب سے زیادہ محبوب نماز حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز تھی، روزوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ روزہ داؤد علیہ السلام کا تھا، حضرت داؤد آدھی رات سوتے تھے اور تیسرا حصہ جاگتے تھے، اور چھٹا حصہ سوتے تھے، ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے، جب میدان کارزار میں مڈبھیڑ ہوتی تو بھاگتے نہیں تھے۔

تعداد رکعات تہجد: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تہجد کی رکعات کے بارے میں مختلف تھی۔ چار، چھ، آٹھ، دس رکعات تک بھی منقول ہیں۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي قَيْسٍ، قَالَ: قُلْتُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: بِكَمْ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوتِرُ؟ قَالَتْ: كَانَ يُوتِرُ بِأَرْبَعٍ وَثَلَاثٍ، وَسِتٍّ وَثَلَاثٍ، وَثَمَانٍ وَثَلَاثٍ، وَعَشْرٍ وَثَلَاثٍ، وَلَمْ يَكُنْ يُوتِرُ بِأَنْقَصَ مِنْ سَبْعٍ، وَلَا بِأَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ) سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۰۰ باب فی صلوۃ اللیل) حضرت عبد اللہ بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا چار اور تین کے ساتھ، چھ اور تین کے ساتھ، آٹھ اور تین کے ساتھ آپ کی وتر (مع تہجد) کی رکعتیں نہ تیرہ سے زیادہ ہوتی تھیں اور نہ سات سے کم۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ تِسْعَ رَكَعَاتٍ فِيْهِنَّ الْوِتْرُ (صحیح ابن خزیمۃ ج ۱ ص ۵۷۷) رسول اللہ

ﷺ رات کو نو رکعت پڑھتے تھے، ان میں وتر بھی ہوتی تھی۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم صَلّٰی بَعْدَ الْعَتَمَۃِ ثَلَاثَ عَشَرَۃَ رَکْعَۃً۔ (صحیح ابن خزیمۃ ج ۱ ص ۵۷۶) رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے بعد تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔

نبی کریم ﷺ مندرجہ بالا رکعات مختلف اوقات میں پڑھتے تھے، لیکن اکثر معمول آٹھ رکعت تہجد کا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، مَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَزِیْدُ فِیْ رَمَضَانَ وَلَا فِیْ غَیْرِہٖ عَلٰی اِحْدٰی عَشَرَۃَ رَکْعَۃً (بخاری، مسلم، نسائی) حضور ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے (آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر)

ترتیلِ قرآن: اور قرآن شریف کو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا کہ خوب سمجھتا جائے، اس حکم کے بھی حضور ﷺ عامل تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ کَانَ یَقْرَأُ السُّوْرَۃَ فَیُرَتِّلُھَا، حَتّٰی تَکُوْنَ أَطْوَلَ مِنْ أَطْوَلَ مِنْھَا، آپ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے بڑی دیر میں سورت ختم ہوتی تھی گویا چھوٹی سی سورت بڑی سے بڑی ہو جاتی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کا وصف پوچھا جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کَانَتْ مَدًّا، ثُمَّ قَرَأَ {بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ} یَمُدُّ بِسْمِ اللّٰہِ وَیَمُدُّ الرَّحْمٰنِ، وَیَمُدُّ الرَّحِیْمِ (بخاری) نبی کریم ﷺ خوب لمبا کر کے پڑھا کرتے تھے پھر آیت (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر سنائی جس میں لفظ اللہ پر لفظ رحمٰن پر لفظ رحیم پر مد کیا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی قرأت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی قرأت کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کَانَ یُقَطِّعُ قِرَاءَتَہٗ آیَۃً آیَۃً، {بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ

الرَّحِيمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ} (احمد، ترمذی) ہر آیت پر آپ پورا پورا وقف کرتے تھے، جیسے آیت (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر وقف کرتے آیت (الحمد للہ رب العالمین) پڑھ کر وقف کرتے آیت (الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر وقف کرتے آیت (مالک یوم الدین) پڑھ کر ٹھہرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ: اقْرَأْ وارْقَ، ورَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا (مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، ترمذی) قرآن کے قاری سے قیامت والے دن کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور جنت کے درجے چڑھتا جا اور ترتیل سے پڑھ جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا تیرا درجہ وہ ہے جہاں تیری آخری آیت ختم ہو۔

ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ زَيِّنوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ، قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ، اور ہم میں سے وہ نہیں جو خوش آوازی سے قرآن نہ پڑھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ لَقَدْ أُوتِيَ هٰذَا مِزْمَارًا مِّنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ، اسے آل داؤد کی خوش آوازی عطا کی گئی ہے اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمانا کہ لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّكَ كُنْتَ تَسْمَعُ قِرَاءَتِي لَحَبَّرْتُهُ لَكَ تَحْبِيرًا (مسند احمد) اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور اچھے گلے سے زیادہ عمدگی کے ساتھ پڑھتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان کہ لَا تَنْثُرُوهُ نَثْرَ الرَّمْلِ وَلَا تَهُذُّوهُ هَذَّ الشِّعْرِ، قِفُوا عِنْدَ عَجَائِبِهِ، وَحَرِّكُوا بِهِ الْقُلُوبَ، وَلَا يَكُنْ هَمُّ أَحَدِكُمْ آخِرَ السُّورَةِ. (معالم التنزیل) ریت کی طرح قرآن کو نہ بکھیرو اور شعروں کی طرح قرآن کو بے ادبی سے نہ پڑھو اس کے عجائب پر غور کرو اور دلوں کے تار ہلاتے جاؤ اور اس میں دوڑ نہ لگاؤ کہ جلد سورت ختم ہو۔

ایک شخص آکر حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہتا ہے میں نے مفصل کی تمام سورتیں آج کی رات ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالیں آپ نے فرمایا هَذًّا كَهَذِّ الشِّعْرِ، لَقَدْ عرفت النَّظَائِرَ الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرِنُ بَيْنَهُنَّ، فَذَكَرَ عِشْرِينَ سُورَةً مِنَ الْمُفَصَّلِ سُورَتَيْنِ فِي رَكْعَةٍ، پھر تو تو نے شعروں کی طرح جلدی جلدی پڑھا ہو گا مجھے برابر برابر کی سورتیں خوب یاد ہیں جنہیں رسول کریم ﷺ ملا کر پڑھا کرتے تھے پھر مفصل کی سورتوں میں سے بیس سورتوں کے نام لئے کہ ان میں سے دو دو سورتیں حضور ﷺ ایک ایک رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔(بخاری شریف، تفسیر ابن کثیر) ایک مسلمان کی خوش نصیبی ہے کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت اس طرح کرے جس طرح حضرت نبی کریم ﷺ کیا کرتے تھے۔

قَولاً ثَقِيلاً سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں قول ثقیل سے کیا مراد ہے؟ جو اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی طرف بھیج رہے تھے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا {۵} المزمل

جواب ترجمہ: بیشک ہم آپ پر عنقریب ایک بھاری کلام ڈالنے والے ہیں۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ پر قرآن کریم اتارنے والے ہیں، جس میں اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی اور اسی طرح اس میں شرعی احکامات بھی موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ پر عنقریب بھاری بوجھل بات اتاریں گے، یعنی عمل میں ثقیل ہو گی اور اترتے وقت بوجہ اپنی عظمت کے گراں قدر ہو گی، حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ أُنْزِلَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَخِذُهُ عَلَى فَخِذِي، فَكَادَتْ تُرْض

فَخِذی (بخاری) ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر وحی اتری اس وقت آپ کا گھٹنا میرے گھٹنے پر تھا وحی کا اتنا بوجھ پڑا کہ میں تو ڈرنے لگا کہ میری ران کہیں ٹوٹ نہ جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وحی کا احساس بھی آپ کو ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا أسمعُ صَلاصيل، ثُمَّ أسكتُ عِنْدَ ذَلِكَ، فَمَا مِنْ مَرَّةٍ يُوحَى إِلَيَّ إِلَّا ظَنَنْتُ أَنَّ نَفْسِي تَفِيضُ (مسند احمد) میں ایسی آواز سنتا ہوں جیسے کسی زنجیر کے بجنے کی آواز ہو میں چپکا ہو جاتا ہوں جب بھی وحی نازل ہوتی ہے مجھ پر اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری جان نکل جائے گی۔

حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے فرمایا أَحْيَانًا يَأْتِينِي فِي مِثْلِ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ، وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ، کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح ہوتی ہے جو مجھ پر بہت بھاری پڑتی ہے اور وہ گن گناہٹ کی آواز ختم ہو جاتی ہے تو میں اس میں جو کچھ کہا گیا وہ مجھے خوب محفوظ ہو جاتا ہے اور کبھی فرشتہ انسانی صورت میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور میں یاد کر لیتا ہوں۔ (بخاری شریف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ، فَيُفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا (بخاری) میں نے دیکھا ہے کہ سخت جاڑے والے دن میں بھی جب آپ پر وحی اتر چکتی تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے ٹپکتے۔

مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ إِنْ كَانَ ليوحَى إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، فَتَضْرِبُ بِجِرَانِهَا، کبھی اونٹنی پر حضور ﷺ سوار ہوتے اور اسی طاقت میں وحی آتی تو اونٹنی جھک جاتی۔

ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أُوحِيَ إِلَيْهِ وَهُوَ عَلَى نَاقَتِهِ، وَضَعَتْ جِرَانَهَا، فَمَا تَسْتَطِيعُ أَنْ تَحَرَّكَ حَتَّى يُسَرَّى عَنْهُ (ابن جریر) جب نبی کریم ﷺ کے اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں وحی کی جاتی تو پھر جب تک وحی ختم نہ ہولے اونٹنی سے قدم نہ اٹھایا جاتا نہ اس کی گردن اونچی ہوتی۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وحی کا اترنا بھی اہم اور بوجھل تھا پھر احکام کا بجالانا اور ان کا عامل ہونا بھی اہم اور بوجھل تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن سے منقول ہے کہ كَمَا ثَقُلَ فِي الدُّنْيَا ثَقُلَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الْمَوَازِينِ، جس طرح دنیا میں یہ ثقیل کام ہے اسی طرح آخرت میں اجر بھی بڑا بھاری ملے گا۔

رات میں عبادت کی اہمیت

سوال اوقات میں وہ کون سا وقت ہے جس میں دل کے اندر عبادت کے لیے خشوع زیادہ پایا جاتا ہے اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس آیت مبارکہ کی روشنی میں وضاحت کی جائے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا {٦} المزمل.

جواب ترجمہ: بیشک رات کے وقت اٹھنا ہی ایسا عمل ہے جس سے نفس اچھی طرح کچلا جاتا ہے، اور بات بھی بہتر طریقے پر کہی جاتی ہے۔

رات کا درمیانی اور آخری حصہ ہی وہ وقت ہے جس میں دل کے اندر زیادہ تاثیر پیدا ہوتی ہے، اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جس میں دنیا کے مشاغل اور مصروفیات کی طرف بندے کا ذہن منتقل نہیں ہوتا، اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ دیا جارہا ہے۔

رات کا اٹھنا نفس کو زیر کرنے کے لئے اور زبان کو درست کرنے کے لئے اکسیر ہے، نشاء کے معنی حبشی زبان میں قیام کرنے کے ہیں، رات بھر میں جب اٹھے اسے ناشئۃ اللیل کہتے ہیں، تہجد کی

نماز کی خوبی یہ ہے کہ دل اور زبان ایک ہو جاتا ہے اور تلاوت کے جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں دل میں گڑ جاتے ہیں اور بنسبت دن کے رات کی تنہائی میں معنی خوب ذہن نشین ہوتا جاتا ہے کیونکہ دن بھیڑ بھاڑ کا، شور غل کا، کمائی دھندے کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آیت اَقۡوَمُ قِیۡلًا کو اصوب قیلا پڑھا تو لوگوں نے کہا ہم تو اقوم پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا إِنَّ أَصْوَبَ وَأَقْوَمَ وَأَهْيَأَ وَأَشْبَاهَ هَذَا وَاحِدٌ اور ان جیسے سب الفاظ ہم معنی ہیں۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ "یعنی رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے سے انسان کے لیے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔ اور رات کے وقت میں چونکہ شور و غل نہیں ہوتا، اس لیے تلاوت اور دعا ٹھیک ٹھیک اور حضور قلب کے ساتھ ادا ہوتی ہیں۔ دن کے وقت یہ فائدے کم ہوتے ہیں۔ (آسان ترجمہ قرآن)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اس بنا پر یہ حکم اس وقت تھا جب رات کی نماز فرض تھی پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان کیا اور بطور تخفیف کے اس میں کمی کر دی اور فرمایا تھوڑی سی رات کا قیام کرو۔

اس فرمان کے بعد حضرت عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم نے اِنَّ رَبَّكَ سے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْه (المزمل:۲۰) تک پڑھا اور آیت {وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا} (الإسراء:۷۹) کی بھی تلاوت کی۔ آپ کا یہ قول ہے بھی ٹھیک، مسند احمد میں ہے کہ حضرت سعید بن ہشام نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور مدینہ کی طرف چلے تاکہ وہاں کے اپنے مکانات بیچ ڈالیں اور ان کی قیمت سے ہتھیار وغیرہ خرید کر جہاد میں جائیں اور رومیوں سے لڑتے رہیں یہاں تک کہ یا تو روم فتح ہو یا شہادت ملے مدینہ شریف میں اپنی قوم والوں سے ملے اور اپنا

ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا سنو رسول اللہ ﷺ کی حیات میں آپ ہی کی قوم میں سے چھ شخصوں نے بھی ارادہ کیا تھا کہ عورتوں کو طلاق دے دیں مکانات وغیرہ بیچ ڈالیں اور راہ اللہ کھڑے ہو جائیں۔

حضور ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے ان سے فرمایا کیا جس طرح میں کرتا ہوں کیا اس طرح کرنے میں تمہارے لئے اچھائی نہیں ہے؟ خبر دار ایسا نہ کرنا اپنے اس ارادے سے باز آجاؤ یہ حدیث سن کر حضرت سعید نے بھی اپنا ارادہ ترک کیا اور وہیں اسی جماعت سے کہا کہ تم گواہ رہنا میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا اب حضرت سعید چلے گئے پھر جب اس جماعت سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ یہاں سے جانے کے بعد میں حضرت عبد اللہ بن عباس کے پاس گیا اور ان سے آنحضرت ﷺ کے وتر پڑھنے کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے کہا اس مسئلے کو سب سے زیادہ بہتر طور پر حضرت عائشہ بتا سکتی ہیں تم وہیں جاؤ اور ام المومنین ہی سے دریافت کرو اور ام المومنین سے جو سنو وہ ذرا مجھ سے کہہ جانا۔ میں حضرت حکیم بن افلح کے پاس گیا اور ان سے میں نے کہا تم مجھے ام المومنین کی خدمت میں لے چلو۔

انہوں نے فرمایا میں وہاں نہیں جاؤں گا اس لئے کہ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپس میں لڑنے والی جماعتوں یعنی حضرت علی اور ان کے مقابلین کے بارے میں آپ دخل نہ دیجئے لیکن انہوں نے نہ مانا اور دخل دیا۔ میں نے انہیں قسم دی اور کہا کہ نہیں آپ مجھے ضرور وہاں لے چلئے خیر بمشکل تمام وہ راضی ہوئے اور میں ان کے ساتھ گیا۔ ام المومنین صاحبہ نے حضرت حکیم کی آواز پہچان لی اور کہا کیا حکیم ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں حضور میں حکیم بن افلح ہوں پوچھا تمہارے ساتھ کون ہیں؟ کہا سعید بن ہشام پوچھا ہشام کون؟ عامر کے لڑکے؟ کہا ہاں عامر کے لڑکے، تو حضرت عائشہ نے حضرت عامر کے لئے دعاء رحمت کی اور فرمایا عامر بہت اچھا آدمی تھا اللہ اس پر رحم کرے میں نے کہا ام المومنین مجھے بتایئے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟

آپ نے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ فرمایا بس حضور ﷺ کا خلق قرآن تھا اب میں نے اجازت مانگنے کا قصد کیا لیکن فوراً ہی یاد آگیا کہ رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز

کا حال بھی دریافت کرلوں، اس سوال کے جواب میں ام المومنین نے فرمایا کیا تم نے سورۃ مزمل نہیں پڑھی؟ میں نے کہا ہاں پڑھی ہے، فرمایا سنو اس سورت کے اول حصے میں قیام الیل فرض ہوا اور سال بھر تک حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب تہجد کی نماز بطور فرضیت کے ادا کرتے رہے یہاں تک کہ قدموں پر ورم آگیا بارہ ماہ کے بعد اس سورت کے خاتمہ کی آیتیں اتریں اور اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی فرضیت اٹھ گئی اور عملی صورت باقی رہ گئی۔

میں نے پھر اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن خیال آیا کہ وتر کا مسئلہ بھی دریافت کرلوں تو میں نے کہا ام المومنین حضور ﷺ کے وتر پڑھنے کی کیفیت سے بھی آگاہ فرمایئے، آپ نے فرمایا ہاں سنو ہم آپ کی مسواک وضو کا پانی وغیرہ تیار کرکے ایک طرف رکھ دیا کرتے تھے جب بھی اللہ چاہتا اور آپ کی آنکھ کھلتی اٹھتے مسواک کرتے وضو کرتے اور آٹھ رکعت پڑھتے۔

جب آپ عمر رسیدہ ہوئے اور بدن بھاری ہوگیا تو آپ نے سات وتر پڑھے پھر سلام پھیرنے کے بعد بیٹھ کر دو رکعت ادا کیں بس بیٹا یہ نو رکعت ہوئیں اور حضور ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کسی نماز کو پڑھتے تو پھر اس پر مداومت کرتے ہاں اگر کسی شغل یا نیند یا دکھ تکلیف اور بیماری کی وجہ سے رات کو نماز نہ پڑھ سکتے تو دن کو بارہ رکعت ادا فرمالیا کرتے، میں نہیں جانتی کہ کسی ایک رات میں رسول اللہ ﷺ نے پورا قرآن صبح تک پڑھا ہو اور نہ رمضان کے سوا کسی اور مہینے کے پورے روزے رکھے۔

اب میں ام المومنین سے رخصت ہو کر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور وہاں کے تمام سوال جواب دوہرائے آپ نے سب کی تصدیق کی اور فرمایا اگر میری بھی آمد و رفت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے پاس ہوتی تو جاکر خود اپنے کانوں سن آتا۔ (مسلم)

ابن جریر میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نبی ﷺ کے لئے بوریا رکھ دیا کرتی جس پر آپ تہجد کی نماز پڑھتے لوگوں نے کہیں یہ خبر سن لی اور رات کی نماز میں حضور ﷺ کی اقتداء کرنے

کے لئے وہ بھی آ گئے حضور ﷺ غضبناک ہو کر باہر نکلے چونکہ شفقت و رحمت آپ کو امت پر تھی اور ساتھ ہی ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو یہ نماز فرض ہو جائے آپ ان سے فرمانے لگے کہ لوگو! ان ہی اعمال کی تکلیف اٹھاؤ جن کی تم میں طاقت ہو اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہ تھکے گا البتہ تم عمل کرنے سے تھک جاؤ گے سب سے بہتر عمل وہ ہے جس پر دوام ہو سکے ادھر قرآن کریم میں یہ آیتیں اتریں اور صحابہ نے قیام اللیل شروع کیا یہاں تک کہ رسیاں باندھنے لگے کہ نیند نہ آجائے آٹھ مہینے اسی طرح گذر گئے ان کی اس کوشش کو جو وہ اللہ کی رضامندی کی طلب میں کر رہے تھے دیکھ کر اللہ نے بھی ان پر رحم کیا اور اسے فرض عشاء کی طرف لوٹا دیا اور قیام الیل چھوڑ دیا (ابن ابی حاتم راوی موسیٰ بن عبیدہ زبیدی ضعیف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن ابی حاتم میں منقول ہے کہ سورۃ مزمل کی ابتدائی آیتوں کے اترنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثل رمضان شریف کے قیام کے قیام کرتے رہے اور اس سورت کی اول آخر کی آیتوں کے اترنے میں تقریباً سال بھر کا فاصلہ تھا۔

حضرت ابو اسامہ رضی اللہ عنہ سے بھی ابن جریر میں اسی طرح مروی ہے، حضرت ابو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابتدائی آیتوں کے اترنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سال بھر تک قیام کیا یہاں تک کہ ان کے قدم اور پنڈلیوں پر ورم آ گیا پھر آیت (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل:۲۰) نازل ہوئی اور لوگوں نے راحت پائی۔

ابن ابی حاتم میں بہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سولہ مہینے کا فاصلہ مروی ہے، حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک سال یا دو سال تک قیام کرتے رہے پنڈلیاں اور قدم سوج گئے پھر آخری سورت کی آیتیں اتریں اور تخفیف ہو گئی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ دس سال کا فاصلہ بتاتے ہیں (ابن جریر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلی آیت کے حکم کے مطابق ایمانداروں نے قیام اللیل شروع کیا لیکن بڑی مشقت

پڑتی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور آیت عَلِمَ اَنۡ سَیَکُوۡنُ مِنۡکُمۡ مَّرۡضٰی (المزمل :۲۰) سے مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ تک آیتیں نازل فرما کر وسعت کر دی اور تنگی نہ رکھی۔

دن کی مشغولیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا {۷} المزمل

جواب ترجمہ: بلاشبہ دن میں آپ کو زیادہ کام میں مشغولیت رہتی ہے۔

دن میں آپ کو بہت فراغت ہے، نیند کر سکتے ہیں، سو بیٹھ سکتے ہیں، راحت حاصل کر سکتے ہیں، نوافل بکثرت ادا کر سکتے ہیں، دنیوی کام کاج پورے کر سکتے ہیں۔ پھر رات کو آخرت کے کام کے لئے خاص کر لیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یعنی دن میں لوگوں کو سمجھانا اور دوسرے کئی طرح کے مشاغل رہتے ہیں۔ گو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بالواسطہ عبادت ہیں۔ تاہم بلاواسطہ پروردگار کی عبادت اور مناجات کے لیے رات کا وقت مخصوص رکھنا چاہیے۔ اگر عبادت میں مشغول ہو کر رات کی بعض حوائج چھوٹ جائیں تو کچھ پروا نہیں۔ دن میں ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ (عثمانی)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں "لفظ سبح کے لفظی معنیٰ جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سبح اور سباحت کہا جاتا ہے کہ پانی میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیراکی کے ساتھ آسان ہے۔ یہاں مراد سبح سے دن بھر کے مشاغل ہیں جن میں تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کے لئے یا اپنی معاشی مصالح کے لئے چلنا پھرنا سب داخل ہیں۔

اس آیت میں قیام اللیل کے حکم کی تیسری حکمت و مصلحت کا بیان ہے یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کے لئے عام ہے وہ یہ کہ دن میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دوسرے سبھی

حضرات کو بہت سے مشاغل چلنے پھرنے کے رہتے ہیں، فراغ بالی سے عبادت میں توجہ مشکل ہوتی ہے رات کا وقت اس کام کے لئے رہنا چاہیے کہ بقدر ضرورت نیند اور آرام بھی ہو جائے اور قیام اللیل کی عبادت بھی۔

فائدہ:۔ حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء و مشائخ جو تعلیم و تربیت اور اصلاحِ خلق کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں، رات کا وقت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ علمائے سلف رحمہم اللہ کا تعامل اور اس پر شاید ہی کوئی وقتی ضرورت دینی، تعلیمی، تبلیغی کبھی اتفاقاً رات کو بھی اس میں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ بقدر ضرورت مستثنیٰ ہے، اس کی شہادت بھی بہت سے حضرات علماء و فقہاء رحمہم اللہ کے عمل سے ثابت ہے۔ (معارف القرآن)

ذِکر الٰہی اور عبادت میں یکسُوئی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے نیز یہ بتایئے کہ آیت کریمہ میں جو تبتل اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا مفہوم اور مراد کیا ہے؟

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا {۸} المزمل

جواب ترجمہ: اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو، اور سب سے الگ ہو کر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو۔

اللہ فرماتے ہیں کہ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہ اور ہر طرف سے ہٹ کٹ کر اسی کے ہو کر رہیں، اسی کی بندگی میں مشغول و مصروف رہیں، یعنی امور دنیا سے فارغ ہو کر دل جمعی اور اطمینان کے ساتھ بہ کثرت اس کا ذکر کریں، اس کی طرف مائل اور سراسر راغب ہو جائیں، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ {فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ} (الشَّرح:۷) یعنی جب اپنے شغل سے فارغ ہو تو ہماری عبادت محنت سے بجالاؤ، اخلاص فارغ البالی

کوشش محنت دل لگی اور یکسوئی سے اللہ کی طرف جھک جاؤ۔

حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس مقام پر بہت ہی خوبصورت انداز میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں ''اِنقطاع غیر اللہ: چنانچہ اس میں ایک جملہ تو وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ہے اس میں ذِکر اللہ کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے اور تبتل الیہ تبتیلًا میں اِنقطاع کا حکم ہے۔ کیونکہ لغت میں تبتل کے معنی اِنقطاع ہی کے ہیں۔ رہا یہ کہ انقطاع کس سے ؟ تو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے اِنقطاع تو مراد نہیں کیونکہ الیہ میں صلہ اِلی خود بتلا رہا ہے کہ اِنقطاع کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے پس اِنقطاع غیر اللہ سے مراد ہو گا۔

بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو صرف تبتل الیہ یہی ایک جملہ دونوں باتوں سے بیان کے لئے کافی تھا کیونکہ جن لوگوں کی نظر عربیت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ تبتل و اِنقطاع کا اصلی صلہ عَن ہے جو اس چیز پر داخل ہوتا ہے جس سے تعلق قطع کیا جاتا ہے اور اس کا اصلی صلہ اِلی نہیں ہے بلکہ یہ عارضی صلہ ہے اور جس وقت اس کے بعد اِلی ہوتا ہے اور اس وقت یہ معنیٰ وصول کو متضمن ہوتا ہے اس کو اہلِ بلاغت تضمین کہتے ہیں۔

پھر کبھی تو ایسے ہوتا ہے کہ متضمِن و متضمَن دونوں کا صلہ مذکور ہوتا ہے۔ اس وقت تبتل کا استعمال عَن واِلی دونوں کے ساتھ ہو گا اور کبھی صرف اِلی مذکور ہوتا ہے جو کہ معنیٰ وصول کا صلہ ہے جس کو تبتل کے ضمن میں لیا گیا ہے اور اس کا مدخول وہ ہوتا ہے جس سے وصل ہو گا اور اصلی صلہ یعنی عن مع اپنے مدخول سے حذف کر دیا جاتا ہے مگر لفظوں ہی سے حذف ہوتا ہے ارادہ سے حذف نہیں ہوتا بلکہ ارادہ میں ملحوظ ہوتا ہے اور اس کو حذف اس لئے کر دیتے ہیں کہ وہ تو اس لفظ کا اصلی صلہ ہے اگر محذوف بھی ہو گا تو سننے والے خود سمجھ لیں گے چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا ہے کہ تبتل کا عارضی صلہ الی مذکور ہے اور اصل صلہ عن مقدر ہے۔

لفظ اِلیٰ سے معلوم ہو گیا کہ تبتل معنی وصل کو متضمِن ہے پس معنیٰ یہ ہوئے کہ تَبَتَّلْ عَنِ الخَلقِ اِلَیہِ یعنی مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جایئے تو چونکہ یہاں معنی اِنقطاع لفظ تبتل سے اور معنی وصل صلہ اِلی سے مفہوم ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہی ایک جملہ وَصَل و فصل دونوں پر دلالت کر رہا ہے۔ (اشرف التفاسیر، لشاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ طریق توجہ کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ اب سوال ہو گا کہ پھر وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کی کیا ضرورت تھی کہ کیا یہ زائد ہوا؟ تو خوب سمجھ لو کہ یہ بھی زائد نہیں کیونکہ گو تبتل الیہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہو گیا مگر اس میں طریق توجہ کا ذکر نہ تھا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس کے بتلانے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ توجہ کے جتنے طریقے ہیں یہاں سب متعذر ہیں۔

توجہ کا ایک طریقہ تو مشاہدہ یعنی رویت ہے اور یہاں حق تعالیٰ کا یہ مشاہدہ نہیں ہو سکتا ہاں آخرت میں ہو گا چنانچہ حدیث مسلم میں ہے لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا ہر گز نہ دیکھو گے اپنے رب کو مرنے سے پہلے اس سے جیسے دنیا میں مشاہدہ کی نفی ہوئی ایسے ہی مرنے کے بعد رویت کا اثبات ہو رہا ہے۔

تبتل الیہ میں وصل و فصل دونوں مذکور ہیں اور یہی خلاصہ ہے طریق کا مگر اس جگہ طریق کا مبتدا منتہیٰ بتایا گیا ہے کہ فصل مبدء طریق ہے اور وصل منتہی اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ وسائط بھی ہیں کیونکہ فصل کے درجات ہیں ناقص اور متوسط اور اعلیٰ پھر جیسا فصل ہوتا جائے گا ویسا ویسا وصل حاصل ہوتا جائے گا، جب تک فصل ناقص ہے وصل بھی ناقص ہے اور جب فصل متوسط ہو گا وصل بھی متوسط ہوتا جائے گا اور جس دن فصل کامل ہو جائے گا فوراً وصل بھی کامل ہو جائے گا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھتا ہوں کہ مشائخ کا مریدوں کے اجتماع و ہجوم سے جی نہیں گھبراتا، نہ ان کی تعظیم و تکریم سے الجھن ہوتی ہے حالانکہ ضرورت ہے کہ کوئی وقت ایسا ہو کہ

جس میں مخلوق سے یکسو ہو کر خالق کی طرف متوجہ رہا جائے بھلا اور تو کس شمار میں ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کو بھی امر ہے وتبتل الیہ تبتیلًا جس میں مفعول مطلق تاکید کے لئے، حاصل یہ ہوا کہ مخلوق سے کامل طور پر منقطع ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ کامل توجہ بدون تقلیل تعلقات کے ہر گز نہیں ہو سکتی تو مشائخ اور سالکین کو تعلقات قائم کرنے کا اہتمام نہ ہونا چاہیے اور لوگوں کے اجتماع و ہجوم سے پریشانی اور تعظیم وغیرہ سے الجھن ہونی چاہیے یہ مذاق پیدا کرو کیونکہ کمال وصول بدون اس کے نہیں ہو سکتا سو اگر ان آفات سے بچنا چاہتے ہو تو تجربہ کی بناء پر میری رائے یہ ہے کہ کٹر ملا بن کر رہو کہ نہ وہ حق ہو نہ تعویذ گنڈوں کا سلسلہ ہو، درویشوں کا رنگ نہ اختیار کرو، اس سے ہجوم خلق ہوتا ہے بلکہ ملانے بن کر رہو تاکہ لوگ صورت دیکھ کر یہ سمجھیں کہ یہ سب خشک مولوی ہیں اور متعلقین کو بھی ایسا بننے کی تاکید کرو۔ (اشرف التفاسیر)

ضرورت وصل و فصل: حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ وصل و فصل دونوں کا اہتمام کرو۔ خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو، ان شاء اللہ ناکامی نہ ہو گی اور اگر مشائخ محققین موجود ہوں تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط و کتابت سے مراجعت کرو اور عمل کا اہتمام بدون عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے اس طریق میں باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے پھر حال بھی خود مطلوب نہیں بلکہ اصل مطلوب عمل ہے کیفیات و احوال کی ضرورت بھی عمل ہی کے لئے ہے ورنہ خود کیفیات احوال مقصود نہیں ہیں مگر چونکہ حال سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے، بدون حال کے عادتاً کام نہیں چلتا۔ (اشرف التفاسیر)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور یاد رکھو کہ حال بھی عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے بدون عمل کے حال وغیرہ کچھ حاصل نہیں ہوتا عمل ہی کی برکت سے ظاہر حال بن جاتا ہے اس پر شاید یہ شبہ ہو

کہ ابھی تو تم نے عمل کے لئے حال کی ضرورت بتلائی تھی اور اب حال کے لئے عمل کو ضروری کر دیا یہ تو دور ہو گیا تو بات یہ ہے کہ دور جب لازم آتا ہے کہ موقوف و موقوف علیہ متحد ہوں اور یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حصول حال اختیار عمل پر موقوف نہیں عمل بدون حال کے بھی ہو سکتا ہے گو مشقت سے ہو تو ایک جگہ حصول موقوف ہے اور دوسری جگہ سہولت و دوام اس لئے دور نہیں پس حاصل یہ ہوا کہ اول تو ہمت کر کے عمل میں لگے یہاں تک کہ حال پیدا ہو جائے پھر حال پیدا ہونے کے بعد عمل میں ہمت و مجاہدہ کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ سہولت سے ہونے لگے گا۔ (اشرف التفاسیر)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ذات حق کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ بیان فرمایا کہ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں بھی یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اس لئے یہ جملہ زیادہ نہیں۔ حاصل طریقہ کا یہ ہے کہ گو ذاتِ حق کی طرف توجہ تام نہیں ہو سکتی مگر تم اس کو یاد ہی کرتے رہو، بس یہی توجہ ذکری کافی ہے اور اسی سے مطلوب حاصل ہو جائے گا، گو ذکر کے وقت تمہارے ذہن میں ذات کا تصور حقیقی نہ ہو گا، بالوجہ ہی ادراک ہو گا، مگر یہی کافی ہے بلکہ اگر مسمّٰی کا تصور بالکل نہ ہو، محض اسم اللہ ہی کا تصور ہو تو یہ بھی کافی ہے اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس جملہ میں لفظ اسم بھی زائد نہیں گو بعض نے اس کو زائد کہا ہے مگر اسلم وراجح یہ ہے کہ زائد نہ ہو کیونکہ توجہ الی اللہ کا طریقہ ابتداء میں یہی ہے، کہ توجہ الی الاسم کی جائے یہ عقدہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کی برکت سے حل ہوا۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ذکر میں اول تو توجہ الی المذکور چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو توجہ الی الذکر ہی کر لے اس سے بھی شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ ہو جاتی ہے گو اس کی توجہ ذکر کی طرف ہے بلکہ اگر توجہ الی المذکور کے ساتھ بھی توجہ الی الذکر ہو تب بھی اس کو توجہ الی المذکور میں مخل سمجھ کر اس کی نفی نہ کرے کیونکہ بالذات اس کی توجہ مذکور ہی کی طرف ہو گی اور ذکر کی طرف طبعاً توجہ ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کامل ذکر کے لئے خلوت (تنہائی) ضروری ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا تبتیل سے پہلے إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا فرمایا یعنی دن میں کام زیادہ رہتا ہے اور اس وجہ سے ذکر و تبتیل کے لئے فراغ نہیں ہوتا اس لئے شب کا وقت اس کے واسطے تجویز کیا گیا اور اس کا راز یہ ہے کہ برکت تعلیم کے لئے ضرورت ہے نور کی اور نور پیدا ہوتا ہے ذکر کامل سے اور ذکر کامل کے لئے ضروت ہے خلوت کی۔ اس لئے بزرگوں نے یہاں تک اہتمام کیا ہے قلب کو بجز ذات واحد کے کسی طرف متوجہ نہ کرنا چاہیے اور وہ ذات حق تعالیٰ کی ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

دلآرامی کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

دوسرے یہ کہ اذکروا اللہ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) یا واذکر اسم ربک (اپنے رب کے نام کی یاد کرو) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔ ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ذکر کے اصلی معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرآن سے اس پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد، اب دیکھ لیجیے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔ (اشرف التفاسیر)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اقسام ذکر کے تحت اسی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ذِکر کے متعلق اہلِ علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے واذکر اسم ربک (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں لفظ اسم کو زائد رکھا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذاکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور، اس لئے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ

مبتدی کے لئے واذکر اسم ربک ہے اور منتہی کے لئے و تبتل الیہ تبتیلًا ہے کیونکہ مبتدی کے لئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اس کی زبان پر آجاوے یا قلب میں نام آجائے۔ ذکر لفظی کی بھی کئی صورتیں ہیں ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک متصور۔ منطوق تو ظاہر ہے متصور مثال سے سمجھ لیجیے۔

اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں، ایک لسانی ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں، ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقوف نہیں بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقوف ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے، البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے یہ بیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقوف ہے پس ذکر قلبی ہی اپنی دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے، گو سونے کے بعد نہ ہو، سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں، اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا، کھاتے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے مثلاً جہاں ریا کا شبہ ہو، ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔ مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قرأت میں متعدی نہ کر لیجیے کیونکہ نماز میں قرأت و تکبیرات و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہو گی، ہاں گونگا البتہ معذور ہے اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔ (اشرف التفاسیر للشاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ)

تبتل کا معنیٰ اور مفہوم: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابو صالح رحمہ اللہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت عطیہ رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تبتل کا معنیٰ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت

کرو۔(ابن کثیر)حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تبتل کا معنیٰ ہے خوب کوشش کریں اور اپنے نفس کو اس کی طرف یکسو کرلیں۔(ابن کثیر)حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبادت گزار آدمی کو متبتل کہاجاتا ہے۔(ایضاً)

حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”اپنا پورا قلبی رخ اللہ کی طرف رکھیے یعنی اللہ تعالیٰ سے جو تعلق ہے اس تعلق کے مظاہرے اور آثار ہر تعلق پر غالب رکھیے بظاہر بیویوں سے بھی تعلق رہے اور اولاد سے بھی اولیاء اور اصدقاء سے بھی لیکن اللہ تعالیٰ کا تعلق بہر حال غالب رہے اس کے احکام کی ادائیگی میں کوئی فرق نہ آئے در حقیقت یہ بہت بڑی نصیحت ہے جو بھی بندہ پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے بھی ملتا جلتا ہے لیکن اس کا باطن اللہ کی یاد ہی سے معمور رہتا ہے اور مخلوق کو راضی رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کرتا۔(انوار البیان)

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ”تبتل اور تبتیل، دونوں کے معنی انقطاع الی اللہ کے ہیں یعنی خلق سے کٹ کر رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہو جانا، یہ اللہ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا جب لوگوں کی حق بیزاری اور دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامن رحمت میں پناہ گیر ہو جایا کرو اور اس کے لیے تمہیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس کے نام کو یاد کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کروگے تو وہ خود تمہیں اپنی پناہ میں لے لیں گا۔(تدبر قرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”یعنی علاوہ قیام لیل کے دن میں بھی (گو بظاہر مخلوق سے معاملات و علائق رکھنے پڑتے ہیں) لیکن دل سے اسی پروردگار کا علاقہ سب پر غالب رکھے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اسی کی یاد میں مشغول رہیے غیر اللہ کا کوئی تعلق ایک آن کے لیے ادھر سے توجہ کو ہٹنے نہ دے بلکہ سب تعلقات کٹ کر باطن میں اسی ایک کا تعلق باقی رہ جائے یایوں کہہ لو کہ

سب تعلقات اسی ایک تعلق میں مدغم ہو جائیں جسے صوفیہ کے ہاں " بے ہمہ و باہمہ " یا " خلوت درانجمن " سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

علامہ قطب شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تبتل کے معنی ہیں اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ جانا اور پوری طرح عبادت اور ذکر میں مشغول ہو جانا ہر شغل اور ہر تصور سے ایک طرف ہو جانا، اور اپنے مشاعر اور تصورات کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تبتل کا معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہو کر رہ جانا، یعنی اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو یہ جملہ بولا جاتا ہے، بتلت الشئی، یعنی میں نے اس چیز کو کاٹا، اس معنیٰ میں ان کا قول ہے، طَلَّقَهَا بَتَّةً بَتْلَةً ۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق بائنہ دی، هٰذِهِ صَدَقَةٌ بَتَّةً بَتْلَةً یہ صدقہ بائنہ ہے اپنے مالک سے منقطع ہے یعنی مالک کی صدقہ سے ملکیت ختم ہو چکی ہے، اس معنیٰ میں مریم بتول ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہو رہی تھیں راہب کو متبتل کہتے ہیں کیوں کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے۔

حدیث طیبہ میں تبتل سے نہی کی گئی ہے وہ لوگوں اور جماعتوں سے الگ تھلگ ہونا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے عربوں کے ہاں اس کا اصل معنی الگ تھلگ ہے، ابن عرفہ نے یہی کہا ہے جب کہ پہلا معنیٰ ان آثار کی وجہ سے زیادہ قوی ہے جو آثار ہم نے ذکر کیے ہیں یہ سوال کیا جاتا ہے، تبتیلا، کیوں کہا، تبتلًا نہیں کہا؟ تو اسے جواب دیا جائے گا، تبتل کا معنی بتل نفسہ ہے یعنی اپنے نفس کو الگ تھلگ کرنا تو آیات کے سروں کی موافقت کی وجہ سے تبتل کی جگہ تبتیلا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ (قرطبی)

مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ترجمہ قرآن پر تفسیری حاشیہ لکھنے والے مولانا نعیم الدین مرادآبادی لکھتے ہیں "یعنی عبادت میں انقطاع کی صفت ہو کہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی طرف مشغول نہ ہو، سب علاقہ قطع ہو جائیں، اسی کی طرف توجہ رہے۔ (خزائن العرفان)

ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے اپنے جس ارشاد گرامی میں تبتل سے منع فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے تعلقات توڑ کر، بیوی بچوں سے الگ ہو کر، علائق دنیویہ کو چھوڑ چھاڑ کر ایک طرف ہو جانا، دوسرے لفظوں میں جس کو ہم رہبانیت کہہ سکتے ہیں، جس کے بارے میں واضح طور پر ارشاد ہے کہ دین اسلام میں رہبانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، یہ دین عیسوی میں تھا کہ راہب دنیا سے کٹ کر جنگلوں میں جا بسیرے کرتے تھے اور وہیں مشغول عبادت رہتے تھے، مگر نبی کریم ﷺ کی امت میں ایسا نہیں ہے۔

عبادت اللہ کی اور بھروسہ بھی اللہ پر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا {۹} المزمل

جواب ترجمہ: وہ رب ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بس آپ اسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔

اللہ کی کبریائی، عظمت، مقام اور شان کا کیا کہنا، وہ مالک ہے وہ متصرف ہے مشرق مغرب سب اس کے قبضہ میں ہے اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں، اس لیے جس طرح آپ صرف اسی اللہ کی عبادت کرتے ہیں اسی طرح صرف اسی پر بھروسہ بھی رکھیے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے {فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ} (هُودٍ: ۱۲۳) اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ کر۔ یہی مضمون آیت {اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ} میں بھی ہے، اس معنیٰ کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں کہ عبادت، اطاعت، توکل اور بھروسہ کے لائق ایک اس کی پاک ذات ہے۔

یہاں آیت میں لفظ وکیل استعمال ہوا ہے، وکیل لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی کام سپرد کیا جائے۔ فاتخذہ وکیلا کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سب کاروبار معاملات اور حالات کو اللہ کے سپرد کرو۔ اسی کا نام اصطلاح میں توکل ہے۔

شیخ عبد الکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وکیل اسے کہتے ہیں جس کو کام سپرد کیے جائیں، یعنی اس پر اعتماد کیا جائے، تیرے کام اس کے سپرد کیے جائیں، اور تو اس پر بھروسہ کرے، یوں بھی کہا جائے کہ اگر آپ نے دونوں مخلوقوں میں سے کسی کو وکیل بنایا تو وہ تمہارے مال کو کاٹیں گے اور تم سے اجرت طلب کریں گے اور جب تم مجھے وکیل وکارساز بناؤ گے تو میں تمہیں زیادہ مال دوں گا اور تمہارا جر بڑھاؤں گا، یوں بھی کہا جائے کہ تیرا وکیل تجھ پر تیرے مال ہی میں سے خرچ کرے گا، جب میں تجھے دوں گا اور تجھ پر اپنا مال خرچ کروں گا، یوں بھی کہا جائے کہ تیرا وکیل مرتبے اور مقام میں تجھ سے کم ہی کیوں نہ ہو تو اسے باتیں بتا کر، بہت زیادہ کلام کر کے اٹھاتا ہے، جب میں تیرا رب ہوں، میں تیرا سردار ہوں، میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ تو میرے ساتھ بات کر اور میں تیرے ساتھ بات کروں۔ (تفسیر قشیری)

اس سورت میں جو احکام رسول اللہ ﷺ کو دیئے گئے ہیں یہ ان میں پانچواں حکم ہے۔ امام یعقوب کرخی رحمہ اللہ نے فرمایا اِنَّ مِن أَوَّلِ السُّورَةِ اِلَى هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِشَارَةٌ اِلَى مَقَامَاتِ السُّلُوكِ مِنَ الْخَلْوَةِ بِاللَّيلِ وَالاشتِغَال بِالقُرآنِ وَذِكر الرَّحمٰن وَنَفي مَا سِوَاهُ وَالتَّوَكُّلُ بِهِ، شروع سورت سے اس آیت تک مقامات سلوک کی طرف اشارہ ہے یعنی رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے خلوت۔ قرآن کریم میں اشتعال، ذکر اللہ پر دوام، ماسوی اللہ سے اعراض وترک تعلق، اللہ تعالیٰ پر توکل۔ (تفسیر مظہری)

توکل کے آخری حکم سے پہلے اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت رب المشرق والمغرب بیان کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو ذات پاک مشرق و مغرب یعنی سارے جہان کی پالنے والی اور ان کی تمام ضروریات ابتداء سے انتہا تک پورا کرنے کی متکفل ہے۔ توکل اور بھروسہ کرنے کے قابل صرف وہی ذات ہو سکتی ہے اور اس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے،

وَمَن يَّتَوَكَّل عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسبُهُ، یعنی جو شخص اللہ پر توکل (بھروسہ) کرتا ہے اللہ اس کے (سب مہمات و مشکلات کے لئے) کافی ہوتا ہے۔ (تفسیر معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

توکل کے معنیٰ شرعی: اللہ پر توکل اور بھروسہ کے یہ معنی نہیں کہ کسب معاش اور دفع بلا کے جو اسباب و آلات قدرت حق نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ان کو معطل کر کے اللہ پر بھروسہ کرو، بلکہ حقیقت توکل کی یہ ہے کہ اپنے مقاصد کے لئے اللہ کی دی ہوئی قوت و توانائی اور جو اسباب میسر ہیں ان سب کو پورا استعمال کرو مگر اسباب مادیہ میں غلو اور انہماک زیادہ نہ کرو اعمال اختیاریہ کو کر لینے کے بعد نتیجہ کو اللہ کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاؤ۔ (معارف القرآن)

حضرت نبی کریم ﷺ نے بہت ہی خوبصورت انداز میں توکل کا مفہوم بیان فرمایا ہے، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رسول کریم ﷺ نے فرمایا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجمِلُوا فِي الطَّلَبِ، فَإِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَستَوْفِيَ رِزْقَهَا وَإِنْ أَبْطَأَ عَنْهَا، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجمِلُوا فِي الطَّلَبِ، خُذُوا مَا حَلَّ، وَدَعُوا مَا حَرُمَ (ابن ماجہ) اے لوگو! اللہ سے ڈرو، طلب میں اچھا طریقہ اختیار کرو، کوئی شخص اس وقت تک ہر گز نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کر لے، اگر اس سے تاخیر ہو جائے تو اللہ سے ڈرو اور طلب میں اچھا طریقہ اختیار کرو، حلال کو لے لو اور حرام کو چھوڑ دو۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَستَكْمِلَ رِزْقَهَا، أَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجمِلُوا فِي الطَّلَبِ، روح القدس (جبریل امین) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کر لے اس لئے تم خدا سے ڈرو اور اپنے مقاصد کی طلب میں اختصار سے کام لو۔ زیادہ منہمک نہ ہو کہ قلب کی توجہ ساری انہیں مادی اسباب و آلات میں محصور ہو کر رہ جائے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ بندہ (حدوٹی) نے اجملوا میں دونوں معنیٰ

مراد لیے ہیں، اجملوا اجمال سے بھی معنیٰ مراد لیا ہے، جس کا معنیٰ اختصار سے کام لو، جب کہ اجملوا جمال سے بمعنیٰ خوبصورتی والا طریقہ اختیار کرو۔ واللہ اعلم

حضرت مطلب بن حنطب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا أَمَرَكُمْ بِهِ اللهُ إِلَّا وَقَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ، وَمَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا نَهَاكُمُ اللهُ عَنْهُ إِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ، وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ قَدْ نَفَثَ فِي رَوْعِي أَنَّهُ لَنْ تَمُوتَ نَفْسٌ حَتَّى تَسْتَوْفِيَ رِزْقَهَا فَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا تمہیں حکم دیا ہے وہ میں نے تمہیں بتلادی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے تمہیں روکا ہے اس سے میں نے تمہیں منع کر دیا ہے، اور جبریل نے میرے دل میں بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنا رزق پورا نہ کرے، پس تم طلب میں درست طریقہ اختیار کرو۔

حضرت ابو عثمان رحمہ اللہ اپنے مواعظ میں فرمایا کرتے تھے، يَا عَبْدَ اللهِ فِيمَا ذَا تُتْعِبُ قَلْبَكَ؟ وَتُنَازِعُ إِخْوَانَكَ، وَتُعَادِي عَلَى طَلَبِ الرِّيَاسَةِ وَالْعِزِّ أَشْكَالَكَ وَأَخْدَانَكَ؟ وَتَعْمَلُ فِي هَلَكَةِ حسناتك بِالْحَسَدِ لِمَنْ هُوَ فَوْقَكَ؟ كَلَّا لَمْ تُؤْمِنْ بِمَنْ أَخْبَرَ أَنَّهُ يُعِزُّ مَنْ يَشَاءُ، وَيُذِلُّ مَنْ يَشَاءُ، وَيُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ يَشَاءُ، وَيَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ يَشَاءُ؟ فَاسْتَعْمِلِ الْعِلْمَ فِي ظَاهِرِكَ إِنْ كُنْتَ تَاجِرًا أَوْ كَاسِبًا أَوْ زَارِعًا، وَأَجْمِلْ فِي الطَّلَبِ، وَاتْرُكِ الْحَرَامَ وَالشُّبُهَاتِ جَمِيعًا، اے ابو عبد اللہ! کس چیز میں تو اپنے دل کو تھکاتا ہے؟ اور اپنے بھائیوں سے جھگڑا کرتا ہے، اور اپنے ہم شکلوں اور اپنے دوستوں سے ریاست اور عزت کی طلب میں دشمنی کرتا ہے، اور جو تجھ سے اوپر والے ہیں ان سے حسد کے ذریعے اپنی نیکیوں کو برباد کرنے میں لگا رہتا ہے؟ گویا کہ تجھے اس ذات پر ایمان نہیں جس نے یہ فرمایا کہ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے، اگر تو تاجر، کمائی

دار یا زمیندار ہے تو تُو اپنے علم کو اپنے ظاہر پر استعمال کر، اور طلب میں اختصار سے کام لے، حرام اور مشتبہ تمام چیزوں کو چھوڑ دے۔

اس کے بعد فرماتے تھے کہ فَإِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَوْفِيَ رِزْقَهَا وَحَظَّهَا مِنْ عِزِّهَا وَرِيَاسَتِهَا وَرِزْقِهَا، وَلَوْ هَرَبَ الْعَبْدُ مِنْ رِزْقِهِ لَأَدْرَكَهُ رِزْقُهُ، كَمَا لَوْ فَرَّ مِنَ الْمَوْتِ، کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے اور اپنی عزت، اپنی ریاست اور اپنے رزق کا حصہ پورا نہ کرلے، اگر بندہ اپنے رزق سے بھاگ جائے تو رزق اسے پالے گا، جیسا اگر کوئی شخص موت سے بھاگ جائے تو موت اسے پالے گی۔

اس کے بعد ابو عثمان رحمہ اللہ فرماتے کہ وَالْيَقِينُ لَا يَمْنَعُ الْمُوقِنِينَ مِنْ طَلَبِ الْحَظِّ الْوَافِي مِنَ الدُّنْيَا، وَإِنَّمَا يَدُلُّ عَلَى تَرْكِ الْفُضُولِ رِضًا بِالْقَلِيلِ، وَزُهْدٌ فِي الْكَثِيرِ اتِّبَاعًا لِرَسُولِ رَبِّ الْعَالَمِينَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلِأَصْحَابِهِ فَإِنَّهُمْ أَئِمَّةُ الْمُتَوَكِّلِينَ، وَالزَّاهِدِينَ مَعَ مَا وَصَفْنَا مِنَ الْأَمْنِ بِمَا لَكَ، وَالْإِيَاسِ مِمَّا لَيْسَ لَكَ، وَأَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَمَنْ زَعَمَ أَنَّ الْيَقِينَ يَمْنَعُ طَلَبَ الْقُوتِ وَالْكَفَافِ فَقَدْ جَهِلَ الْيَقِينَ وَخَالَفَ سُنَنَ السَّلَفِ الصَّالِحِينَ، (شعب الایمان للبیہقی) یقین اہلِ یقین کو دنیا سے پورا حصہ وصول کرنے سے رکاوٹ نہیں بنتا، یہ بات اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ انسان تھوڑی چیز پر راضی ہو کر فضول چیزوں کو چھوڑ دے، رب العالمین کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کرتے ہوئے بہت زیادہ سے زہد اختیار کرے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متوکلین اور زاہدین کے پیشوا تھے، باوجودیکہ ہم نے جو کچھ تیرے لیے ہے اس کو بیان کر دیا ہے اور جو کچھ تیرے لیے نہیں ہے اس سے مایوسی کا ذکر کر دیا ہے، جو کچھ تجھے پہنچنے والا ہے وہ تجھ سے خطا نہیں کر سکتا، اور جو کچھ تجھ سے خطا کر

گیا وہ تجھے پہنچنے والا نہیں تھا، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ یقین گزراوقات اور کفایت کرنے والی چیزوں کو روکتا ہے وہ یقین سے ناواقف ہے اور سلف صالحین کے طریقوں کا مخالف ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ الزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيمِ الحَلَالِ وَلاَ إِضَاعَةِ الْمَالِ وَلَكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا أَنْ لاَ تَكُونَ بِمَا فِي يَدَيْكَ أَوْثَقَ مِمَّا فِي يَدِ اللهِ وَأَنْ تَكُونَ فِي ثَوَابِ الْمُصِيبَةِ إِذَا أَنْتَ أُصِبْتَ بِهَا أَرْغَبَ فِيهَا لَوْ أَنَّهَا أُبْقِيَتْ لَكَ. ترک دنیا اس کا نام نہیں کہ تم اپنے اوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرلو یا جو مال تمہارے پاس ہو اسے ضائع کر دو، بلکہ ترک دنیا اس کا نام ہے کہ تمہارا اعتماد اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس پر زیادہ ہو بہ نسبت اس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے، اور جب تجھے مصیبت پہنچے تو اس کے ثواب میں زیادہ رغبت رکھے اور یہ خواہش ہو کہ کاش یہ میرے لئے باقی رہتی۔ (جامع ترمذی ابواب الزہد، سنن ابن ماجہ)

داعی الی اللہ کے لیے ہدایات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا {۱۰} وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا {۱۱} المزمل

جواب ترجمہ: اور جو باتیں یہ (کافر لوگ) کہتے ہیں ان پر صبر سے کام لو، اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے کنارہ کرلو۔ اور تمہیں جھٹلانے والے جو عیش و عشرت کے مالک بنے ہوئے ہیں، ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو، اور انہیں تھوڑے دن اور مہلت دو۔

کافر لوگ حضرت نبی کریم ﷺ کے لیے شاعر، جادوگر اور مجنون جیسے نام استعمال کرتے تھے۔ یہ صورت حال نبی کریم ﷺ کے لیے بہت تکلیف دہ تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ کی طرف سے یہ

ہدایت دی جارہی ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورت انداز میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار اپنی تفسیر بیان القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ ”دعوت و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے اس حکمت عملی کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے انسان کے حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ہو سکتا ہے آج جن لوگوں کو آپ کی دعوت سے چڑ ہے کل انہیں آپ کی یہی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اس لیے لوگوں سے دوبارہ بات کرنے کا راستہ کھلا رکھنا ضروری ہے۔ یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اگلے بارہ سال کے دوران مکہ کے حالات نے ابھی کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ کو ہدایت دی جارہی ہے کہ اہل مکہ کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے آپ ﷺ ان کو نظر انداز تو کریں، لیکن تعلقات میں اس قدر تلخی نہ آنے دیں کہ دوبارہ انہیں دعوت دینا ممکن نہ رہے۔ (تفسیر بیان القرآن للدکتور اسرار احمد)

بقول امام کرخی رحمہ اللہ یہ چھٹا حکم ہے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبر جمیل، یہ مقامات سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دشمنوں کی جفا و ایذا پر صبر کیا جائے یعنی یہ حضرات جن لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی میں اپنی ساری قوت و توانائی اور ساری عمر خرچ کرتے ہیں انہیں کی طرف سے اس کی جزاء میں گالیاں، ایذائیں، طرح طرح کے جور و ستم ان کے مقابلے میں آتے ہیں ان پر صبر جمیل کرنا یعنی انتقام کا ارادہ بھی نہ کرنا یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جو اصطلاح صوفیہ میں فناء کامل کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا: ھجر بفتح الہاء کے لفظی معنیٰ کسی چیز کو رنج و ملال و بیزاری کیساتھ چھوڑنے کے آتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہوئے کہ تکذیب کرنے والے کفار جو کچھ آپ کو ایذا کے کلمات کہتے ہیں آپ

اس کا انتقام تو ان سے نہ لیں مگر ان سے تعلقات بھی نہ رکھیں۔ مگر ترک تعلق کے وقت انسان کی طبعی عادت یہ ہے کہ جس سے تعلق چھوڑا جائے اس کا شکوہ شکایت اور اس کو برا بھلا کہتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ کو کفار کے ہجر یعنی ترک تعلق کا جو حکم دیا گیا تو ساتھ هَجرًا جَمِيلاً کی قید لگادی گئی کہ آپ کے منصب عالی اور خلق عظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جن کفار سے ترک تعلق کریں زبان بھی ان کو برا کہنے سے محفوظ رکھیں۔ (معارف القرآن)

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ آیات جہاد و قتال جو بعد میں نازل ہوئیں ان سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا، لیکن غور کیا جائے تو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیات مذکورہ میں کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ہجر کی تلقین ہے یہ زجر اور سزا و قتال کے منافی نہیں، اس آیت کا حکم ہر وقت ہر حال میں ہی اور قتال و جہاد میں جو زجر و سزا ہے اس کا حکم خاص خاص اوقات میں ہے اور اسلامی قتال و جہاد در حقیقت کوئی انتقام یا اپنا غصہ نکالنا نہیں، جو صبر اور ہجر جمیل کے منافی ہو بلکہ خالص حکم خداوندی کی تعمیل ہے جس طرح صبر اور ہجر جمیل عام حالات میں اس کی تعمیل ہے یہاں تک رسول اللہ ﷺ کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ترک انتقام کی تلقین تھی آگے آپ کی تسلی کے لئے ان کفار پر جو عتاب آخرت میں آنے والا ہے اس کا بیان ہے مقصد یہ ہے ان کی چند روزہ چیرہ دستی اور ظلم و جور سے آپ ملول نہ ہوں ان کو تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں پکڑنے والا ہے ہاں حکمت ربانی کے تقاضے سے کچھ مہلت دے رکھی ہے اس میں آپ جلدی کی فکر نہ فرمادیں۔ (معارف)

دوزخیوں کے لیے عذاب

سوال ان آیات کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ یہاں أَنكَالاً اور ذَا غُصَّةٍ کا کیا مطلب ہے؟

إِنَّ لَدَيْنَآ أَنكَالًا وَّجَحِيمًا {١٢} وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا أَلِيمًا {١٣} المزمل

جواب ترجمہ: یقین جانو ہمارے پاس بڑی سخت بیڑیاں ہیں، اور دہکتی ہوئی آگ ہے۔ اور گلے میں

پھنس جانے والا کھانا ہے، اور دکھ دینے والا عذاب ہے۔

اللہ کے نافرمانوں، سرکشوں اور کافروں کے لیے موقع بہ موقع سخت ترین عذابوں کا ذکر ہے، کہیں دردناک عذاب کا ذکر ہے، کہیں عذاب عظیم کا ذکر ہے، کہیں عذاب مہین کا ذکر ہے، یہاں بیڑیوں اور سخت غصے والے عذاب کا ذکر ہے۔

أَنْكَالًا نکل (نون کے کسرہ اور فتح کے ساتھ) کی جمع بھاری قید بیڑی۔ بیہقی نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ انکال آگ کی بیڑیاں ہونگی۔

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا: یعنی ایسا کھانا جس سے پھندہ لگے گا نہ اندر اترے گا نہ باہر نکلے گا۔ ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے اس کو آگ کی صفات میں شمار کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے زقوم (تھوہر) کا درخت مراد ہے۔ عبد اللہ بن احمد رحمہ اللہ نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ضریع (سینڈ، یا تھوہر) دوزخ کے اندر کانٹوں (یا خاردار جھاڑی) کی طرح ایک چیز ہوگی جو ایلوے سے زیادہ تلخ، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی اور جب دوزخی کو کھلائی جائے گی تو یہ پیٹ میں جائے گی نہ منہ تک لوٹ کر آئے گی بیچ میں اٹکی رہے گی نہ فربہی پیدا کرے گی نہ بھوک کو دفع کرے گی۔

قرآن کریم کی مختلف آیات میں جہنمیوں کو جکڑنے کے لیے جن زنجیروں کا ذکر کیا گیا وہ تین قسم کی ہیں، ایک اغلال، دوسری سلاسل اور تیسری انکال، اغلال اسے کہتے ہیں جو گردنوں میں ڈالی جائے گی، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غِل اس کو کہا جاتا ہے جس سے ایک ہاتھ کو گردن کے ساتھ باندھا جائے گا، اور صفد اس کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ (ابن ابی الدنیا) حضرت سدی رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ اصفاد اس زنجیر کو کہا جاتا ہے جس سے دونوں ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھا جائے گا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اغلال دوزخیوں کی گردن میں اس لیے نہیں ڈالی جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز کر دیں گے، لیکن جب دوزخ کی آگ بجھنے لگے گی تو انہیں اس میں دھنسا دیا جائے گا، یہ بات بیان کرتے ہی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (التخویف من النار)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے دوزخ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایک غل ان زنجیروں میں سے پہاڑوں پر رکھی جائے تو سیاہ پانی تک اسے کاٹ ڈالے، اگر اس زنجیر میں سے ایک گز کسی پہاڑ کے اوپر رکھ دی جائے تو وہ اس پہاڑ کو کوٹ کر دَل (ریزہ ریزہ) دے۔ (التخویف من النار)

دوزخیوں کے ہاتھ آگ میں باندھ دیے جائیں گے، وہ ہاتھ ہلا نہ سکیں گے تو اپنے چہروں کے ساتھ آگ کا سامنا کریں گے، ان کے ہاتھ آگ میں اس سختی کے ساتھ بندھے ہوں گے کہ وہ آگ سے بچنے پر قدرت نہیں رکھیں گے، جب بھی دوزخی آگ کا کوئی حصہ انہیں جلائے گا تو وہ اپنے چہروں سے اس کا سامنا کریں گے۔ (التخویف من النار والتعریف بحال دارالبوار)

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرشتوں سے کہیں گے کہ اس دوزخی کو پکڑ لو اور اسے بیڑیاں پہنا دو تو اس حکم کو سن کر ستر ہزار فرشتے آگے بڑھیں گے، ہر فرشتہ آگے بڑھے گا کہ وہ اس جہنمی کی گردن میں زنجیر ڈالے۔ (التخویف من النار) دوسری قسم انکال ہے، جس کا یہاں سورۃ المزمل میں ذکر ہے، یہ بیڑیاں آگ کی ہوں گی۔ ابو عمران جونی کہتے ہیں کہ یہ ایسی بیڑیاں ہوں گی جو اللہ کی قسم کبھی بھی نہیں کھلیں گی، اہل لغت کہتے ہیں کہ انکال اور نکل لگام کے لوہے کو کہا جاتا ہے، دوزخیوں کو لوہے کی لگام ڈالی جائے گی، نکال عبرت ناک سزا کو بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دوزخیوں کو دوزخ میں دھنسانے اور لٹکانے کے لیے لگام ڈالی جائے گی۔

تیسری قسم سلاسل ہے، سلاسل سے مراد جہنم کی بیڑیاں ہیں ہر بیڑی کی لمبائی ستر ہزار گز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک زنجیر دوزخی کے پائخانے کے راستے میں ڈالی جائے گی اور اس کے منہ

سے نکالی جائے گی۔ (التخویف من النار)

ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یوں ہے کہ ایک زنجیر دوزخی کے پائخانے کے راستے سے ڈالی جائے گی اور اس کے نتھنے سے نکالی جائے گی، وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکے گا۔ (التخویف من النار والتعریف بحال دار البوار)

وَعَذَابًا أَلِيمًا: ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ دوزخیوں پر آگ کے سانپ اور بچھو گریں گے اور اگر ان میں سے ایک سانپ مشرق میں پھونک مارے تو مغرب والے جل جائیں اور اگر ان میں سے ایک بچھو دنیا والوں کو کاٹ لے تو سب جل جائیں وہ سانپ اور بچھو دوزخیوں پر گریں گے اور ان کے گوشت و پوست کے درمیان داخل ہوں گے۔

مسلم نے بروایت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کیا ہے کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب اس شخص کو ہو گا جس کے دونوں چپل اور (چپلوں کے تسمے) آگ میں ہوں گے جن کی وجہ سے ہانڈی کے ابال کی طرح اس کا دماغ کھولے گا وہ خیال کرے گا کہ اس پر سب سے سخت عذاب ہے حالانکہ اس پر سب سے ہلکا عذاب ہو گا۔ امام احمد، ابن ابی داؤد، ابن عدی اور بیہقی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے قرآن پاک کی یہ آیت سنی تو خوف سے بیہوش ہو گیا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ایک دن روزہ سے تھے، افطار کے وقت کھانا سامنے آیا تو اس آیت کا دھیان آ گیا، کھانا نہ کھا سکے اٹھوا دیا، اگلے روز شام کو ایسا ہی ہوا، کھانا اٹھوا دیا، تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا تو ان کے بیٹے یہ ماجرا لے کر حضرت ثابت بنانی اور یزید ضبی اور یحییٰ بکاء کے پاس گئے اور حال سنایا، یہ تینوں حضرات آئے اور حضرت حسن رحمہ اللہ کو کھانے کا بہت اصرار کرتے رہے، بالآخر مجبور ہو کر ستو کا شربت پیا۔ (روح المعانی)

وطعامًا ذَا غُصَّةٍ: غُصَّةٍ کا لفظی معنی گلے میں لگ جانے والے پھندے کے ہیں کہ کوئی لقمہ گلے میں اس طرح پھنس جائے کہ نہ نگلا جا سکے اور نہ باہر اگلا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری بخشی ہوئی دولت و رفاہیت سے ان کے دماغ ایسے خراب ہوئے کہ رسول کی تکذیب پر تل گئے اور اس کی دعوت و تبلیغ کو اپنے غرور و تکبر کے لیے چیلنج سمجھنے لگے لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیا ہمیشہ نہیں رہے گی، قیامت کا دن آکے رہے گا، اس روز ہمارے پاس ان کے لیے بیڑیاں ہوں گی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی، یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر اس بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

دنیا میں ہم نے انہیں کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا، کیسے کیسے ترنوالے انہیں عطا کیے اور کیسے رسیلے پھل ان کے کام و دہن کی لذت کے لیے پیدا کیے گئے، لیکن انھوں نے کسی نعمت کا حق نہ پہچانا تو آخرت میں ان کو ان ترنوالوں کے بدلے میں وہ کھانا دیا جائے گا جو ان کے حلق میں پھنس کر رہ جائے گا اور آج جس عیش میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کی جگہ انھیں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (تفسیر روح القرآن للدکتور اسلم)

روز محشر کی ہولناکی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا {۱۴} المزمل

جواب ترجمہ: اس دن جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے، اور سارے پہاڑ ریت کے بکھرے ہوئے تودے بن کر رہ جائیں گے۔

بروز محشر پہاڑوں کے اجزاء کو باندھ کر رکھنے والی کشش ختم ہو جائے گی، اس لیے پہلے تو وہ باریک بھربھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے، پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہوگا اس کی وجہ سے یہ ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔

قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اسی مفہوم میں یوں ارشاد فرمایا گیا وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (۱۰۵) فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا {۱۰۶} لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا

أَمْتًا {۱۰۷}(طٰہٰ) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ فرمایئے کہ میرا پروردگار ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔

حضرت ابو عبد اللہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یوم کا لفظ ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوتا ہے یعنی انہیں عذاب دیا جائے گا جس دن زمین کانپے گی، ایک قول یہ کیا گیا ہے یوم سے پہلے حرف جار تھا، اس کے حذف کی وجہ سے یہ منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہو گی، ھذہ العقوبۃ فی یوم ترجف الارض والجبال۔ ایک قول یہ کیا گیا، اس کا عامل ذرنی ہے معنٰی یہ ہو گا جس روز زمین اور پہاڑ کانپیں گے اس دن مجھے جھٹلانے والوں کو چھوڑ دینا۔

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلًا: کثیب سے مراد جمع شدہ ریت ہے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

عَرَفْتُ دِيَارَ زَيْنَبَ بِالْكَثِيبِ... كَخَطِّ الْوَحْيِ فِي الْوَرَقِ الْقَشِيبِ

میں نے ریت کے ٹیلے پر زینب کے گھروں کو پہچان لیا جس طرح نئے کاغذ پر لکھائی کی لکیریں ہوتی ہیں۔

مھیل اس ریت کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے ضحاک اور کلبی نے کہا، هُوَ الَّذِي إِذَا وَطِئْتَهُ بِالْقَدَمِ زَلَّ مِنْ تَحْتِهَا، وَإِذَا أَخَذْتَ أَسْفَلَهُ انْهَالَ، مھیل اس ریت کو کہتے ہیں جب اس پر قدم رکھے تو وہ نیچے سے سرک جائے اور جب تو اس کا نیچے والا حصہ پکڑے تو وہ گر پڑے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا، مَهِيلًا أَيْ رَمْلًا سَائِلًا مُتَنَاثِرًا، مھیل سے مراد بہنے اور بکھرنے والی ریت ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَأَصْلُهُ مَهْيُولٌ وَهُوَ مَفْعُولٌ مِنْ قَوْلِكَ: هِلْتُ عَلَيْهِ التُّرَابَ أَهِيلُهُ هَيْلًا: إِذَا صَبَبْتُهُ. يُقَالُ: مَهِيلٌ وَمَهْيُولٌ، وَمَكِيلٌ وَمَكْيُولٌ، وَمَدِينٌ وَمَدْيُونٌ، وَمَعِينٌ وَمَعْيُونٌ، (قرطبی) اس کی اصل مھیول ہے یہ تیرے اس قول سے اسم مفعول

کا صیغہ ہے، ھلت علیہ التراب اھیلہ ھیلا۔ جب تو اسے بہائے جس طرح کہا جاتا ہے، مھیل، مھول، مکیل، مکیول، مدین، مدیون، معین، معیون۔

شاعر نے اسی معنیٰ کو ادا کرتے ہوئے یوں کہا،

قَدْ كَانَ قَوْمُكَ يَحْسَبُونَكَ سَيِّدًا ... وإدخال أَنَّكَ سَيِّدٌ مَعْيُونُ

تیری قوم تجھے سردار گمان کرتی ہے اور میرا خیال ہے تو آنکھوں دیکھا سردار ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آپ کی بارگاہ میں خشک سالی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ أَتَكِيلُونَ أَمْ تَهِيلُونَ قَالُوا: نَهِيلُ. قَالَ: كِيلُوا طَعَامَكُمْ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيهِ، کیا تم کیل کرتے ہو یا انڈیلتے ہو؟ عرض کی ہم انڈیلتے ہیں، فرمایا، اپنے کھانوں کا کیل کیا کرو اس میں تمہارے لیے برکت رکھ دی جائے گی۔

ھلتُ میں ایک لغت اھلت الدقیق بھی ہے اسی سے مھال اور مھیل آتا ہے واؤ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یاء پر ضمہ ثقیل ہوتا ہے ضمہ کو حذف کیا گیا تو یاء ساکن ہو گئی پھر یاء اور واؤ ساکن ہو گئے تو اجتماع ساکنین کی وجہ سے واؤ حذف کر دیا گیا۔ (قرطبی)

موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ میں مماثلت

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا {١٥} فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا {١٦} المزمل

جواب **ترجمہ:** (جھٹلانے والو!) یقین جانو ہم نے تمہارے پاس تم پر گواہ بننے والا ایک رسول اسی طرح بھیجا ہے، جیسے ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا۔ پھر فرعون نے رسول کا کہنا نہیں مانا، تو ہم نے اسے ایسی پکڑ میں لے لیا جو اس کے لیے زبردست وبال تھی۔

یہاں قریش مکہ کو براہ راست خطاب فرمایا جارہا ہے کہ تم نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کو وہ مرتبہ اور مقام نہیں دیا جو دینا چاہیے تھا، بلکہ الٹا تم نے پیغمبری اور رسالت کو مذاق بنالیا ہے، جب کہ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ کسی قوم کی طرف کسی رسول اور نبی کو بھیجا جانا کوئی کھیل تماشہ یا مذاق نہیں ہے، بلکہ اس قوم کے لیے رب تعالیٰ کا احسان، کرم اور فضل ہوتا ہے، اور اس قوم کے لیے ایک طرح کا امتحان اور آزمائش بھی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جس قوم کی طرف رسول اور نبی بھیجتے ہیں انہیں آزماتے ہیں کہ میرے بھیجے ہوئے لوگوں کے ساتھ ان لوگوں نے کیسا سلوک روا رکھا، کیونکہ صرف مکہ والے ہی ایسے لوگ نہیں ہیں جن کی طرف ہم نے اپنا رسول بھیجا ہو، ان سے پہلی اقوام کی طرف بھی تو ہم نے مختلف اوقات میں اپنے نبی اور رسول بھیجے، جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی اقوام کو دین کی دعوت دی، انہیں اللہ کا پیغام سنایا، انہیں اللہ کی طرف بلایا، ان تک پیغام الٰہی پہنچایا۔

ہم نے انسانی رشد وہدایت کے لیے انسانی آبادیوں میں اپنے فرستادے اور پیغمبر بھیجے، وقتاً فوقتاً اللہ کے رسول تشریف لاتے رہے، ان کی تبلیغ ودعوت امیروں، غریبوں، رعایا اور حکمرانوں سب کے لیے عام ہوا کرتی تھی، ان حکمرانوں میں ایسے حکمران بھی گزرے ہیں جو اپنے کو رب الاعلیٰ کہتے اور کہلواتے تھے، وہ اپنے سوا کسی کو رب اور پروردگار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اللہ نے یہاں فرعون کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، جو خدائی کا دعویدار تھا، جو ہر عظمت کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتا تھا، انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتا تھا، اس کے خلاف اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت وشان والا رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں بھیجا، جنہیں ہدایات دے کر روانہ کیا گیا کہ آپ نے فرعون کو کس انداز میں تبلیغ کرنا ہے اور اسے کیسے سمجھانا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اسی انداز میں اسے دعوت دے کر سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی اپنی آخری کوشش تک کر ڈالی مگر فرعون تھا کہ اس کا کبر وغرور، تکبر، سرکشی اور نخوت بڑھتی چلی جارہی تھی۔

مفسر قرآن علامہ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں حضرت موسیٰ اور حضرت نبی کریم ﷺ کے مابین مماثلت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”قریش اپنے تکبر اور سرکشی میں آنحضرت ﷺ کے مطیع نہیں ہوتے تھے اور ان کو فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی معلوم تھا اس لیے ان آیات میں بتلایا جاتا ہے کہ ہم نے تمہارے پاس بھی ویسا ہی رسول بھیجا جیسا کہ فرعون کے پاس بھیجا تھا پھر اس نے سرکشی کی سزا پائی، غرق ہوا پھر تم فرعون سے زیادہ مالدار اور صاحب حشمت وشوکت نہیں ہو۔

یا یوں کہو کہ نبوت کے مسئلہ کی ضرورت بیان فرمائی جاتی ہے کہ جب بدکاری اور بت پرستی ہوئی ہدایت کے لیے نبی آیا جیسا کہ پہلے فرعون کے پاس موسیٰ علیہ السلام آئے تھے تمہارے پاس محمد ﷺ آئے۔ فرماتا ہے اِنَّآ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا کیسا رسول! شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ تم پر تمہارے نیک وبدکاروں کی شہادت دینے والا وہ خدا کی طرف سے گواہی دیتا ہے کہ یہ کام برے اور ناپسند ہیں اور یہ کام عمدہ اور قابل نجات ہیں۔ یا یہ کہ وہ قیامت میں تمہارے اوپر گواہی دے گا جو کچھ تم نے کیا اور کر رہے ہو وہ سچا گواہ آسمانی عدالت میں تم پر ثابت کر دے گا اور تم کو ملزم ٹھہرائے گا اگر برائی سے باز نہ آؤ گے اور نیک کام اختیار نہ کرو گے۔

کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا جیسا کہ فرعون کے پاس ہم نے رسول یعنی موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت کی تو قید فرعون سے نجات پائی، شام کی سرزمین نصیب ہوئی، وہاں کے سردار ہوئے اور فرعون نے سرکشی کی تو ہلاک ہوا اسی طرح اس نبی کے مطیع دنیا کی سرسبز بادشاہتوں کے مالک ہوں گے اور آخرت کے بھی درجات حاصل کریں گے اور نافرمان وسرکش خوار وذلیل ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، قریش بدر میں مارے گئے، سات برس کے قحط میں گرفتار ہوئے، پھر فتح مکہ کے دن مغلوب ہوئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا اور دین کے سردار ہوئے۔

اس جملہ میں اس بشارت کی طرف بھی اشارہ ہے جو توریت سفر استثناء کے اٹھارہویں باب میں آنحضرت ﷺ کی بابت منقول ہے اس میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بنی اسرائیل کو پہلے سے سناتے ہیں "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ انتہیٰ

متعصب عیسائی اس بشارت کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ٹھہراتے ہیں اور سند بھی عیسائی مصنفوں کے اقوال سے لاتے ہیں، مگر یہ بشارت بجز آنحضرت ﷺ کے اور کسی پر صادق نہیں آتی کس لیے کہ اصل بشارت میں موافق عبرانی ترجمہ کے ان کے بھائیوں میں سے نبی برپا کرنا فرمایا ہے یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں برکت دینے کا وعدہ بھی ہوا ہے۔

اگر اس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اور کوئی اسرائیلی نبی ہو تو بنی اسرائیل میں سے برپا ہوا سمجھا جائے گا نہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے دوسرے اس نبی کی نسبت یوں فرمایا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہو گا اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام کے مانند نہیں گزرا بلکہ ہر ایک ان کا شریعت میں متبع تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو کوئی بھی مشابہت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہیں تھی کس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے، بیوی اولاد رکھتے تھے، ایک فرد ماندہ قوم کو سرکشوں کے پنجوں سے چھڑا کر لائے اور اس کو ایک ملک کا سردار کر گئے۔

برخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ بقول نصاریٰ آدم زاد ہی نہیں تھے بلکہ خدا زاد یعنی خدا کے بیٹے (تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا) اور نہ ان کی بیوی بیٹے تھے نہ قوم کو رومیوں کی قید سے آزاد کرا گئے اور نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین ان کی نسل کے غیر لوگ ہوئے جیسا کہ یوشع بن نون ان کے بعد ان کا خلیفہ ہوا حالانکہ آپ کی اولاد بھی موجود تھی۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کے جانشین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہوئے باوجود یکہ آپ کے اقارب و اولاد بھی تھی جن کے عہد میں عرب غیر قوموں پر فتحیاب ہوئے جیسا کہ یوشع بن نون کے عہد میں بنی اسرائیل شام اور فلسطین پر قابض ہوئے اور دونوں کی شریعت میں بھی حلت و حرمت، طہارت و نجاست، قوانین عبادت، احکام معاملات اور دستور عبادات میں بہت مشابہت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس کوئی نئی شریعت ہی نہ تھی بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پابند تھے اس لیے فرماتے تھے کہ میں توریت کا ایک شوشہ بھی مٹانے نہیں آیا اور نہ شریعت کو منسوخ کرنے آیا ہوں اور جو بعد میں پولوس وغیرہ نے شریعت بنائی تو اس میں ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاد کئے اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بھی کئے، وہ لوگوں میں صاحب شوکت اور ذو وجاہت تھے ایسا ہی آنحضرت ﷺ بھی، برخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ محض فقیرانہ اور عاجزانہ پیرایہ میں تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی مخالف قتل نہ کر سکا اپنی موت سے مرے، ایسا ہی آنحضرت ﷺ برخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ بقول نصاریٰ یہود کے ہاتھ سے مارے گئے۔ الغرض پیدائش سے لے کر شریعت و احکام اور زیست کے حالات اور موت اور بعد میں جانشینوں تک کے حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ میں جیسی مشابہت ہے اس کا سواں حصہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں۔ (تفسیر حقانی)

ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں رسول کی حیثیت اور عظمت کے زیر عنوان یہاں لکھتے ہیں کہ تمہیں رسول کی حیثیت اور اس کی عظمت کا ادراک ہونا چاہیے، کسی رسول کا کسی قوم کی طرف مبعوث ہونا اس طرح نہیں کہ وہ کوئی واعظ یا مبلغ یا سائل بن کر کسی بستی میں اترا ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں، اس کی بات سن لی جائے گی تو وہ شکر گزار ہو گا ورنہ وہ شب بسری کے بعد اگلی آبادی کا رخ کرے گا، پیغمبر جس قوم میں بھیجا جاتا ہے اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے گواہ کی ہوتی ہے، وہ حق کی

گواہی دینے کے لیے آتا ہے، اسی کے ذریعے حق و باطل کا فیصلہ ہوتا ہے اور جب اس شاہد کی گواہی کو قبول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی تکذیب کر دی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس تکذیب کے جرم میں اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب فرعون نے کی اور ان کی ہر بات کا مذاق اڑایا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے انتہائی سخت پکڑا، اس کا سارا شاہی جاہ و جلال، اس کا کر و فر، اس کی بیشمار فوجیں اور اس کے بیشمار وسائل، اس کے ربوبیت کے دعوے سب دھرے رہ گئے۔

بحر قلزم کی چند موجیں اٹھیں اور وہ معافیاں ہی مانگتا رہ گیا لیکن موجوں کے تھپیڑوں نے اس کا بند بند توڑ ڈالا اور وہ موت کی نذر ہو گیا اور پھر قیامت کے دن موسیٰ علیہ السلام کی گواہی پر اسے جہنم رسید کیا جائے گا اور عالم برزخ میں اللہ تعالیٰ کی سخت پکڑ کا عالم یہ ہے کہ ہر روز اس پر جہنم کا عذاب پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح تمہاری طرف ہم نے سید الرسل کو بھیجا ہے، تم نے اگر قوم فرعون کی طرح اپنی سرکشی کو جاری رکھا اور رسول کی حقیقی قدر و منزلت کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو قوم فرعون کا ہوا۔ (تفسیر روح القرآن)

شاہد کا مفہوم: رسول کے شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے قول و عمل سے لوگوں کے سامنے حق کی شہادت دیتا ہے، حق کی بالادستی اور اس کی حکمرانی کے لیے ایک ایک ادارے کو وجود دیتا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل طور پر حق کی حاکمیت کو قائم کر دیتا ہے اور آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہو گی تو اس وقت بھی وہ اپنی امت بعثت اور امت اجابت کے سامنے حق کی گواہی دے گا کہ میں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچایا تھا اور انھوں نے میری دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا اور پھر اس کی گواہی پر لوگوں کے ساتھ جزاء و سزا کا معاملہ ہو گا۔ (روح القرآن)

فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ: یعنی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور ایمان نہ لایا، مقاتل نے کہا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر کیا کیونکہ اہل مکہ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

شان کا لحاظ نہ کیا اور آپ کی تحقیر کی کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت ان میں ہوئی تھی جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان کا لحاظ نہ کیا کیونکہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں میں پروان چڑھے تھے۔

فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیل کا معنیٰ سخت بوجھل، عربی محاورے میں اسی معنیٰ میں یوں بولا جاتا ہے **وَضَرْبٌ وَبِيلٌ وَعَذَابٌ وَبِيلٌ** بمعنی سخت مار اور بمعنیٰ سخت عذاب۔ حضرت اخفش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیل کا معنیٰ ہے سخت، اسی سے **مَطَرٌ وَابِلٌ** کہتے ہیں یعنی سخت بارش۔ زجاج کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ **ثَقِيلًا غَلِيظًا** ہے یعنی بھاری بھرکم، اس معنیٰ میں بارش کے لیے وابل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنیٰ مھلکاً ہے معنیٰ یہ ہے ہم نے اسے تباہ کن سزا دی۔ ایک شاعر نے اسی معنیٰ کی ادائیگی کے لیے یوں کہا:

أَكَلْتِ بَنِيكِ أَكْلَ الضَّبِّ حَتَّى ... وَجَدْتِ مَرَارَةَ الْكَلَإِ الْوَبِيلِ

تو نے اپنی اولاد کو گوہ کے کھانے کی طرح کھالیا یہاں تک کہ تو نے ہلاک کر دینے والی گھاس کی کڑواہٹ کو پالیا۔

اسْتَوْبَلَ فُلَانٌ كَذَا، اس کے انجام کی تعریف نہ کی، **مَاءٌ وَبِيلٌ** ایسا پانی جو خوشگوار نہ ہو، **كَلَاءٌ مُسْتَوْبَلٌ وَطَعَامٌ وَبِيلٌ وَمُسْتَوْبَلٌ،** جب وہ گھاس کھانا خوشگوار نہ ہو اور ہضم نہ ہو۔

زہیر شاعر نے کہا،

فَقَضَّوْا مَنَايَا بَيْنَهُمْ ثُمَّ أَصْدَرُوا ... إِلَى كَلَإٍ مُسْتَوْبَلٍ مُتَوَخَّمِ

انہوں نے آپس میں موتوں کا فیصلہ کیا پھر وہ ایسی گھاس کی طرف گئے جو ناخوشگوار تھی۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے کہا:

لَقَدْ أَكَلَتْ بَجِيلَةُ يَوْمَ لَاقَتْ ... فَوَارِسَ مَالِكٍ أَكْلًا وَبِيلًا

بجیلہ نے اس روز نامناسب کھانا کھایا جس روز وہ مالک کے شہسواروں سے ملی۔

وبیل کا معنی موٹا ڈنڈا بھی ہے، شاعر کا شعر ہے،

لَوْ أَصْبَحَ فِي يُمْنَى يَدَيَّ زِمَامُهَا ...وَفِي كَفِّيَ الْأُخْرَى وَبِيلٌ تُحَاذِرُه

کاش! میرے دائیں ہاتھ میں اس کی نکیل ہوتی اور دوسرے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا ہوتا جو اسے ڈراتا۔

اسی طرح موبِل کا لفظ ہے اور مؤبلہ بھی ہے جس کا معنیٰ لکڑیوں کا گٹھا ہے اسی طرح وبیل بھی اسی معنیٰ میں ہے جس طرح اس شعر میں ہے، طرفہ نے کہا: عَقِيلَةُ شَيْخٍ كَالْوَبِيلِ يَلَنْدَدِ (از تفسیر قرطبی) فرعون کی نافرمانی، سرکشی اور تمرد پر اللہ تعالیٰ نے اسے سزا دی، اسے اپنی گرفت میں لیا، اس گرفت کی سختی کا اندازہ اسی لفظ سے لگایا جاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں استعمال فرمایا ہے، فرعون نے حضرت موسیٰ پیغمبر کی نافرمانی کی، اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اس کے لشکر سمیت دریا میں غرق کر دیا، تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس لیے مکہ کے لوگوں کو بھی پتا ہونا چاہیے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی بات نہ مانی تو تباہ و برباد کر دیا گیا تو جو لوگ آخری نبی، نبیوں کے سردار، آقائے نامدار ﷺ کی نافرمانی کریں گے ان کو بھی سخت سزا ملے گا۔

قیامت کا سخت منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا {۱۷} السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا {۱۸} المزمل.

جواب ترجمہ: سو اگر تم کفر کرو گے تو اس دن سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ (اور) جس سے آسمان پھٹ پڑے گا۔ اللہ کے وعدے کو تو پورا ہو کر رہنا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ توبیخ اور تقریع کے لیے ہے، یعنی اگر تم نے کفر کیا تو تم کیسے عذاب سے بچو گے، اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اگر تم نے کفر کیا تو تم اس دن کیسے بچو گے جو بچوں کو

بوڑھا بنا دیتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿بِأَيِّ صَلَاةٍ تَتَّقُونَ الْعَذَابَ؟ بِأَيِّ صَوْمٍ تَتَّقُونَ الْعَذَابَ؟ تم کون سی نماز کے ساتھ عذاب سے بچو گے ؟ کون سے روزے کے ساتھ بچو گے ؟ اس میں اِضمار ہے یعنی تم کیسے اس دن کے عذاب سے بچو گے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، ﴿وَاللّٰهِ مَا يَتَّقِي مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ ذٰلِكَ الْيَوْمَ بِشَيْءٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم! جس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اس دن کسی بھی چیز کے ساتھ عذاب سے نہیں بچے گا۔ اور یوماً تَتَّقُونَ کا مفعول بہ ہے، یہ ظرف نہیں ہے اگر کفر کو انکار کے معنیٰ میں مقدر کیا جائے تو یوم کا لفظ کفر تم کا مفعول ہو گا۔

بعض مفسرین رحمہم اللہ نے کہا، اللہ تعالیٰ کے فرمان کفر تم پر وقف تام ہے اور یوماً سے ابتدا ہو رہی ہے تو یہ صورت اس طرف جاتی ہے، کہ یوم یجعل کا مفعول ہے اور یجعل فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے گویا یہ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ایک دن میں بچوں کو بوڑھا کر دیتا ہے۔

ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا، یہ درست نہیں کیونکہ دن ہی اپنی ہولناکی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ مہدوی رحمہ اللہ نے کہا، یجعل کی ضمیر کے بارے میں یہ جائز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ یوم کے لیے ہو جب ضمیر یوم کے لیے ہو گی تو یہ صحیح ہو گا کہ جملہ یوم کی صفت ہو اور جب ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو یہ صفت بننے کی صلاحیت نہ رکھے مگر اس صورت میں کلام میں حذف تسلیم کیا جائے، گویا ارشاد فرمایا، ﴿يَوْمَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الْوِلْدَانَ فِيهِ شِيبًا﴾۔

ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا، علماء میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے یوما کو کفر تم فعل سے نصب دی ہے یہ بہت ہی قبیح ہے کیونکہ یوماً کو جب کفر تم کے ساتھ متعلق کریں گے تو یہ صفت کا محتاج ہو گا تقدیر کلام یوں ہو گی، کفر تم بیومٍ۔ اگر کوئی استدلال کرنے والا یہ استدلال کرے کہ صفت بعض اوقات حذف ہو جاتی ہے اور فعل مابعد کو نصب دیتا ہے تو ہم اس کے خلاف حضرت عبد اللہ کی قرأت سے استدلال کریں گے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب کفر جحود (انکار) کے معنیٰ میں ہو تو یوماً بغیر کسی صفت اور اس کے حذف کے صریح مفعول ہو گا یعنی تم کیسے اللہ تعالیٰ سے تقوی اختیار کرو گے اور اس سے ڈرو گے اگر تم قیامت اور جزا کے دن کا انکار کرو گے، ابو سمال قعنب نے فَكَيْفَ تَتَّقُونَ نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَلْوِلْدَان سے مراد بچے ہیں، سدی نے کہا، اس سے مراد زنا کی اولاد ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد مشرکین کی اولاد ہے جب کہ عمومی معنی مراد لینا زیادہ صحیح ہے یعنی اس دن میں چھوٹے بچے کے بال بڑھاپے کے بغیر سفید ہو جائیں گے یہ اس وقت ہو گا جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا، اے آدم! اٹھیے جہنم کا حصہ نکالیے۔ قشیری رحمہ اللہ نے کہا، پھر اللہ تعالیٰ جس طرح ارادہ فرمائے گا جنتیوں کے احوال اور اوصاف بدل دے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا، یہ اس دن کی شدت کو بیان کرنے والی ضرب المثل ہے یہ مجاز ہے کیونکہ قیامت کے روز کوئی بچہ نہ ہو گا، بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے اس دن کی ہیبت ایسی حالت میں ہو گی اگر وہاں کوئی بچہ ہو تو ہیبت کی وجہ سے اس کے سر کے بال سفید ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے یہ نزع کا وقت ہو گا اور صور پھونکے جانے سے قبل ہو گا، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ زمخشری نے کہا، کسی کتاب میں میری نظروں سے یہ حکایت گزری ہے کہ ایک آدمی نے شام کی جب کہ اس کے بال کوے کی طرح سیاہ تھے اس نے صبح کی تو اس کا سر سفید ہو چکا تھا اور داڑھی ثغامہ بوٹی کی طرح سفید ہو چکی تھی اس نے کہا مجھے خواب میں قیامت، جنت اور دوزخ دکھائی گئی، میں نے لوگوں کو دیکھا کہ انہیں زنجیروں سے جکڑ کر آگ کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو اس کی ہولناکی کی وجہ سے میں اس طرح ہو گیا جس طرح تم مجھے دیکھتے ہو، یہ بھی جائز ہے کہ دن کی طوالت کے ساتھ صفت بیان کی جائے کہ اس دن میں بچے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں گے۔ (تفسیر قرطبی)

اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ: اس دن کی شدت کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا، بِهٖ میں باء فی کے معنی میں ہے یعنی اس دن میں اس کی ہولناکی کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا، اس کی تعبیر میں جو بھی اقوال

ذکر کیے گئے ہیں یہ ان میں سے سب سے اچھا ہے۔ اس کی تاویل میں یہ قول بھی کیا جاتا ہے اس پر ایسا بوجھ ڈالا جائے گا جو اسے شق ہونے کی طرف لے جائے گا کیونکہ وہ بوجھ اس پر بہت بھاری ہو گا اور آسمان اس بوجھ کے واقع ہونے کی وجہ سے ڈر جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الأعراف: ۱۸۷) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ بِهِ، لہ کے معنیٰ میں ہے یعنی اس دن کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے، فَعَلْتُ كَذَا بِحُرْمَتِكَ وَلِحُرْمَتِكَ، میں نے اس طرح تیرے احترام کی وجہ سے کیا ہے، باء، لام اور فی اس جیسی جگہوں میں قریب المعنیٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (الأنبياء: ۴۷) ہم قیامت کے روز انصاف کے میزان رکھیں گے۔ یہاں بھی لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فِيَوْمِ الْقِيَامَةِ کے معنیٰ میں ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے، بہ کی ضمیر امر کے معنیٰ میں ہے یعنی آسمان اس امر کی وجہ سے پھٹ جائے گا جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے آسمان اللہ تعالیٰ کے امر سے پھٹ جائے گا۔ ابو عمرو بن علاء رحمہ اللہ نے کہا، مُنْفَطِرَةٌ، نہیں کہا، کیونکہ سماء کا مجازی معنی، سقف، چھت ہے جیسے تو کہتا ہے، ھذا سماء البیت، یہ کمرے کی چھت ہے۔ شاعر نے کہا:

فَلَوْ رَفَعَ السَّمَاءُ إِلَيْهِ قَوْمًا ... لَحِقْنَا بِالسَّمَاءِ وَبِالسَّحَابِ

اگر چھت قوم کو اس کی طرف اٹھاتی تو ہم آسمان اور بادل تک جا پہنچتے۔

كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا: یعنی قیامت، حساب اور جزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہو کر رہے گا اس میں کوئی شک اور خلاف ورزی نہ ہو گی۔ حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ (قرطبی)

سراسر نصیحت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا {۱۹} المزمل

جواب ترجمہ: یہ ایک نصیحت کی بات ہے۔ اب جو چاہے، اپنے پروردگار کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرلے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سورت عقل مندوں کے لئے سراسر نصیحت وعبرت ہے جو بھی طالب ہدایت ہو وہ مرضی مولا سے ہدایت کا راستہ پالے گا اور اپنے رب کی طرف پہنچ جانے کا ذریعہ حاصل کرلے گا۔

جیسے دوسری سورت میں فرمایا وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (الإنسان:۳۰) تمہاری چاہت کام نہیں آتی، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے، صحیح علم والا اور پوری حکمت والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ آیات جو آج ہمارا رسول تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے یہ تمہارے لیے یاد دہانی ہے تاکہ تم خواب غفلت سے آنکھیں کھولو اور جس کا جی چاہے وہ اس راستہ پر گامزن ہو جائے جو اس کے پروردگار کی رضا اور معرفت کی طرف لے جاتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی حسی بُعد اور ظاہری دُوری تو ہے نہیں تاکہ کسی راستہ پر چل کر اس کا قرب حاصل کیا جائے، وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، ہمارے اور اس کے درمیان جو بُعد، جو دُوری ہے، وہ غفلت کی دُوری ہے، وہ ظُلمانی حجاب ہے، اس حجابِ غفلت کو دُور کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہر وقت اس کو یاد کیا جائے، اس کے ذکر کو اپنا معمول بنالیا جائے، ذکر سے ہی یہ حجاب اٹھتا ہے، اس ذکر سے ہی بندے کو اپنے

رب کی معیت اور اس کا عشق نصیب ہوتا ہے اور اسی محبت و عشق کے فیض سے اس کی عظمت و کبریائی کے نورانی پردے اٹھتے ہیں اور محب صادق سرادقات عظمت کو الٹتا ہوا حریم قرب میں جبہ سائی کا شرف حاصل کرتا ہے۔

وَكَشفُ تِلكَ الحُجُب يَتَيَسَرُ بالتَّذكِير فَإِنَّ التَّذكِير يُزيلُ الغَفلَةَ وَيَستَوجِبُ المُحَبَّةَ لِلمَعِيَّةِ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ اَلمَرءُ مَعَ مَن أَحَبَّهُ فَالمُحَبَّةُ يُفضِي المُحِبَ اِلَى المَحبُوبِ بِحَيثُ لَا تَمنَعُهُ سُرَادِقَاتِ العَظمَةِ وَالكِبرِيَاءِ (مظہری)

ترجمہ: ان پردوں کا اٹھنا صرف ذکر الٰہی سے ہی آسان ہوتا ہے، کیونکہ ذکر سے غفلت زائل ہوتی ہے، محبت پیدا ہوتی، معیت نصیب ہوتی ہے جس طرح ارشاد رسالت ہے ہر انسان، اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے، پس محبت، محب کو اپنے محبوب کے قریب پہنچا دیتی ہے، عظمت و کبریائی کے پردے اس وقت اس کو روکتے نہیں۔ (ضیاء القرآن)

تہجد کا وقت مقرر نہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعلَمُ اَنَّكَ تَقُومُ اَدنٰى مِن ثُلُثَيِ الَّيلِ وَنِصفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَن لَّن تُحصُوهُ فَتَابَ عَلَيكُم فَاقرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ القُرْاٰنِ عَلِمَ اَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرضٰى وَاٰخَرُونَ يَضرِبُونَ فِي الْاَرضِ يَبتَغُونَ مِن فَضلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَاقرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنهُ وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقرِضُوا اللّٰهَ قَرضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنفُسِكُم مِّن خَيرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ هُوَ خَيرًا وَّاَعظَمَ اَجرًا وَاستَغفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ {۲۰} المزمل.

جواب ترجمہ: (اے پیغمبر) تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ تم دو تہائی رات کے قریب، اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات (تہجد کی نماز کے لیے) کھڑے ہوتے ہو، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک جماعت (ایسا ہی کرتی ہے) اور رات اور دن کی ٹھیک ٹھیک مقدار اللہ ہی مقرر فرماتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم اس کا ٹھیک حساب رکھ سکو گے، اس لیے اس نے تم پر عنایت فرمادی ہے۔ اب تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو، اللہ کو علم ہے کہ تم میں کچھ لوگ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے ایسے ہوں گے جو اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے زمین میں سفر کر رہے ہوں گے اور کچھ ایسے جو اللہ کے راستے میں جنگ کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا تم اس (قرآن) میں سے اتنا ہی پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو قرض دو، اچھا والا قرض! اور تم اپنے آپ کے لیے جو بھلائی بھی آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے پاس جا کر اس طرح پاؤ گے کہ وہ کہیں بہتر حالت میں اور بڑے زبردست ثواب کی شکل میں موجود ہے۔ اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بے کار نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو دِقَّت تھی ان کی آنکھ بعض دفعہ صبح کے قریب کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں۔ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَى وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ یعنی بیماروں اور

مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے ان کی آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے تو وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں چاہے دو رکعت ہی پڑھ لیا کریں اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے۔ اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔

سبحان اللہ ہماری روٹیوں کی بھی رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو کوئی طبیب ایسا ہے جو اسے یوں کہہ دے کہ اس نسخہ میں آدھا پی لو یا ربع پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدح ہی پلوائے گا مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا۔ (اشرف التفاسیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بلکہ یہ پوری سورت مکی ہے مکہ شریف میں نازل ہوئی اس وقت جہاد فرض نہیں تھا، اس کے بعد یہ آیت نبوت کے بڑے دلائل میں سے ہے، اس لیے کہ غیب کی بڑی خبروں میں سے ایک ہے تو ان اعذار کے باعث تمہیں رخصت دی جاتی ہے کہ جتنا قیام تم سے با آسانی ہو سکے تم کر لیا کرو۔

حضرت ابو رجاء محمد نے حسن رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اے ابو سعید! اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو پورے قرآن کا حافظ ہے لیکن تہجد نہیں پڑھتا صرف فرض نماز پڑھتا ہے؟ آپ نے فرمایا یتوسَّدُ الْقُرْآنَ، لَعَنَ اللهُ ذَاكَ، قَالَ اللهُ تَعَالَى لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ: {وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ} (يُوسُفَ: ٦٨) اس نے قرآن کو تکیہ بنالیا، اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے کے لئے فرمایا کہ وہ علم والا ہے جو ہم نے اسے سکھایا ہے، {وَعُلِّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ

وَلَا آبَاؤُكُمْ} اور تم وہ کچھ سکھائے گئے ہو جو تم نہیں جانتے تھے، نہ تم اور نہ ہی تمہارے آباؤ اجداد جانتے تھے۔

میں نے کہا۔ ابو سعید! اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے {فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ} جو قرآن آسانی سے تم پڑھ سکو پڑھو۔ فرمایا ہاں ٹھیک تو ہے پانچ آیتیں ہی پڑھ لو۔

حافظ قرآن کا رات کی نماز میں کچھ نہ کچھ قیام کرنا امام حسن بصری کے نزدیک حق و واجب تھا، ایک حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ حضور ﷺ سے اس شخص کے بارے میں سوال ہوا جو صبح تک سویا رہتا ہے فرمایا ذَاكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيْطَانُ فِي أُذُنِهِ (بخاری و مسلم) یہ وہ شخص ہے جس کے کان میں شیطان پیشاب کر جاتا ہے۔ اس کا تو ایک یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو عشاء کے فرض بھی نہ پڑھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو رات کو نفلی قیام نہ کرے۔ سنن کی حدیث میں ہے أَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ اے قرآن والو! وتر پڑھا کرو، دوسری روایت میں ہے مَنْ لَمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا جو وتر نہیں پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

پھر ارشاد ہے کہ فرض نمازوں کی حفاظت کرو اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی کیا کرو، یہ آیت ان حضرات کی دلیل ہے جو فرماتے ہیں فرضیت زکوٰۃ کا حکم مکہ شریف میں ہی نازل ہو چکا تھا ہاں کتنی نکالی جائی؟ نصاب کیا ہے؟ وغیرہ یہ سب مدینہ میں بیان ہوا۔

حضور ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ (بخاری و مسلم) پانچ نمازیں دن رات میں فرض ہیں اس نے پوچھا اس کے سوا بھی کوئی نماز مجھ پر فرض ہے؟ آپ نے فرمایا باقی سب نوافل ہیں۔

{وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا} اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دو یعنی اللہ کی راہ میں صدقہ خیرات کرتے رہو جس پر اللہ تعالیٰ تمہیں بہت بہتر اور اعلیٰ اور پورا بدلہ دے گا، جیسے اور جگہ ہے {مَنْ ذَا الَّذِي

يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيرَةً} (البقرۃ: ۲۴۵) ایسا کون ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے اور اللہ اسے بہت کچھ بڑھائے چڑھائے۔

{وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا} تم جو بھی نیکیاں کر کے آگے بھیجو گے وہ تمہارے لئے اس چیز سے جسے تم اپنے پیچھے چھوڑ کر جاؤ گے بہت ہی بہتر اور اجر وثواب میں بہت ہی زیادہ پاؤ گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ایک مرتبہ پوچھا أَيُّكُمْ مَالُهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهِ؟ تم میں سے ایسا کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ! مَا مِنَّا مِنْ أَحَدٍ إِلَّا مَالُهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهِ، ہم میں سے تو ایک بھی ایسا نہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا اعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ. قَالُوا: مَا نَعْلَمُ إِلَّا ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ: إِنَّمَا مَالُ أَحَدِكُمْ مَا قَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِهِ مَا أَخَّرَ (ابو یعلیٰ موصلی، ابن کثیر) اور سوچ لو، انہوں نے کہا یارسول اللہ! یہی بات ہے فرمایا سنو تمہارا مال وہ ہے جسے تم اللہ کی راہ میں دے کر اپنے لئے آگے بھیج دو اور جو چھوڑ جاؤ گے وہ تمہارا مال نہیں وہ تمہارے وارثوں کا مال ہے۔ (بخاری ونسائی)

{وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ} یہاں سورت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمارہے ہیں کہ وہ اپنے تمام کاموں میں استغفار کیا کریں، جو استغفار کرے گا وہ مغفرت حاصل کرے گا کیونکہ اللہ مغفرت کرنے والا اور مہربانیوں والا ہے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ، آج سورۃ المزمل پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

۱۳ جون ۲۰۱۹ء، ۹ شوال ۱۴۴۰ھ بروز جمعرات بوقت ڈیڑھ بجے شب

حروف بینی: ۵ اگست ۲۰۱۹ء بروز پیر، حال وارد حدوٹ، مری

المدثر

تاج رسالت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنْذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿٥﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿٦﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿٧﴾ المدثر.

جواب ترجمہ: اے کپڑے میں لپٹنے والے اٹھو اور لوگوں کو خبر دار کرو۔ اور اپنے پروردگار کی تکبیر کہو۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ اور گندگی سے کنارہ کرلو۔ اور کوئی احسان اس نیت سے نہ کرو کہ زیادہ وصول کرسکو۔ اور اپنے پروردگار کی خاطر صبر سے کام لو۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ اے اپنے کپڑوں میں لپٹنے والے! اپنی خواب گاہ سے اٹھیے، لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے، اپنے رب کی تعظیم کیجیے، توحید بیان کیجیے اور عبادت کیجیے، اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھیے، کیونکہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کی عکاسی کرتی ہے، بت پرستی اور تمام شرکیہ اعمال وافعال سے دور رہیے، ان کے قریب تک نہ جائیے، کسی کو عطیہ اس لیے نہ کیجیے کہ اس سے زیادہ وصول کرلیں گے، یہ باتیں نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عالی اخلاق کا مالک بنا کر بھیجا تھا، آپ ﷺ بہترین اخلاق اور عمدہ صفات سے آراستہ تھے، اس لیے یہ تمام باتیں جن سے آپ ﷺ کو روکا جارہا ہے اور جن کو اپنانے کا حکم دیا جارہا ہے ان سے مزید نکھار پیدا ہوتا ہے۔

لفظ مدثر اصل میں متدثر تھا اس میں بھی تفعل کی ت فا کلمہ سے بدل کر اسی میں مدغم ہوگئی، اصل مادہ دثر (د ث ر) ہے جس کا معنی کپڑا اوڑھنے کا اور کپڑے میں لپٹنے کا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ پر پہلی مرتبہ وحی آنے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم غار حرا میں عبادت کے لیے کئی کئی راتیں گزارا کرتے تھے کھانے پینے کا سامان ساتھ

لے جایا کرتے تھے ایک دن فرشتہ آیا اس نے کہا اقرأ کہ پڑھیے (آگے آپ کی زبانی بیان کیا) میں نے کہا مَا اَنَا بِقَارِی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اتنے زور سے دبایا کہ تکلیف انتہا کو پہنچ گئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور وہی بات کہی کہ اقرأ میں نے وہی جواب دیا: ما انا بقاری پھر اس نے مجھے دوبارہ پکڑ کر اسی قدر دبایا کہ تکلیف انتہا کو پہنچ گئی فرشتے نے تیسری مرتبہ پھر مجھے دبایا اور چھوڑ دیا اور فرشتہ یوں عبارت پڑھتا چلا گیا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ نبی کریم ﷺ نے یہ عبارت سن لی اور اس کو دہرالیا، اس کے بعد آپ ﷺ وہاں سے اپنے گھر تشریف لے آئے، اس وقت دل کانپ رہا تھا، اپنی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے فرمایا زَملونی زملونی (مجھے کپڑا اوڑھاؤ، مجھے کپڑا اوڑھاؤ) چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کو کپڑا اوڑھا دیا، آپ تھوڑی دیر لیٹے رہے یہاں تک کہ گھبراہٹ کی کیفیت جاتی رہی اس کے بعد بہت دن تک وحی نہیں آئی، بعض حضرات نے کہا تین سال تک وحی رکی رہی۔ (قسطلانی، انوار البیان)

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فترۃ الوحی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے یوں نقل کیا ہے کہ میں ایک دن جا رہا تھا میں نے آسمان سے آواز سنی، نظر اٹھائی تو دیکھا کہ جو فرشتہ میرے پاس حراء میں آیا تھا وہی آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اسے دیکھ کر مجھ پر رعب طاری ہو گیا میں واپس ہو کر گھر پہنچا اور وہی بات کہی کہ زملونی زملونی مجھے کپڑا اوڑھاؤ، مجھے کپڑا اوڑھاؤ، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ {۱} قُمْ فَاَنْذِرْ {۲} وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ {۳} وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ {۴} وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ {۵} المدثر اس کے بعد مسلسل وحی آنے لگی اور آتی رہی۔ (صحیح بخاری ۱)

ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کو اول تو یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے مخاطب فرمایا کیونکہ اس وقت آپ کپڑا اوڑھے ہوئے تھے پھر حکم فرمایا کہ قُمْ (آپ کھڑے ہو جایئے) فَاَنْذِرْ (اور آپ ڈرایئے) اس

میں آپ کو دعوت توحید کے کام پر مامور فرمادیا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشیر بھی تھے اور نذیر بھی لیکن ابتدائے نبوت میں چونکہ انذار ہی غالب تھا اس لیے صرف انذار کا ذکر فرمایا یہ بطور اکتفاء ہے جس میں ایک چیز کو ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ شے مذکور سے سمجھ میں آتی ہے۔(روح المعانی)

صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ پر سب سے پہلی وحی کے طور پر تو سورۃ علق کی پہلی پانچ آیتیں نازل ہوئی تھیں، اس کے بعد ایک عرصے تک وحی کا سلسلہ بند رہا، پھر سورۃ مدثر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔(آسان ترجمہ)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں دونوں روایات جمع کرنے کے بعد تطبیق دی کہ ابتدائی آیات جو نازل ہوئیں وہ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات تھیں، پھر کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ رک گیا تھا، جس کو فترۃ کا زمانہ کہا جاتا ہے، زمانہ فترت کے بعد سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔(تفسیر ابن کثیر)

آیت ۷ کے تحت شیخ الاسلام تقی عثمانی لکھتے ہیں "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی تبلیغ کا حکم ہوا تو اس بات کا پورا اندیشہ تھا کہ کافر لوگ آپ کو ستائیں گے، اس لئے حکم دیا گیا کہ فی الحال مسلح جدوجہد نہیں کرنی ہے، صبر سے کام لینا ہے اور ان کی زیادتیوں کی اصل سزا انہیں اس وقت ملے گی جب قیامت کے لئے صور پھونکا جائے گا جس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔(ایضاً)

طبرانی میں اس سورت کا شان نزول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ إِنَّ الْوَلِيدَ بْنَ الْمُغِيرَةِ صَنَعَ لِقُرَيْشٍ طَعَامًا، فَلَمَّا أَكَلُوا قَالَ: مَا تَقُولُونَ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: سَاحِرٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَيْسَ بِسَاحِرٍ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: كَاهِنٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ:

لَيْسَ بِكَاهِنٍ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: شَاعِرٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَيْسَ بِشَاعِرٍ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: [بَلْ] سِحْرٌ يُؤثر فَأَجْمَعَ رَأْيُهُمْ عَلَى أَنَّهُ سِحْرٌ يُؤْثَرُ فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فحزنَ وقَنعَ رَأْسَهُ، وتَدَثَّر، فَأَنْزَلَ اللهُ {يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ} (معجم کبیر طبرانی)

ولید بن مغیرہ نے قریشیوں کی دعوت کی جب سب کھا پی چکے تو کہنے لگا بتاؤ تم اس شخص کی بابت کیا کہتے ہو؟ تو بعض نے کہا جادو گر ہے بعض نے کہا نہیں ہے، بعض نے کہا کاہن ہے کسی نے کہا کاہن نہیں ہے، بعض نے کہا شاعر ہے بعض نے کہا شاعر نہیں ہے، بعض نے کہا اس کا یہ کلام یعنی قرآن منقول جادو ہے چنانچہ اس پر اجماع ہو گیا کہ اسے منقول جادو کہا جائے حضور ﷺ کو جب یہ اطلاع پہنچی تو غمگین ہوئے اور سر پر کپڑا ڈال لیا اور کپڑا اوڑھ بھی لیا جس پر یہ آیتیں فاصبر تک اتریں۔

صُور اور اسرافیل

سوال آیات ذیل کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے اور یہ بتایئے کہ یہاں النَّاقُوْرِ کا کیا مطلب اور مفہوم ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ {٨} فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۙ {٩} عَلَى الْكٰفِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ {١٠} المدثر.

جواب ترجمہ: پھر جب صور میں پھونک مار دی جائے گی۔ تو وہ بڑا مشکل دن ہو گا۔ اور کافروں کے لیے وہ آسان نہیں ہو گا۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے سفید موتی سے جو بلور کی طرح چمکدار تھا، صور کو بنایا پھر عرش کو حکم دیا کہ صور کو پکڑ لے، صور عرش سے معلق ہو گیا پھر کن فرمایا تو اسرافیل علیہ السلام پیدا ہو گیا۔ اللہ نے اسرافیل علیہ السلام کو صور لے لینے کا حکم دیا، اسرافیل علیہ السلام نے صور لیا، صور میں ہر پیدا شدہ روح کی تعداد کے مطابق سوراخ ہیں کسی ایک سوراخ سے دو روحیں بر آمد نہیں ہوں گی صور کے وسط میں آسمان و زمین کے چکر کی طرح ایک گول سوراخ ہے جس پر اسرافیل اپنا منہ رکھے ہوئے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اسرافیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ نفخہ اور صیحہ کی خدمت میں نے تیرے سپرد کی، اسرافیل علیہ السلام عرش کے اگلے حصے میں داخل ہو گیا اور سیدھا قدم عرش کے نیچے اور بایاں قدم عرش کے اندر رکھے ہوئے اللہ کے حکم کے انتظار میں ہے۔ (جوہری، ابو الشیخ، ابن حبان)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَحَنَى جَبْهَتَهُ، يَنْتَظِرُ مَتَى يُؤْمَرُ فَيَنْفُخُ؟ فَقَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَمَا تَأْمُرُنَا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: قُولُوا: حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا.

میں کس طرح آرام پاؤں جب کہ صور والا تو صور منہ میں لیے پیشانی جھکائے کانوں کو خدا کے حکم کی طرف متوجہ کیے موجود ہے کہ کب اس کو صور پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے؟ یہ بات سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم یوں کہو کہ ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے، وہی بہترین کارساز ہے اور اللہ پر ہم نے بھروسہ کیا۔ (ترمذی، احمد)

یہ دن کافروں کے لیے بہت ہی ہولناک، وحشت ناک اور شدید ترین دن ہو گا، خود کافر پکار اٹھیں گے کہ آج کا دن بہت ہی سخت دن ہے، سورج بہت ہی قریب ہو گا، ہر شخص پسینہ سے شرابور ہو گا، نفسی نفسی کی صدا ہو گی، انسانی اعمال کا نتیجہ سامنے آجائے گا، سب کچھ واضح ہو جائے گا، زبان بند اور اعضاء گواہی دیں گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی شدت کا ذکر اپنی تفسیر میں کرتے ہوئے ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت زرارہ بن اوفی رحمہ اللہ جو بصرے کے قاضی تھے وہ ایک مرتبہ اپنے مقتدیوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اسی سورت کی تلاوت تھی جب اس آیت پر پہنچے تو

بے ساختہ زور کی ایک چیخ منہ سے نکل گئی اور گر پڑے لوگوں نے دیکھا روح پرواز ہو چکی تھی، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلنَّاقُور: ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ صور ہے جس میں حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلنَّاقور سے مراد صور ہے، وہ بگل کی طرح کی ایک چیز ہے جس میں اسرافیل پھونکیں گے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ناقور، نقر سے فاعول کا وزن ہے گویا یہ ایسی چیز ہے جس کی شان یہ ہے کہ آواز پیدا کرنے کے لیے جسے کھٹکھٹایا جائے بلکہ عرب میں نقر کا معنی آواز ہے (قرطبی) قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ لفظ نقر سے بنا ہے۔ نقر کا معنی ہے آواز پیدا کرنا، اصل معنی ہے کسی چیز کو اتنا کھٹکھٹانا کہ آخر اس میں سوراخ ہو جائے، پرندہ کی چونچ کو منقار اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ (مظہری)

ولید بن مغیرہ لعنتی کے احوال

سوال آیات ذیل کی روشنی میں بتایئے کہ ولید بن مغیرہ مخزومی کا کیا قصہ ہے؟ یہ شخص قرآن کریم اور حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے بارے میں کیا کہا کرتا تھا؟

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا {۱۱} وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا {۱۲} وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا {۱۳} وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا {۱۴} ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ {۱۵} كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا {۱۶} سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا {۱۷} اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ {۱۸} فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ {۱۹} ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ {۲۰} ثُمَّ نَظَرَ {۲۱} ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ {۲۲} ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ {۲۳} فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ {۲۴} اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ {۲۵} سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ {۲۶} وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ {۲۷} لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ {۲۸} لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ {۲۹} عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ {۳۰} المدثر

جواب ترجمہ: اس شخص کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ اور اس کو مال دیا جو دور

تک پھیلا پڑا ہے۔ اور بیٹے دیے جو سامنے موجود رہتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہر کام کے راستے ہموار کر دیے۔ پھر بھی وہ یہ لالچ کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہر گز نہیں! وہ ہماری آیتوں کا دشمن بن گیا ہے۔ عنقریب میں اسے ایک کٹھن چڑھائی پر چڑھاؤں گا۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ اس نے سوچ کر ایک بات بنائی۔ خدا کی مار ہو اس پر کہ کیسی بات بنائی۔ دوبارہ خدا کی مار ہو اس پر کہ کیسی بات بنائی۔ پھر اس نے نظر دوڑائی۔ پھر تیوری چڑھائی، اور منہ بنایا۔ پھر پیچھے کو مڑا، اور غرور دکھایا۔ پھر کہنے لگا کہ: کچھ نہیں، یہ تو ایک روایتی جادو ہے۔ کچھ نہیں یہ تو ایک انسان کا کلام ہے۔ عنقریب میں اس شخص کو دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تمہیں کیا پتہ کہ دوزخ کیا چیز ہے؟ وہ نہ کسی کو باقی رکھے گی، اور نہ چھوڑے گی۔ وہ کھالوں کو جھلس دینے والی چیز ہے۔ اس پر انیس (کارندے) مقرر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ یہاں ولید بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں اپنے غیظ وغضب اور جلال کا اظہار فرما رہے ہیں، ولید بن مغیرہ مخزومی قریش کا سردار تھا، اسے رب تعالیٰ نے مال و دولت کی فراوانی کر رکھی تھی، اس کے کھیت اور کھلیان تھے، جانوروں کی بہتات تھی، تجارت تھی، دس یا اس سے زیادہ اولاد تھی جو حاضر باش تھی، مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھی، اللہ نے اس کے لیے عیش و عشرت کے سامان کر رکھے تھے، یہ سب فراوانیوں اور عطاؤں کے بعد مزید نعمتوں اور فراوانیوں کا طلب گار تھا۔

رب تعالیٰ نے اس فاجر، اثیم، عنید اور سرکش کافر پر مزید عنایات روک دیں، جو کچھ اسے مل چکا تھا سو مل چکا تھا، یہ شخص ایسا بدبخت اور کمینہ تھا کہ قرآن کریم کی مخالفت اور دشمنی کرتا تھا، قرآن کریم کو جھٹلاتا تھا، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اسے اس کے حال پر رہنے دیا جائے، میں جانوں اور یہ جانے، میں اسے عذاب دوں گا، میں اسے جہنم میں آگ کے دھکتے پہاڑوں پر چڑھاؤں گا اور نیچے لڑھکاؤں گا، یہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں لڑھکتا رہے گا۔

یہ لعنتی شخص تھا، اس پر اللہ کی پھٹکار ہوئی، یہ ہلاکت اور تباہی میں جا گرا، یہ شخص نبی کریم ﷺ کی مخالفت کرتا تھا، قرآن کریم کا استہزا اور تمسخر اڑاتا تھا، یہ بدبخت قرآن کریم کے بارے میں کہتا تھا

کہ قرآن کریم ایسا جادو ہے جو پہلے لوگوں سے منقول ہے، یہ مخلوق کا کلام ہے جسے محمد ﷺ نے سیکھا ہے پھر دعویٰ کیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اللہ کی طرف سے آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا، ایسی سخت آگ اسے جلائے گی کہ جو انسانی چمڑی ادھیڑ دے گی، گوشت پوست تو گوشت پوست ہے انسانی ہڈیاں تک پگھلا دے گی، صرف چمڑی کو جلائے گی نہیں بلکہ اس کی رنگت بھی بدل ڈالے گی، سخت ترین زبانیہ نامی انیس فرشتے اس پر مسلط ہوں گے۔

جس خبیث شخص نے اللہ کی نعمتوں کا کفر کیا اور قرآن کو انسانی قول کہا اس کی سزاؤں کا ذکر ہو رہا ہے، پہلے جو نعمتیں اس پر ہوئی ہیں ان کا بیان ہو رہا ہے کہ یہ تن تنہا خالی ہاتھ دنیا میں آیا تھا، اسے مال دیا، اسے اولاد سے نوازا، اور کچھ اس کے پاس نہ تھا پھر اللہ نے اسے مالدار بنا دیا، ہزاروں لاکھوں دینار، زر، زمین وغیرہ عنایت فرمائی اور باعتبار بعض اقوال کے تیرہ اور بعض اور اقوال کے دس لڑکے دیئے جو سب کے سب اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے، نوکر چاکر لونڈی غلام کام کاج کرتے رہتے اور یہ مزے سے اپنی زندگی اپنی اولاد کے ساتھ گزارتا، غرض دھن دولت لونڈی غلام بال بچے آرام آسائش ہر طرح کی مہیا تھی، پھر بھی خواہش نفس پوری نہیں ہوتی تھی اور چاہتا تھا کہ اللہ اور بڑھا دے، حالانکہ ایسا اب نہ ہوگا، یہ ہمارے احکامات کے علم کے بعد بھی کفر اور سرکشی کرتا ہے اسے صعود پر چڑھایا جائے گا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا **وَيْلٌ: وَادٍ فِي جَهَنَّمَ، يَهْوِي فِيهِ الْكَافِرُ أَرْبَعِينَ خَرِيفًا قَبْلَ أَنْ يَبْلُغَ قَعْرَهُ، والصَّعُود: جَبَلٌ مِنْ نَارٍ يَصْعَدُ فِيهِ سَبْعِينَ خَرِيفًا، ثُمَّ يَهْوِي بِهِ كَذٰلِكَ فِيهِ أَبَدًا،**

ویل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس میں کافر گرایا جائے گا چالیس سال تک اندر ہی اندر جاتا رہے گا لیکن پھر بھی تہ تک نہ پہنچے گا اور صعود جہنم میں آگ کی ایک پہاڑی کا نام ہے جس پر کافر کو چڑھایا جائے گا ستر سال تک تو چڑھتا ہی رہے گا پھر وہاں سے نیچے گرا دیا جائے گا ستر سال تک نیچے لڑھکتا رہے گا اور اسی ابدی سزا میں گرفتار رہے گا۔ (مسند احمد)

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا هُوَ جَبَلٌ فِي النَّارِ مِنْ نَارٍ يُكَلَّفُ أَنْ يَصْعَدَهُ، فَإِذَا وَضَعَ يَدَهُ ذَابَتْ، وَإِذَا رَفَعَهَا عَادَتْ، فَإِذَا وَضَعَ رِجْلَهُ ذَابَتْ، وَإِذَا رَفَعَهَا عَادَتْ (ابن ابی حاتم) صعود جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ہے جو آگ کا ہے اسے مجبور کیا جائے گا اس پر چڑھے ہاتھ رکھتے ہی راکھ ہو جائے گا اور اٹھاتے ہی بدستور ویسا ہی ہو جائے گا اسی طرح پاؤں بھی رکھتے ہی پگھل جائے گا اور جب اسے اٹھائے گا تو ویسا ہی ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صَعُودٌ: صَخْرَةٌ [فِي جَهَنَّمَ] عَظِيمَةٌ يُسْحَبُ عَلَيْهَا الْكَافِرُ عَلَى وَجْهِهِ، صعود جہنم کی ایک چٹان کا نام ہے جس پر کافر اپنے منہ کے بل گھسٹتا جائے گا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں صَعُودًا: صَخْرَةً مَلْسَاءَ فِي جَهَنَّمَ، يُكَلَّفُ أَنْ يَصْعَدَهَا صعود جہنم میں ایک چکنی چٹان ہے جس پر کافر کو زبردستی چڑھایا جائے گا۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صعود ایک مشقت والا عذاب ہے جس پر کافر کو چڑھایا جائے گا، حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا عذاب ہو گا جس میں کوئی آرام وراحت نہیں ہو گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس تکلیف دہ عذاب سے اس لئے قریب کر دیا کہ وہ ایمان سے بہت دور تھا وہ سوچ سوچ کر خود ساختہ دنیا میں رہتا تھا کہ وہ قرآن کی مانند کہے اور بات بنائے پھر اس پر افسوس کیا جاتا ہے اور محاورہ عرب کے مطابق اس کی ہلاکت کے کلمے کہے جاتے ہیں کہ یہ غارت کر دیا جائے یہ برباد کر دیا جائے کتنا بد کلام، بری سوچ، کتنی بے حیائی سے جھوٹ بات گھڑ لی، اور بار بار غور و فکر کے بعد پیشانی پر بل ڈال کر، منہ بگاڑ کر، حق سے ہٹ کر بھلائی سے منہ موڑ کر اطاعت اللہ سے منہ پھیر کر، دل کڑا کر کے کہہ دیا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ محمد ﷺ اپنے سے پہلے لوگوں کے جادو کا منتر نقل کر لیا کرتے ہیں اور اسی کو سنا رہے ہیں یہ کلام اللہ کا نہیں بلکہ انسانی قول ہے اور جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

اس ملعون کا نام ولید بن مغیرہ مخزومی تھا، قریش کا سردار تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ ولید پلید حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور خواہش ظاہر کی کہ آپ کچھ قرآن سنائیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے چند آیتیں پڑھ کر سنائیں جو اس کے دل میں گھر کر گئیں۔ جب ولید بن مغیرہ یہاں سے نکلا اور کفار قریش کے مجمع میں پہنچا تو کہنے لگا یَا عَجَبًا لِمَا یَقُولُ ابْنُ أَبِی کَبْشَةَ. فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ بِشِعْرٍ وَلَا بِسِحْرٍ وَلَا بِهٰذِی مِنَ الْجُنُونِ، وَإِنَّ قَوْلَهُ لَمِنْ کَلَامِ اللّٰهِ، لوگو! تعجب کی بات ہے حضرت محمد جو قرآن پڑھتے ہیں اللہ کی قسم! نہ تو وہ شعر ہے نہ جادو کا منتر ہے نہ مجنونانہ بڑ ہے بلکہ واللہ وہ تو خاص اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

قریش نے یہ سن کر سر پکڑ لیا اور کہنے لگے اگر یہ مسلمان ہو گیا تو بس پھر قریش میں سے ایک بھی بغیر اسلام لائے باقی نہ رہے گا، ابو جہل کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے کہا گھبراؤ نہیں دیکھو میں ایک ترکیب سے اسے اسلام سے پھیر دوں گا یہ کہتے ہی اپنے ذہن میں ایک ترکیب سوچ کر یہ ولید کے گھر پہنچا اور کہنے لگا أَلَمْ تَرَ قَوْمَكَ قَدْ جَمَعُوا لَكَ الصَّدَقَةَ؟ فَقَالَ: أَلستُ أَكْثَرَهُمْ مَالًا وَّوَلَدًا. فَقَالَ لَهُ أَبُو جَهْلٍ: يَتَحَدَّثُونَ أَنَّكَ إِنَّمَا تَدْخُلُ عَلَى ابْنِ أَبِی قُحَافَةَ لِتُصِيبَ مِنْ طَعَامِهِ. فَقَالَ الْوَلِيدُ: أَقَدْ تَحَدَّثَ بِهِ عَشِيرَتِی؟! فَلَا وَاللّٰهِ لَا أَقْرَبُ ابْنَ أَبِی قُحَافَةَ، وَلَا عُمَرَ، وَلَا ابْنَ أَبِی كَبْشَةَ. وَمَا قَوْلُهُ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ،

آپ کی قوم نے آپ کے لئے چندہ کر کے بہت سا مال جمع کر لیا ہے اور وہ آپ کو صدقہ میں دینے والے ہیں، اس نے کہا واہ کیا مزے کی بات ہے مجھے ان کے چندوں اور صدقوں کی کیا ضرورت ہے؟ دنیا جانتی ہے کہ ان سب میں مجھ سے زیادہ مال و اولاد والا کوئی نہیں، ابو جہل نے کہا یہ تو ٹھیک ہے لیکن لوگوں میں ایسی باتیں ہو رہی ہیں کہ آپ جو ابو بکر کے پاس آتے جاتے ہیں وہ صرف اس لئے کہ ان سے کچھ حاصل وصول ہو، ولید کہنے لگا او ہو میرے خاندان میں میری نسبت یہ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں مجھے مطلق معلوم نہ تھا اچھا اب قسم اللہ کی نہ میں ابو بکر کے پاس جاؤں نہ عمر کے پاس نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں

نازل فرمائیں۔(تفسیر ابن کثیر)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ولید بن مغیرہ نے کہا تھا وَاللّٰهِ لَقَدْ نَظَرْتُ فِيمَا قَالَ الرَّجُلُ فَإِذَا هُوَ لَيْسَ بِشِعْرٍ، وَإِنَّ لَهُ لَحَلَاوَةً، وَإِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً، وَإِنَّهُ لَيَعْلُو وَمَا يَعْلَى، وَمَا أَشُكُّ أَنَّهُ سِحْرٌ، قرآن کے بارے میں بہت کچھ غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ شعر تو نہیں اس میں حلاوت ہے، اس میں چمک ہے، یہ غالب ہے مغلوب نہیں لیکن ہے یقیناً جادو، اس پر یہ آیتیں اتریں۔

ابن جریر میں ہے کہ ولید حضور ﷺ کے پاس آیا تھا اور قرآن سن کر اس کا دل نرم پڑ گیا تھا اور پورا اثر ہو چکا تھا جب ابو جہل کو یہ معلوم ہوا تو دوڑا بھاگا آیا اور اس ڈر سے کہ کہیں یہ کھلم کھلا مسلمان نہ ہو جائے اس بھڑکانے کے لئے جھوٹ موٹ کہنے لگا کہ چچا آپ کی قوم آپ کے لئے مال جمع کرنا چاہتی ہے پوچھا کیوں؟ کہا اس لئے کہ آپ کو دین اور محمد ﷺ کے پاس آپ کا جانا چھڑوائیں کیونکہ آپ وہاں مال حاصل کرنے کی غرض سے ہی جاتے آتے ہیں اس نے غصہ میں آکر کہا میری قوم کو معلوم نہیں کہ میں ان سب سے زیادہ مالدار ہوں؟

ابو جہل نے کہا یہ ٹھیک ہے لیکن اس وقت تو لوگوں کا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ محمد ﷺ سے مال حاصل کرنے کی غرض سے آپ اسی کے ہو گئے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے دلوں سے اٹھ جائے تو آپ اس کے بارے میں کچھ سخت الفاظ کہیں تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ آپ اس کے مخالف ہیں اور آپ کو اس سے کوئی طمع نہیں۔

اس نے کہا بھئی بات تو یہ ہے کہ اس نے جو قرآن مجھے سنایا ہے قسم ہے اللہ کی نہ وہ شعر ہے نہ قصیدہ ہے اور نہ رجز ہے، نہ جنات کا قول اور نہ ان کے اشعار ہیں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ جنات اور انسان کا کلام مجھے خوب یاد ہے میں خود نامی شاعر ہوں کلام کے حسن وقبح سے خوب واقف ہوں

لیکن اللہ کی قسم محمد ﷺ کا کلام اس میں سے کچھ بھی نہیں، اللہ جانتا ہے اس میں عجیب حلاوت، مٹھاس، لذت، شیفتگی اور دلیری ہے، وہ تمام کلاموں کا سردار ہے اس کے سامنے اور کوئی کلام جچتا نہیں وہ سب پر چھا جاتا ہے اس میں کشش بلندی اور جذب ہے اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس کلام کی نسبت کیا کہوں؟

ابو جہل نے کہا سنو جب تک تم اسے برائی کے ساتھ یاد نہ کرو گے تمہاری قوم کے خیالات تمہاری نسبت صاف نہیں ہوں گے، اس نے کہا اچھا تو مجھے مہلت دو میں سوچ کر اس کی نسبت کوئی ایسا کلمہ کہہ دوں گا چنانچہ سوچ سوچ کر قومی حمیت اور ناک رکھنے کی خاطر اس نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے جسے وہ نقل کرتا ہے اس پر آیت (ذَرْنِی سے تِسعَةَ عَشَر) تک کی آیتیں اتریں۔

سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دارالندوہ میں بیٹھ کر ان سب لوگوں نے مشورہ کیا کہ موسم حج پر چاروں طرف سے لوگ آئیں گے تو بتاؤ انہیں محمد ﷺ کی نسبت کیا کہیں؟ کوئی ایسی تجویز کرو کہ سب بیک زبان وہی بات کہیں تاکہ عرب بھر میں اور پھر ہر جگہ بھی وہی مشہور ہو جائے تو اب کسی نے شاعر کہا کسی نے جادوگر کہا کسی نے کاہن اور نجومی کہا کسی نے مجنون اور دیوانہ کہا۔ ولید بیٹھا سوچتا رہا اور غور و فکر کر کے دیکھ بھال کر تیوری چڑھا اور منہ بنا کر کہنے لگا جادوگروں کا قول ہے جسے یہ نقل کر رہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ولید بن مغیرہ اپنے قبیلے کا سردار تھا، فصیح اللسان تھا، حالت کفر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس آیا اور آکر کہنے لگا کہ قرآن کریم میں سے کچھ سناؤ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنی آیات سنائیں تو حیران ہو کر کہنے لگا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے اور نہ ہی یہ شعر شاعری ہے، یہ بات جب ابولہب کو معلوم ہوئی تو اس نے ولید بن مغیرہ سے کہا کہ تو نے قریش کو یہ بات بتا کر خراب کر دیا ہے، تو اپنی بات سے رجوع کر لے، چنانچہ اس نے رجوع کرتے ہوئے کہا کہ یہ قرآن جادو ہے۔ (اعلام النبوۃ للماوردی ج ا ص ۷۶)

قریش کے وہ سات بد بخت لوگ جو آپ ﷺ کا استہزا کرتے اور ٹھٹھا اڑاتے تھے ان میں سے ایک ولید بن مغیرہ بھی تھا،وہ سات لوگ یہ تھے ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل سہمی، اسود بن عبدیغوث زہری،فکیہہ بن عامر فہری، حرث بن طلاطلہ،اسود بن حرث،ابن عیطلہ۔(اعلام النبوۃ)

جب قریش خانہ کعبہ کو منہدم کرکے دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے تو منہدم کرنے سے گھبرا رہے تھے،ولید بن مغیرہ وہ پہلا شخص تھا جس نے کدال لے کر یہ کہتے ہوئے خانہ کعبہ کا ایک حصہ گرایا کہ ہم اسے گرانے سے خیر کے طلب گار ہیں۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی کریم ﷺ کی بہن لبابہ صغریٰ بنت حارث ہلالیہ سے ولید بن مغیرہ مخزومی نے شادی کی تھی،لبابہ صغریٰ حضرت خالد بن ولید کی والدہ تھیں،جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے لبابہ کبریٰ بنت حارث ہلالیہ سے شادی کی تھی۔(اہمیت دراسۃ سیرت النبویہ والعنایہ بہافی حیات المسلمین ص ۱۳)

اسی ولید بن مغیرہ کے بیٹے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے، جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ وہ سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار تھے، وہ اسلام کے عظیم شہسوار تھے، وہ مجاہدین کے سپہ سالار تھے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں سیف اللہ فرمایا تھا کہ یہ مشرکین کے خلاف اللہ کی ننگی تلوار ہے، بہت سے معرکوں میں شریک ہوئے، اس تلوار کو کوئی آخر دم تک نہیں کاٹ سکا، کسی موقع پر شکست نہیں کھائی، بالآخر بستر پر موت آئی۔(اِمتاع الاسماع ج ا ص ۳۶۳)ولید بن مغیرہ کی بیٹی فاطمہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی تھیں۔(امتاع الاسماع)علامہ تقی الدین مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نزول آیت کے وقت ولید بن مغیرہ بہت صاحب مال واولاد شخص تھا، مگر اللہ نے سب کچھ فنا کر دیا تھا اور اس کی نسل منقطع ہوگئی تھی۔(امتاع الاسماع)

ولید بن مغیرہ قریش میں عمر رسیدہ انسان تھا، سارے قریش اس کے پاس جمع ہوئے کہ موسم حج قریب آرہا ہے، دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آئیں گے تو ہم یک زبان ہو کر نبی کریم ﷺ کے

خلاف کوئی رائے جمع کریں، کسی نے مجنون، کسی نے ساحر کسی نے شاعر، کسی نے کیا اور کسی نے کیا کہا، سب کی باتوں کو ولید بن مغیرہ نے رد کیا کہ یہ شاعر نہیں ہے، ہم نے شاعری دیکھ پڑھ رکھی ہے، یہ مجنون نہیں، غرضیکہ ساری باتوں کی نفی اور کلام اللہ شریف کی تعریف کے بعد اس نے لوگوں کو یہ رائے دی کہ وہ سارے ایک ہی بات کہیں کہ

هُوَ سَاحِرٌ يُفَرِّقُ بَيْنَ الْمَرءِ وَأَبِيهِ، وَبَيْنَ الْمَرءِ وَأَخِيهِ، [وَبَيْنَ الْمَرءِ] وَزَوجِهِ، وَبَيْنَ الْمَرءِ وَعَشِيرَتِهِ، فَتَفَرَّقُوا عَنهُ بِذٰلِكَ، وہ جادو گر ہے جو آدمی اور اس کے باپ کے درمیان تفریق کر دیتا ہے، آدمی اور اس کے بھائی کے درمیان تفریق کر دیتا ہے، خاوند اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے، آدمی اور اس کے قبیلے میں پھوٹ ڈالدیتا ہے، یہ بات سن کر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ (دلائل ابو نعیم، امتاع الاسماع)

جن کافروں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے کہا تھا کہ وہ چاند کے دو ٹکڑے کر دیں، ایک ٹکڑا جبل ابو قبیس اور دوسرا جبل قعیقعان پر جا لگے، ان میں ابو جہل کے علاوہ ایک ولید بن مغیرہ بھی تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ایسا کر دوں تو تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا تھا کہ ایمان لے آئیں گے، چودھویں رات تھی، نبی ﷺ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے اللہ! یہ لوگ جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں کر دیجیے، چنانچہ اللہ نے ایسا ہی کر دیا، چاند کا آدھا ٹکڑا جبل ابی قبیس اور آدھا جبل قعیقعان پر تھا، پھر آپ ﷺ نے ابو سلمہ بن عبد اسد اور ارقم بن ارقم سے فرمایا کہ تم اس پر گواہ رہو۔ (امتاع الاسماع)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب قریش کو معلوم ہو گیا کہ ابو طالب نے نبی کریم ﷺ، آپ کے اسلام، آپ کی جماعت کو جدا کرنے سے اور ان کی عداوت و دشمنی سے انکار کر دیا تو وہ ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر ابو طالب کے پاس چل کر آئے اور ان سے کہنے لگے، اے ابو طالب! یہ عمارہ بن ولید کڑیل جوان ہے، قری کا جوان ہے، ان میں سب سے زیادہ خوبصورت

ہے، اس کی عقل و دانشمندی، اس کی نصرت آپ کے لیے ہے، اسے اپنا بیٹا بنا لیجیے، یہ آپ ہی کے لیے ہے، اس کی جگہ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیجیے، جو آپ اور آپ کے آباؤ اجداد کے دین کا مخالف ہے، جس نے آپ کی قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا ہے، ہم اسے قتل کریں گے اس کے بدلے میں عمارہ بن ولید کو لے لیں، یہ سن کر ابو طالب نے کہا کہ قسم بخدا! بری چیز تم مجھے چکھاتے ہو، کیا تم مجھے اپنا بیٹا پیش کرتے ہو کہ میں اسے کھلاؤں اور میں اپنا بیٹا تمہارے سپرد کروں تاکہ تم اسے قتل کر دو؟ اللہ کی قسم ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا۔ (سیرت ابن ہشام، امتاع الاسماع) یہی عمارہ بن ولید قریش نے حبشہ کی طرف روانہ کیا تھا کہ وہاں سے مسلمانوں کو واپس لایا جائے۔

ولید بن مغیرہ کے ایک بیٹے ابو قیس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ بدر میں قتل کر دیا تھا، یہ حالت کفر میں مارا گیا تھا۔ (امتاع الاسماع) ولید بن مغیرہ کے ایک بیٹے ہشام نے ذی المجاز میں ابواز یہر دوسی کو قتل کر دیا تھا۔ ولید بن مغیرہ ان لوگوں میں بھی شامل تھا جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بتوں کی عبادت کرنے میں سودا بازی کرنے کی کوشش کی تھی، اس پر سورۃ الکافرون اتری۔ (امتاع الاسماع)

جہنم کے اُنیس فرشتے

سوال آیات ذیل کی روشنی میں بتایئے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے داروغوں کی یہ تعداد کیوں مقرر فرمائی ہے؟

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ {۳۰} وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ {۳۱} المدثر.

جواب ترجمہ: اس پر انیس داروغے مقرر ہیں۔ اور ہم نے دوزخ کے یہ کارندے کوئی اور نہیں، فرشتے مقرر کیے ہیں۔ اور ان کی جو تعداد مقرر کی ہے وہ صرف اس لیے کہ اس کے ذریعے کافروں کی آزمائش ہو، تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور جو لوگ ایمان لاچکے ہیں ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو، اور اہل کتاب اور مومن لوگ کسی شک میں نہ پڑیں، اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو لوگ کافر ہیں، وہ یہ کہیں کہ بھلا اس عجیب سی بات سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ ساری بات تو نوع بشر کے لیے ایک یاد دہانی کرانے والی نصیحت ہے اور بس۔

اللہ تعالیٰ نے جہنم پر انیس داروغے مقرر فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کافروں کی آزمائش کے لیے جہنم کے داروغوں کی یہ تعداد مقرر فرمائی ہے، تاکہ یہود و نصاریٰ کے ان لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ قرآن کریم میں جہنم کے جن داروغوں کے بارے میں خبر آئی ہے وہ اللہ کی طرف سے حق ہے، کیونکہ جس تعداد کا یہاں قرآن کریم میں ذکر ہے یہ ان کی کتابوں کے اندر بیان کی گئی تعداد کے موافق ہے۔

یہ تعداد اس لیے بیان کی گئی تاکہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر ایمان رکھنے والے اور آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کرنے والوں کا ایمان زیادہ ہو، اور اس بات میں یہود و نصاریٰ کے وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کو کچھ شک نہیں ہے۔

یہ تعداد اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق ہے وہ اور کافر لوگ یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عجیب سی تعداد سے کیا بتانا چاہتے ہیں؟ اس طرح کی چیزیں اللہ تعالیٰ بیان فرما کر ان لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں جن کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں، اور جن کو ہدایت دینا چاہتے ہیں انہیں ہدایت دے دیتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے بے شمار لشکر ہیں، جن کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا، ان لشکروں میں ملائکہ بھی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے لشکروں کو اچھی طرح جانتے ہیں، دوزخ کا تذکرہ تو یاد دہانی کے لیے ہے، لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عذاب دینے پر اور جہنم کی نگہبانی پر ہم نے فرشتے ہی مقرر کئے ہیں جو سخت بے رحم اور سخت کلامی کرنے والے ہیں، اس میں مشرکین قریش کی تردید ہے انہیں جس وقت جہنم کے داروغوں کی گنتی بتلائی گئی تو ابو جہل نے کہا اے قریشیو! یہ اگر انیس ہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک سو نوے ہم مل کر انہیں ہرا دیں گے اس پر کہا جاتا ہے کہ وہ فرشتے ہیں انسان نہیں انہیں نہ تم ہرا سکو نہ تھکا سکو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو الاَشُدَّین کلدہ بن اسید بن خلف نے اس گنتی کو سن کر کہا کہ قریشیو! اُكْفُونِي مِنْهُمُ اثْنَيْنِ وَأَنَا أَكْفِيكُمْ مِنْهُمْ سَبْعَةَ عَشَرَ, تم سب مل کر ان میں سے دو کو روک لینا باقی سترہ کو میں کافی ہوں، یہ بڑا مغرور شخص تھا اور ساتھ ہی بڑا قوی تھا یہ گائے کے چمڑے پر کھڑا ہو جاتا پھر دس طاقتور شخص مل کر اسے اس کے پیروں تلے سے نکالنا چاہتے کھال کے ٹکڑے اڑ جاتے لیکن اس کے قدم جنبش بھی نہ کھاتے۔

علامہ سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَهُوَ الَّذِي دَعَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى مُصَارَعَتِهِ وَقَالَ: إِنْ صَرَعْتَنِي آمَنْتُ بِكَ، فَصَرَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِرَارًا، فَلَمْ يُؤْمِنْ، یہی شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر کہا تھا کہ آپ مجھ سے کُشتی لڑیں اگر آپ نے مجھے گرا دیا تو میں آپ کی نبوت کو مان لوں گا چنانچہ حضور ﷺ نے اس سے کُشتی کی اور کئی بار گرایا لیکن اسے ایمان لانا نصیب نہ ہوا۔ (الروض الانف ج ا ص ۲۰۰)

امام ابن اسحاق نے کشتی والا ایک اور واقعہ رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن عبد المطلب کا بتایا ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ دونوں واقعات الگ الگ ہوں۔ جہنم کے داروغہ کا نام

مالک ہے، اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کی انگلیاں اتنی بنائی ہیں جتنی کہ دوزخیوں کی تعداد ہے، جس دوزخی کو عذاب دیا جاتا ہے مالک فرشتہ اسے اپنی انگلیوں میں سے ایک انگلی کے ساتھ عذاب دیتا ہے، اگر مالک فرشتہ اپنی انگلیوں میں سے ایک انگلی آسمان پر رکھ دے تو اسے پگھلا دے۔ (عیون الاخبار، الحبائک فی اخبار الملائک)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا وَالَّذِی نَفسِی بِیَدِہٖ لَقَد خُلِقَت مَلَائِکَۃُ جَھَنَّمَ قَبلَ أَن تُخلَقَ جَھَنَّمُ بِأَلفِ عَامٍ، فَھُم کُلَّ یَومٍ یَزدَادُونَ قُوَّۃً إِلَی قُوَّتِھِم (صفۃ النار ضیاء مقدسی) اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جہنم کے فرشتے جہنم کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے پیدا کیے گئے وہ روزانہ اپنی قوت کے اعتبار سے زیادہ ہو رہے ہیں۔

دوزخ کے جن انیس داروغوں کے بارے میں یہاں ذکر کیا گیا ہے، ان کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ان انیس فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے دونوں کاندھوں کے درمیان سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، ان کے دل میں کوئی رحمت اور مہربانی نہیں ہے، یہ عذاب دینے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فرشتہ جہنمیوں کو لات مارے گا تو انہیں آٹے کے ڈھیر کی طرح پیس کر رکھ دے گا۔ (الحبائک فی اخبار الملائک لجلال الدین سیوطی)

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ان کی آنکھیں اچکنے والی برق کی طرح، ان کی آواز تیز گرجنے والی بجلی کی طرح، ان کے دانت بارہ سنگھے کے سینگوں کی طرح اور ان کے بال اس قدر لمبے کہ گویا دامن کھینچے جا رہے ہیں اور فوارے کی طرح آگ کے شعلے ان کے منہ سے جوش مارتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے دونوں کندھوں کے درمیان ایک سال کی راہ کا فاصلہ ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ کی ہتھیلی لاکھوں کی گنجائش رکھتی ہے، مہربانی اور نرمی ان کے دل سے بالکل دور کر دی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک ستر ستر ہزار کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر جہاں چاہے لے جاتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ زبانیہ یعنی داروغہ جہنم کے انیس ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور ان کے انیس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دوزخ غضب الٰہی کے ظہور کا محل ہے اور جس طرح کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی کام کو سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، تمام مخلوقات کی روحانیات اس رحمت کے کارخانہ کی خدمت کرتی ہے تاکہ اس کے تقاضا کی صورت رونما ہو اور اسی لیے کہتے ہیں

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

یعنی بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو روٹی حاصل کرے اور غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کا غضب اور قہر کسی مہم کو جاری کرنے کی طرف توجہ فرماتا ہے تو مخلوقات کی روحانیات کو خدمت سے چارہ نہیں۔ پس کارخانہ غضب جو کہ دوزخ ہے، سرانجام دینے کے لیے ایسا فرشتہ ضروری ہوا جو کہ عرش مجید کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور اس کا نام مالک ہے اور وہ اپنی عمر میں کبھی ہنسا نہیں اور اس کا چہرہ کبھی کسی نے کشادہ نہیں دیکھا اور وہ اس مکان کے بمنزلہ بادشاہ کے ہے کہ باقی سب فرشتے اس کے تابع فرمان ہیں اور حکم کرنا اور کام کرانا اس کی ڈیوٹی ہے۔

اور دوسرا فرشتہ بھی ضروری ہے جس کا کرسی کی روحانیت کے ساتھ تعلق ہے اور طبقات پر جہنمیوں کی تقسیم اور ہر کسی کے عذاب کا اندازہ مقرر کرنا اس کا منصب ہے اور وہ مالک کا دیوان اور دفتر دار ہے۔

اور تیسرا فرشتہ بھی ضروری ہے جو ساتویں آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جو کہ زحل کا مسکن ہے اور دوزخیوں کے جسموں کو اس سے بچانا کہ آگ اور عذاب کی دوسری قوموں کی وجہ سے بالکل ختم ہو جائیں اور ان جسموں کو ہمیشہ رہنے کے قابل بنانا اور لحہ لحہ تازہ کھال اگانا اور جلے ہوئے اور مضروب اعضاء کو درست کرنا اس کی ڈیوٹی ہے اور وہ مالک کی آبادی کے مئیر کے مقام پر ہے۔

اور چوتھا فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ چھٹے آسمان کی روحانیت سے تعلق رکھے جو کہ مقام مشتری ہے اور دوزخیوں کے درمیان جھگڑے ڈالنا تاکہ پیروی کرنے والے اور راہبر ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کریں اور ایک شخص دوسرے پر لعنت اور نفرت کا اظہار کرے جیسا کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کے باہمی جھگڑوں کا ذکر ہے، اس کا کام ہے اور وہ بمنزلہ قاضی مالک ہے۔

اور پانچواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ پانچویں آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جو کہ مریخ کا مسکن ہے اور جہنمیوں کو پکڑنا، باندھنا، کھینچنا اور پٹائی کرنا اس کے ذمے ہے اور وہ مالک کا کوتوال، جلاد اور میر عذاب ہے۔

اور چھٹا فرشتہ بھی ضروری ہے جس کا چوتھے آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق ہو جو کہ سورج کا مقام ہے اور اعتقادات کے باطل ہونے اور اعمال کے قبیح ہونے کا اظہار کرنا اور دوزخیوں پر رسوائی اور ندامت ڈالنا کہ روحانی عذاب میں گرفتار رہیں، اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے معلم اور استاذ کے منصب پر ہے۔

اور ساتواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ تیسرے آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جو کہ زہرہ کا محل ہے اور دوزخیوں کو غیر موزوں صدائیں، بری آوازیں، نوحہ، بین، زفیر، شہیق یاد دلانا اس کا کام ہے اور اس جہان کے گویے کے منصب پر ہے۔

اور آٹھواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ دوسرے آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جو کہ عطارد کی جائے قرار ہے اور ایک گروہ کی خبریں دوسرے گروہ کو پہنچانا اور دوزخیوں کے عذاب کی کیفیت ایک دوسرے کے پاس نقل کرنا تاکہ اسے سن کر ان کے قریبیوں اور دوستوں کے دل جلیں اور شدید حسرت دامن گیر ہو، اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے بمنزلہ جاسوس، ہرکارے اور قاصد کے ہے۔

اور نواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ پہلے آسمان کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جو کہ چاند کی سیر گاہ ہے اور زخموں کو متعفن کرنا، بدبوؤں کو پیدا کرنا اور ان کے جسموں سے پیپ اور خون کو چشموں کی طرح جاری کرنا اس کا کام ہے اور وہ وہاں کے جراح کے منصب پر ہے۔

اور دسواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ کرہ آتش کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور آگ جلانا، شعلے نکالنا اور دوزخیوں کے جسموں کو پکا کرنا ان کا شیوہ ہے اور وہ اس عالم کے باورچی کے منصب پر ہے۔

اور گیارہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ کرہ ہوا کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور دھواں اٹھانا اور اسے دوزخیوں کے جسموں کے سوراخوں اور مساموں میں داخل کرنا اور زہریلی ہوا کو حرکت میں لانا اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے فراش کے منصب پر ہے۔

اور بارہواں فرشتہ بھی ضروری ہے کہ جو پانی کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور طبقہ زمہریر کو سنوارنا اور دوزخیوں کے جسموں میں بے انتہاء ٹھنڈک پیدا کرنا اس کا کام ہے اور اس عالم کے امیر البحر کے مقام پر ہے۔

اور تیرہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ خاک کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور دوزخیوں کے جسموں میں زبردست بوجھ پیدا کرنا اور ان کا ہر دانت بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہو جائے اور ان کی ہر ران دوسرے پہاڑ کی طرح تاکہ ان پر ہلنا اور چلنا دشوار ہو جائے اور اپنے اعضاء کو اٹھا نہ سکیں اور گالیاں بکنے والوں وغیرہم کو گرم راکھ کا سفوف بنا کر کھلانا اور اس قسم کے کام اس کے ذمے ہیں اور وہ اس جہان کے بمنزلہ پہلوان کے ہے۔

اور چودہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ معدنیات کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور زنجیر اور طوق درست کرنا اور لوہے کے دوسرے آلات کو آگ میں ڈال کر گرم کرنا اور سونے اور چاندی

کی تختیاں بنانا تاکہ ان کے ساتھ دوزخیوں کی پیشانیوں، پشتوں اور پہلوؤں کو داغا جائے اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے لوہار کے منصب پر ہے۔

اور پندرہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ نباتات اور درختوں کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے اور زقوم کا درخت اگانا اور دوسرے خاردار زہر آلود درختوں کو پالنا تاکہ وہ دوزخیوں کی خوراک میں صرف ہوں، اس کا ذمہ ہے اور وہ اس جہان کے بمنزلہ کسان کے ہے۔

اور سولہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جس کا تعلق حیوان کی روحانیت کے ساتھ ہو اور سانپ، بچھو، مکھی اور پسو کو دوزخیوں پر مسلط کرنا اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے بمنزلہ میر شکار کے ہے۔

اور سترہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ لطیفہ طبع کے ساتھ تعلق رکھے جس کا مقام جگر ہے اور دوزخیوں کو بے انتہاء بھوک اور پیاس دینا تاکہ الجوع الجوع اور العطش العطش کے عذاب میں گرفتار ہوں اور زقوم و حمیم کو کھا پی سکیں، اس کا کام ہے اور وہ اس عالم کے بمنزلہ طبیب کے ہے۔

اور اٹھارہواں فرشتہ بھی ضروری ہے جو کہ لطیفہ قلب کی روحانیت کے ساتھ تعلق رکھے جس کا محل مضغہ صنوبری ہے اور دل کو دوزخیوں پر ستانے والی کیفیات جیسے بے انتہاء خوف، بے حد گھبراہٹ اور بے پناہ شرم ساری ڈالنا اس کا کام ہے اور وہ اس جہان کے بمنزلہ مرشد اور شیخ کے ہے۔

اور انیسواں فرشتہ بھی ضروری ہے جس کا تعلق لطیفہ عقل سے ہو جس کا محل دماغ ہے اور دوزخیوں کو اپنی ان غلطیوں پر تنبیہ جو کہ انہوں نے علم و عمل میں کی تھیں، امور حقیہ واقعیہ اور ان کے دلائل کی قوت اور اپنے شبہات کی خرابی کو دریافت کرنا، اس چیز کی عظمت کا ظہور کہ جسے حقیر سمجھتے تھے اور اس چیز کی حقارت کا ظہور جسے عظیم سمجھتے تھے اس کی تعلیم سے حاصل ہو گا اور وہ اس جہان کے بمنزلہ حکیم اور فیلسوف کے ہے۔

اور چونکہ کارخانہ عذاب ظاہری اور باطنی طور پر ان روحانیات کے اجتماع کے بغیر پورا نہیں ہوتا اس لیے ان کا اجتماع ضروری ہوا لیکن یہ انیس افراد اس جہان کے بمنزلہ سرداروں کے ہیں جس طرح

کہ دنیا میں بھی یہی انیس افراد کارخانہ رحمت کو سرانجام دیتے تھے اور ان کے خادموں، مددگاروں اور پیروکاروں کا کون ہے جو شمار کرے جیسا کہ دنیا میں ان انیس روحانیتوں کے لشکروں کو شمار نہیں کر سکتا تھا۔ (تفسیر عزیزی)

اور بعض محققین نے کہا ہے کہ چونکہ دوزخ نحوستوں اور دکھوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے تو وہاں ہر چیز کی نحوست کا ایک ظہور لازمی ہو گا اور جہان میں نحوست کے اسباب انیس چیزوں میں منحصر ہیں، سات ستارے اور بارہ برج، ان انیس میں سے ہر ایک کی نحوست پہنچانے کے لیے ایک فرشتہ معین ہو گا جس طرح کہ جنت کے

مؤکل فرشتے ان انیس چیزوں کو تمام سعادتیں اور برکتیں جنتیوں کے لیے جنت میں لے جائیں گے لیکن چونکہ جنتیوں کی سعادت کے اسباب ان انیس چیزوں میں منحصر نہیں ہوں گے بلکہ ان سعادتوں کے علاوہ دیگر سعادتیں ان کے لیے رحمت الٰہی کے مخفی خزانوں سے ظاہر کی جائیں گی اس وجہ سے جنت کے مؤکلوں کی تعداد اس میں منحصر نہ ہوئی۔ (تفسیر عزیزی)

اور حکماء نے کہا ہے کہ دوزخ نفس انسانی کے فساد کی سزا ہے اور نفس انسانی کا فساد اس کی دو قوتوں میں جو کہ نظری اور عملی ہیں، لاحق ہوتا ہے اور وہ اس فساد کی وجہ سے حیوانی اور طبعی قوتوں کو اپنے موقع محل میں استعمال نہیں کرتا بلکہ ان قوتوں کو اس مقصد کے خلاف استعمال کرتا ہے، جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں تو ہر ضائع کی گئی قوت کے مقابلے میں لازماً ایک فرشتہ پیدا ہو گا جو کہ اس قوت کو ضائع کرنے پر عذاب دے گا اور حیوانی قوتیں بارہ ہیں، پانچ ظاہری حواس، پانچ باطنی حواس، قوت شہویہ اور قوت غضبیہ اور طبعی قوتیں سات ہیں، جذب کرنے والی، روکنے والی، ہضم کرنے والی، دور کرنے والی، غذا کو جزو بدن بنانے والی، نشو و نما کرنے والی اور پیدا کرنے والی۔ (تفسیر عزیزی)

اور حساب والے کہتے ہیں کہ عدد کی دو قسمیں ہیں قلیل اور وہ ایک سے نو تک ہے اور کثیر اور وہ دس سے بے انتہاء تک، پس اس عدد میں قلیل کی انتہاء کو کثیر کی ابتدا کو جمع فرمایا گیا ہے۔

اور علماء کرام رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک ایمان والے فاسقوں کے لیے ہے، اس دروازے پر ایک محافظ مقرر ہے، اس لیے کہ فاسقوں کو صرف ترک عمل کی وجہ سے عذاب ہے اور بس اور باقی چھ دروازوں میں سے ہر ایک پر تین محافظ مقرر ہیں، اس لیے کہ کفار کو تین چیزوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، ترک اعتقاد، ترک اقرار اور ترک عمل۔

اور واعظوں نے کہا ہے کہ دن اور رات کے چوبیس گھنٹے ہیں، پانچ گھنٹوں کی پانچ وقتہ نماز کے احترام کی وجہ سے معافی ہو گئی اور ہر گھنٹے کے عوض کہ جسے مرضی الٰہی کی مخالفت میں صرف کر کے ضائع کیا ہے، ایک فرشتہ ہو گا جو کہ عذاب دے گا اور یہ کلام معتبر تفاسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

اور فقہاء رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس عدد کا راز بشری عقل دریافت نہیں کر سکتی جس طرح کہ تمام شرعی اعداد توقیفی کو جیسے آسمانوں، طبقات زمین، ستاروں، ہفتہ کے دنوں، نصابِ زکوٰۃ اور کفارات کے عدد، نماز کی رکعات کے عدد بلکہ پانچ وقتہ نماز کا عدد بھی اسی باب سے ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (تفسیر عزیزی)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تیرے رب کے لشکروں کی گنتی اور ان کی صحیح تعداد اور ان کی کثرت کا کسی کو علم نہیں وہی خوب جانتا ہے یہ نہ سمجھ لینا کہ بس انیس ہی ہیں، جیسے یونانی فلسفیوں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے اپنی جہالت وضلالت کی وجہ سے سمجھ لیا کہ اس سے مراد عقول عشرہ اور نفوس تسعہ ہیں حالانکہ یہ مجرد ان کا دعویٰ ہے جس پر دلیل قائم کرنے سے وہ بالکل عاجز ہیں افسوس کہ آیت کے اول پر تو ان کی نظریں ہیں لیکن آخری حصہ کے ساتھ وہ کفر کر رہے ہیں جہاں صاف الفاظ موجود ہیں کہ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا پھر صرف انیس کے کیا معنی؟ (ابن کثیر)

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ: بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ مشرکین کی اس بات کا جواب ہے کہ محمد ﷺ کے مددگار بس انیس ہی افراد ہیں، ارشاد فرمایا کہ آپ کے رب کے لشکر تو بہت زیادہ ہیں جنہیں صرف وہی جانتا ہے۔

یہ انیس عدد تو اصل ذمہ دار ہیں اس کے خازن ہیں یعنی بڑے ذمہ دار ہیں اور ان کے اعوان و انصار بہت زیادہ ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن دوزخ کو لایا جائے گا اس وقت اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی، ہر باگ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے۔ (تفسیر انوار البیان)

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس موقع پر خدائی لشکروں کا ذکر فرمایا ہے، فرشتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے احادیث کے حوالے سے اس موقع پر فرشتوں کی کثرت کا ذکر فرمایا ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الحبائک فی اخبار الملائک میں تفصیل سے فرشتوں کے احوال قلم بند فرمائے ہیں۔

وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ: (یعنی دوزخ کا ذکر اور اس کے احوال کا بیان صرف اس لیے ہے کہ انسان نصیحت حاصل کریں اور وہاں کے عذاب سے ڈر کر ایمان لائیں)۔ لوگ ایمان تو لاتے نہیں انکار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مزید کفر میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ منکرین کی بد بختی ہے۔ (انوار البیان)

جہنم کی ہولناکی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ {۳۲} وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ {۳۳} وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ {۳۴} إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ {۳۵} نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ {۳۶} لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ {۳۷} كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ {۳۸} إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ {۳۹} المدثر

جواب ترجمہ: خبر دار! قسم ہے چاند۔ اور رات کی جب وہ منہ پھیر کر جانے لگے۔ اور صبح کی جب اس کا اجالا پھیل جائے۔ کہ یہ بڑی بڑی باتوں میں سے ایک ہے۔ جو تمام انسانوں کو خبر دار کر رہی ہے۔ تم میں سے ہر اس شخص کو جو آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہے۔ ہر شخص اپنے کرتوت کی وجہ سے گروی رکھا ہوا ہے۔ سوائے دائیں ہاتھ والوں کے۔

یہاں جہنم کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ نے اپنے نافرمانوں اور سرکش لوگوں کے لیے پیدا کر دی ہے، اس سے اللہ پاک لوگوں کو ڈراتے ہیں، جو شخص اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے اپنے رب کے قریب آجائے گا وہ اس دوزخ سے بچ جائے گا، اور جو سرکشیوں پر سرکشیاں کرتا جائے گا وہ اس ہولناک، وحشت ناک دوزخ کی سزا بھگتے گا، کافر اور مشرک ہمیشہ اس میں جلتے سڑتے اور سزا پاتے رہیں گے، جب کہ گناہ گار اپنے اپنے گناہوں کی سزا پا کر خلاصی پا جائیں گے اور جنت میں بھیج دیے جائیں گے، کسی کے ساتھ زیادتی اور ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ہر انسان روزانہ اپنی کھلی آنکھوں سے بہت سی ان چیزوں کو دیکھتا ہے جو اس کے ارد گرد ہیں اور ایک خاص وجود رکھتی ہیں مثلاً چاند کبھی گھٹتا ہے کبھی بڑھتا ہے۔ کبھی وہ چودھویں کا مکمل چاند ہوتا ہے کبھی وہ گھٹ کر کھجور کی سوکھی ہوئی شاخ کی طرح باریک ہو جاتا ہے۔ دن اور رات جو باقاعدگی سے آتے اور جاتے ہیں، کبھی روشنی کبھی اندھیرا کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں بڑی۔ (بصیرت قرآن)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان ہی تین چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ جس طرح رات اور دن، چاند (سورج اور ستارے) اپنا ایک وجود رکھتے ہیں اسی طرح جہنم بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے لیکن وہ اتنی ہیبت ناک چیز ہے، جس سے ہر انسان کو پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔

یہ جہنم ان لوگوں کے لئے بنای گئی ہے جو اللہ کے نافرمان ہیں۔ اب جس کا دل چاہے وہ اس سے ڈر کر نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے وہ اس سے پیچھے ہٹ جائے۔ لیکن وہ اس

حقیقت کو اپنے سامنے ضرور رکھے کہ ہر انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کے بدلے میں گروی رکھا ہوا ہے۔

جس طرح کوئی شخص قرض کے بدلے کوئی چیز ضمانت کے طور پر رہن یعنی گروی رکھ دیتا ہے وہ چیز یا قرض دینے والے کے پاس رہتی ہے۔ جب قرض کی رقم ادا کر دی جاتی ہے تو وہ چیز واپس بھی مل جاتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان اپنے اعمال کے بدلے اللہ کے پاس گروی رکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہر انسان کو ذمہ دار بنا کر اس پر کچھ فرائض مقرر کئے ہیں، اگر وہ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کو ادا کر کے اپنا فرض پورا کر دے گا تو وہ اللہ کے عذاب سے بچ جائے گا ورنہ وہ جہنم کی ہولناک آگ اور اپنے برے انجام سے بچ نہ سکے گا۔

لیکن اس اصول سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض اور احکامات کو پورا کرنے والے ہیں، فرمایا کہ یہ لوگ اصحاب الیمین میں سے ہوں گے، یعنی قیامت کے دن ان کے اعمال ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، وہ عرش الٰہی کے سائے میں اور جنت کی راحتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

چاند کے مناظر، رات کے مناظر جب وہ ختم ہوتی ہے اور صبح نمودار ہوتی ہے، یہ زبردست مشاہد اور مناظر ہوتے ہی، یہ آنکھیں کھول دینے والے مناظر ہیں اورانسانی دل و دماغ پر ان کے بیشمار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان ان پر اگر غور کرے تو اس پر کئی راز کھلتے ہیں اور انسانی دل و دماغ پر ان کے بیشمار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان ان پر اگر غور کرے تو اس پر کئی راز کھلتے ہیں، کئی گہرے تصورات انسان کے پردہ خیال پر آتے ہیں اور اسے پختہ شعور ملتا ہے، قرآن کریم انسان کو ان مظاہر کی طرف متوجہ کر کے انسان کے دل میں ان تصورات کو بٹھاتا ہے۔ اور ان احساسات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

جب چاند طلوع ہوتا ہے، فضائے کائنات میں چلتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے، اگر انسان اس پر غور کرے تو وہ انسان کے کان میں اس کائنات کے کچھ نہ کچھ راز ضرور ڈال دیتا ہے اور بعض اوقات تو چاند کی روشنی میں کھڑے ہو کر غور و فکر کرنے سے انسان پر یہ اثر ہوتا ہے کہ گویا اس نے نور کا غسل کر لیا ہے۔ اور رات کے جانے کا منظر بھی عجیب ہوتا ہے، صبح کی نمود اری کے وقت اور سورج کے طلوع سے پہلے کے ان پر سکون لمحات میں، اگر انسان چشم بینا سے دیکھے تو اس کو نظر آتا ہے کہ ایک شعوری ارادہ اور دست قدرت کا ایک صورت حال کو ہٹا کر دوسری حالت کو بڑھا دیا ہے، اس منظر میں جس طرح دنیا آہستہ آہستہ منور ہوتی ہے، قلب بینا بھی منور ہوتا چلا جاتا ہے، غرض صرف چشم بینا کی ضرورت ہے اور احساس و شعور کی۔ (فی ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ انسانی قلب و نظر کا خالق ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ مناظر انسانی احساسات پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ از سر نو پیدا کر دیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ یہ دیکھ رہا ہے۔

اور ان مؤثرات، اشراقات اور تاثرات کے استقبال کے پیچھے، شمس و قمر اور لیل و نہار اور نمود اری صبح میں ایک دوسری عظیم حقیقت بھی پوشیدہ ہے جس کی طرف قرآن انسان کو متوجہ کر رہا ہے، انسانی قلب و نظر کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ ان مظاہر میں اللہ کی قدرت تخلیق، اللہ کی حکمت تدبیر اور اس کائنات کے زبردست نظم و نسق کے نشانات ہیں اور یہ کہ یہ کائنات اس قدر دقیق اور پیچیدہ نظم کے ساتھ چل رہی ہے کہ اسے دیکھ کر انسانی عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

ان عظیم کائناتی حقائق کے ساتھ قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہے کہ اللہ کی عظیم قدروں کو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو، اور ان کے اندر جو آثار و نشانات ہیں ان سے عبرت لو، یہ کہ جہنم اور اس کے اوپر متعین افواج الٰہیہ اور آخرت اور اس کی ہولناکیاں دراصل ان

عظیم امور میں سے ہیں جو عجیب بھی ہیں اور خوفناک بھی ہیں اور یہ واقعات نہایت ہی پر خطر ہیں، انہیں سنجیدگی سے لو۔ (فی ظلال القرآن)

دوزخی دوزخ میں کیوں ڈالے جائیں گے؟

سوال جنت والے دوزخ والوں سے پوچھیں گے کہ آپ لوگ دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ہو؟ تو ان کے سوال پر دوزخ والے جنتیوں کو کیا جواب دیں گے؟ کہ ہم کیوں دوزخ میں ڈالے گئے۔ آیات ذیل کی روشنی میں واضح کیجیے۔

اِلَّآ اَصۡحٰبَ الۡیَمِیۡنِ {۳۹}فِیۡ جَنّٰتٍ ؕ یَتَسَآءَلُوۡنَ {۴۰}عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ {۴۱}مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ {۴۲}قَالُوۡا لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ {۴۳}وَلَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ {۴۴}وَ کُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ {۴۵}وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ {۴۶}حَتّٰۤی اَتٰىنَا الۡیَقِیۡنُ {۴۷} المدثر.

جواب ترجمہ: سوائے دائیں ہاتھ والوں کے کہ وہ جنتوں میں ہوں گے۔ وہ پوچھ رہے ہوں گے۔ مجرموں کے بارے میں۔ کہ: تمہیں کس چیز نے دوزخ میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے کہ: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اور جو لوگ بے ہودہ باتوں میں گھستے، ہم بھی ان کے ساتھ گھس جایا کرتے تھے۔ اور ہم روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ یقینی بات ہمارے پاس آ ہی گئی۔

قرآن کریم میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنتیوں کے سوال کے جواب میں مجرم دوزخی کہیں گے کہ ہم جن وجوہات کی بناء پر دوزخ میں ڈالے گئے وہ کچھ یوں ہیں، دوزخی کہیں گے کہ

① ہم دنیا میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔

② ہم صدقہ خیرات نہیں کرتے تھے، فقیروں مسکینوں کو کھلاتے پلاتے نہیں تھے۔

③ ہم باطل والے اہل غوایت اور اہل ضلالت کے ساتھ مل کر دین کو جھٹلاتے تھے،

④ ہم روز حساب و جزا کو جھٹلایا کرتے تھے، اس لیے ہمیں آج اس ہولناک، وحشت ناک، انگ انگ کو جلا دینے والی آگ میں ڈالا گیا ہے۔

اصحاب الیمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن ان کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ میدان محشر میں لوگوں کو اپنا نامہ اعمال دکھاتے پھریں گے اور کہیں گے یہ ہے ہمارا نامہ اعمال اسے ذرا پڑھو، ان لوگوں کو قرآن کریم نے کامیاب قرار دیا ہے، یہ جنت میں جائیں گے، یہی لوگ دوزخ والوں سے ان کے دوزخ میں جانے کا سبب پوچھیں گے، جس پر دوزخ والے اپنے سیاہ کرتوتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے صاف صاف بتادیں گے کہ ہمیں ان جرائم کی پاداش میں ہولناک دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔

سورۃ المدثر کی آیت ۴۵ پر مولانا مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں ”اس سے مراد کافروں کے وہ سردار ہیں جو اسلام اور قرآن کا مذاق اڑانے کے لیے محفلیں سجایا کرتے تھے، اور بے ہودہ مذاق سے حق کی تردید کیا کرتے تھے۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ عام ہیں جو ہر قسم کی بے ہودہ گفتگو اور بے ہودہ مشغلوں کو شامل ہیں، جو آخرت میں انسان کے لیے مصیبت کا سبب بنیں گے۔ (آسان ترجمہ)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ یہاں لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال میں قیامت کے دن جکڑا ہوا ہو گا لیکن جن کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ آیا وہ جنت کے بالا خانوں میں چین سے بیٹھے ہوئے جہنمیوں کو بدترین عذابوں میں دیکھ کر ان سے پوچھیں گے کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نے نہ تو رب کی عبادت کی نہ مخلوق کے ساتھ احسان کیا بغیر علم کے جو زبان پر آیا بکتے رہے جہاں کسی کو اعتراض کرتے سنا ہم بھی ساتھ ہو گئے اور باتیں بنانے لگ گئے اور قیامت کے دن کی تکذیب ہی کرتے رہے یہاں تک کہ موت آگئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

سورۃ المدثر میں یہاں یقین کا لفظ آیا ہے، اس کا معنیٰ موت ہے، دوسرے مقام پر سورۃ الحجر میں بھی یقین بمعنیٰ موت آیا ہے، ارشاد ہے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر :۹۹) یعنی موت کے وقت تک اللہ کی عبادت میں لگا رہ۔

کافروں، مشرکوں کو سفارش کام نہیں آئے گی

سوال اس آیت کا ترجمہ کریں نیز بتائیں کہ یہاں شافعین سے کیا مراد ہے؟ یہ کون لوگ ہوں گے؟

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ {۴۸} المدثر.

جواب ترجمہ: سو ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کام نہ دے گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو کسی کی سفارش اور شفاعت نفع نہ دے گی اس لئے کہ شفاعت وہاں نافع ہوتی ہے جہاں محل شفاعت ہو لیکن جن کا دم ہی کفر پر نکلا ہو ان کے لئے شفاعت کہاں؟ وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں گئے۔

عبد الرحمن بن میمون رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت کعب رحمہ اللہ ایک دن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا مجھ سے بیان کیجیے کہ جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش قیامت کے دن ختم ہو جائے گی۔

کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خبر دی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ سے لے کر اَلْيَقِيْن تک کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے یہاں تک کہ ان تک پہنچ جائیں گے، جنہوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی اور نہ کبھی کسی مسکین کو کھانا کھلایا اور نہ ہی قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لایا، جب ان لوگوں کو شفاعت پہنچے گی تو کوئی باقی نہیں رہے گا جس میں خیر اور نیکی ہو۔ (ابن مردویہ، تفسیر در منثور)

صہیب الفقیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم مکہ میں تھے اور میرے ساتھ طلق بن حبیب رحمہ اللہ تھے ہم خوارج کی رائے رکھتے تھے اور ہم تک یہ خبر پہنچی کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ شفاعت کے بارے میں کچھ

فرماتے ہیں۔ ہم ان کے پاس آئے اور ہم نے ان سے کہا ہم کو آپ کی طرف سے یہ خبر پہنچی ہے کہ شفاعت کے بارے میں آپ کا نظریہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے خلاف ہے جو اللہ کی کتاب میں ہے۔

انہوں نے ہمارے چہروں کی طرد یکھا اور فرمایا تم اہل عراق میں سے ہو؟ ہم نے کہا ہاں، تو وہ مسکرائے اور فرمایا تم نے اللہ کی کتاب میں کہاں دیکھا؟ میں نے کہا جہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں رَبَّنَا اِنَّكَ مَن تُدخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخزَيتَهٗ (آل عمران ۱۹۲) اے ہمارے رب! جس کو آپ نے دوزخ میں داخل فرمادیں تو یقینی طور پر آپ نے اس کو رسوا کر دیا۔ يُرِيدُونَ اَن يَّخرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنهَا (المائدہ ۳۷) اور دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں حالانکہ وہ اس میں سے نکلنے والے نہیں۔ كُلَّمَا اَرَادُوا اَن يَّخرُجُوا مِنهَا اُعِيدُوا فِيهَا (السجدہ ۲۰) اور جب وہ اس میں سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو اس میں دوبارہ لوٹا دیئے جائیں گے۔

اور قرآن میں ان جیسی اور آیات بھی ہیں، یہ سن کر حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم اللہ کی کتاب کو زیادہ جانتے ہو یا میں جانتا ہوں؟ ہم نے کہا بلکہ آپ ہی زیادہ جانتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم! میں اس کے نازل ہونے کے وقت حاضر تھا رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں۔ اور شفاعۃ الشافعین کے نزول کے وقت میں بھی موجود تھا اور البتہ یقینی طور پر میں نے اس کی تاویل کو رسول اللہ ﷺ سے سنا، بلاشبہ شفاعت اس کے نبی کے لیے ہے اللہ کی کتاب میں۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں فرمایا جو سورۃ مدثر میں ذکر کی گئی، یعنی مَا سَلَكَكُم فِي سَقَرَ قَالُوا لَم نَكُ مِنَ المُصَلِّينَ، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ شفاعت حلال کی گئی ہے، اس شخص کے لیے جو اس حال میں مرے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور اس پر کسی سے مدد نہیں لی اور اس بارے میں نہ کسی سے مشورہ فرمایا، سو جس کو چاہیں گے اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائیں گے اور جس کو چاہیں گے دوزخ میں داخل کریں گے۔

پھر بلاشبہ اللہ تعالیٰ توحید والوں پر مہربانی فرمائیں گے اور ایک فرشتے کو اپنے پاس سے پانی اور روشنی دے کر بھیجیں گے وہ جہنم میں داخل ہو گا اور وہ پانی کو چھڑکے گا وہ پانی نہیں پہنچے گا مگر اس کو جس کو اللہ چاہیں گے اور نہیں پہنچے گا مگر جو دنیا سے اس حال میں نکلا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو وہ ان کو نکالے گا یہاں تک کہ ان کو جنت کے قریب سرزمین میں ڈال دے گا۔

پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے پانی اور روشنی کو اور زیادہ کر دیں گے، پھر وہ داخل ہو گا اور پانی کو چھڑکے گا، یہ پانی کا چھڑکاؤ اسے پہنچے گا جس کو اللہ چاہیں گے، پھر وہ اس شخص کو پہنچے گا جو دنیا سے اس حال میں نکلا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو پھر وہ ان لوگوں کو نکالے گا اور جنت کے قریب میں ڈال دے گا، پھر اللہ تعالیٰ شفاعت کرنے والوں کو اجازت فرمائیں گے، وہ لوگ ان کے لیے شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرمائیں گے اپنی رحمت سے اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے۔ (ابن مردویہ، تفسیر در منثور)

عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں میں سے ایک قوم کو عذاب دیں گے، پھر ان کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے جہنم سے نکالیں گے، یہاں تک کہ کوئی باقی نہیں رہے گا سوائے ان لوگو کے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ سے لے کر آیت شفاعۃ الشافعین تک۔ (بیہقی کتاب البعث، تفسیر در منثور)

عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری سفارش سے ضرور نکلتے رہیں گے، ایمان والے دوزخ میں سے یہاں تک کہ اس میں کوئی باقی نہ رہے گا، سوائے ان کے جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ سے لے کر آیت شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ تک ہے۔ (ابن مردویہ، در منثور)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ گناہ گاروں کے حق میں شفاعت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل توحید میں سے کچھ لوگوں کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے

گا پھر ان کی شفاعت کی جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے مؤحد ہونے اور شفاعت کی وجہ سے ان پر رحم فرمائے گا اور انہیں جہنم سے نکال دے گا۔

کفار کا کوئی شفیع نہیں ہو گا، جو ان کے بارے میں شفاعت کرے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا، تمہارے نبی چار میں سے چوتھے نمبر پر شفاعت کریں گے، حضرت جبریل امین علیہ السلام پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پھر ملائکہ، پھر انبیاء، پھر صدیق پھر شہداء۔

ایک قوم جہنم میں رہ جائے گی تو انہیں کہا جائے گا تمہیں کس چیز نے جہنم میں داخل کیا؟ تو وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا، یہی لوگ جہنم میں رہ جائیں گے۔ (قرطبی)

قیامت کے دن اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا، جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت دی جائے گی وہی سفارش قبول ہو گی، سفارش کرنے والوں میں قرآن کریم، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، فرشتے اور اللہ کے نیک بندے شامل ہوں گے۔

رُوگردانی کرنے والے جنگلی گدھے ہیں

سوال کافروں نے قرآن کریم جیسی عظیم الشان، مہتم بالشان، عرش الٰہی کے آخری پیغام سے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنگلی گدھوں سے تشبیہ دی جو شیروں کی دھاڑ سے بھاگ رہے ہوں، اس کا تذکرہ کیجیے۔ اس آیت کی تفسیر میں وضاحت فرمائیے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ {۴۹} كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ {۵۰} فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ {۵۱} المدثر.

جواب ترجمہ: اب ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت کی بات سے منہ موڑے ہوئے ہیں؟ اس طرح جیسے وہ جنگلی گدھے ہوں۔ جو کسی شیر سے (ڈر کر) بھاگ پڑے ہوں۔

جنگلی گدھے بہت ہی ڈرپوک ہوتے ہیں، جب یہ شیر کی دھاڑ کی آواز سنتے ہیں تو یہ جدھر منہ ہوتا ہے ادھر بھاگ جاتے ہیں، عرب اس قسم کے مناظر سے واقف تھے، جب انسانوں کو ان خوفزدہ گدھوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، تو یہ منظر نہایت ہی مضحکہ خیز ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اور نصیحت سے ان کی نفرت اور فرار انہیں انسانوں کی بجائے گدھے بنا دیتا ہے، اس لئے نہیں کہ انہیں کوئی خوف درپیش ہے بلکہ اس لئے کہ ایک یاددہانی کرانے والا ان کو اپنے رب کی طرف بلا رہا ہے اور انہیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے کہ یہ لوگ اس خوفناک انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دست قدرت کی محیر العقول عکاسی ہے جس نے اس تشبیہ کو یوں ریکارڈ کیا تاکہ قیامت تک لوگ اسے پڑھتے رہیں اور ان لوگوں کا رویہ قابل نفرت نظر آتا رہے اور لوگ ایسے رویئے سے بچتے رہیں اور جن لوگوں نے یہ رویہ اختیار کیا وہ شرمساری سے منہ چھپاتے پھریں۔

کافروں کی حاسدانہ چاہت

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً {۵۲} المدثر

جواب **ترجمہ:** بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیئے جائیں۔

یعنی انہیں کھلی کتاب دی جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا، اے محمد ﷺ ہم میں سے ہر ایک کے پاس رب العالمین کی جانب سے ایک مکتوب لے آ جس میں یہ لکھا ہوا ہے، میں نے حضرت محمد ﷺ کو تمہاری طرف بھیجا ہے، اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے، وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ (الاسراء ۹۳) ہم تیرے آسمان پر جانے کو تسلیم نہیں کریں گے یہاں تک کہ تو ہم پر کتاب نازل کرے جسے ہم پڑھیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ کہا کرتے تھے اگر محمد سچے ہیں تو وہ صبح کے وقتہم میں سے ہر کسی کے پاس ایک صحیفہ لے آئیں جس میں اس کے جہنم سے بری ہونے اور اس سے محفوظ ہونے کا

ذکر ہو۔ مطر وراق رحمہ اللہ نے کہا، انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ انہیں بغیر عمل کے یہ چیز دے دی جائے۔ کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مشرکوں نے کہا، ہمیں یہ خبر پہنچی ہے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے پاس صبح کے وقت اس کے سرہانے اس کا گناہ اور کفارہ لکھا ہوتا تھا ہمارے پاس اس کی مثل لاؤ۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، انہوں نے ارادہ کیا ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک کتاب ہو جس میں یہ تحریر ہو فلاں بن فلاں، کے نام خط ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے معنی یہ ہے اس کا ذکر جمیل کیا جائے، تو یہاں صحیفے ذکر جمیل کی جگہ مجازاً رکھے گئے انہوں نے کہا، جب انسان کے گناہ اس پر لکھے جاتے ہیں تو کیا وجہ ہے ہم اسے نہیں دیکھتے۔ (تفسیر قرطبی)

کافروں کی چاہت یہ تھی کہ انہیں اللہ کھلے صحیفے عطا کریں، سلاطین و بادشاہوں کی چھٹیوں اور خطوط کی طرح سر بمہر نہ ہوں، تہہ در تہہ لفافوں میں لکھی ہوئے نہ ہوں، کیونکہ تہوں میں لپٹی ہوئی تحریریں کوئی باعث افتخار واعزاز نہیں ہوا کرتیں، جب کہ کھلی تحریریں، کھلی چٹھیاں باعث عزت ہوتی ہیں، ان سے آدمی کی شان و شوکت میں اضافہ ہوتا ہے، بقول شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ ان کی یہ درخواست بالکل دیہات کے مزارعین اور کسانوں کی درخواست کی مانند ہے کہ ہر ایک اپنے نام بادشاہ کا حکم صوبے دار اور فوج دار کے واسطے کے بغیر چاہے اور کہے کہ جب تک ہم میں سے ہر ایک کے نام معتبر ایلچیوں کے ذریعے فرمان شاہی صادر نہ ہو ہم اس صوبے دار اور فوج دار کی اطاعت نہیں کرتے اور ہم اس کے پاس حاضر نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کی بات سنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ایسی خواہش اور تمنا رکھنے سے روک دیا کہ وہ اس طرح کی خواہش ایسے موقع پر نہ رکھیں کہ آفتوں اور مصیبتوں سے بچنے اور جان بچانے کی فکر کے مقام پر کبر و نخوت، غرور و تکبر، سرکشی اور عناد سے کام نہیں لینا چاہیے۔

کفار کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ {۵۳} كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ {۵۴} فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ {۵۵} وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ {۵۶} المدثر

جواب ترجمہ: ہر گز نہیں! بات اصل میں یہ ہے کہ ان کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔ ہر گز نہیں! یہ (قرآن ہی) ایک نصیحت ہے۔ اب جو چاہے، اس سے نصیحت حاصل کرلے۔ اور یہ لوگ نصیحت حاصل کریں گے نہیں، الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہی اس بات کا اہل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ لوگوں کی مغفرت کرے۔

یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے مطالبے پورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنادیا ہے، یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنی سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کو دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ لازماً دنیا میں اچھا ہی نکلتا ہو اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور برا ہی نکلا کرتا ہو، اس لیے یہ اس مسئلے پر غور کرنا لاحاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا۔

یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابل غور اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازماً اچھا اور باطل کا انجام لازماً برا ہوگا، ایسا شخص تو ان معقول دلائل اور ان پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے، لیکن

آخرت کا منکر جو سرے سے تلاش حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے، وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانا ڈھونڈ نکالے گا۔

یہی بات ہے جو سورۃ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ اے نبی، اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ (الانعام، ۷) (تفسیر تفہیم القرآن)

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ: یہ قرآن جس کے سننے سے یہ لوگ منہ موڑ رہے ہیں اور اس طرح بھاگ رہے ہیں جس طرح جنگلی گدھے بھاگتے ہیں۔ جبکہ ان کے دل حسد اور لالچ سے بھرے ہیں۔ اور آخرت کے بارے میں یہ لوگ لاپرواہ ہیں۔ یہ تو ایک تذکرہ اور تنبیہ اور نصیحت ہے، جو چاہے یہ نصیحت حاصل کرے، جو نہ چاہے نہ کرے، نفع نقصان ہر کسی کا اپنا ہے، جو چاہے عزت اور جنت حاصل کرے اور جو چاہے ذلت اور جہنم حاصل کرے۔ (قرطبی)

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نصیحت ہمارے غیر پر اتری ہوئی ہے بلکہ انہ تذکرہ تحقیق یہ قرآن پاک کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ اس کی جاگیر ہو، نصیحت ہر کسی کا حق عام ہے جو ڈرے اسی کے لیے ہے، اس لیے کہ بشری تصنیف نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے جو کہ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اتارا ہے، حضرت رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام اور جبریل علیہ السلام، قاری حضرات اور اساتذہ ایک واسطہ ہیں، پس وہ حق کی ایک یادداشت ہے جو ایک شہر کے مقرر جج کو لکھ کر دی گئی تاکہ حال اور مستقبل جس جج کے پاس پہنچے اس پر عمل کرے۔ (عزیزی)

فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں " یعنی (یہ کتاب) ایک پر اتری تو کیا ہوا، کام تو سب کے آتی ہے " اور اللہ کا چاہنا نہ چاہنا سب حکمتوں پر مبنی ہے، جن کا احاطہ کوئی بشر نہیں کر سکتا۔ وہی ہر شخص کی استعداد و لیاقت کو کماحقہ، جانتا ہے اور اس کے موافق معاملہ کرتا ہے۔ (گلدستہ تفاسیر)

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پس جو چاہے اس قرآن کو یاد کرے اور اس میں غور و فکر کرے اور اس پر عمل کرے وماید کروں اور وہ اس قدر گنجائش دینے اور واضح فہمائش کے باوجود اس قرآن کو یاد نہیں کرتے۔ (تفسیر عزیزی)

إِلَّا أَنْ يَشَآءَ اللّٰهُ: حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں مگر تاوقتیکہ خدا تعالیٰ چاہے گا، حاصل کلام یہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگ بہت سی جنگوں اور لڑائیوں، بے شمار جھگڑوں، قرآن پاک کے اوامر ونواہی کی مخالفت میں رسوائی اور ذلت لاحق ہونے، قبیلوں اور قریبیوں کے ہلاک ہونے اور اس نعمت عظمیٰ اور عطیہ کبریٰ کی ناشکری کی نحوست کی وجہ سے مال اور مرتبے کے نقصان کے بعد اسے سمجھ لیں گے اور اسے یاد کریں گے اور اس کی نصیحت سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان سے اس وقت بھی یہ نصیحت حاصل کرنا اور قرآن پاک یاد کرنا قبول فرمالے گا اور انہیں ہدایت اور معافی عطا فرمائے گا اس لیے کہ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى اور اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ، وہی لائق تقویٰ ہے کہ اس سے ڈرنا چاہیے، اور وہی ہے بخشش اور کرم کے لائق کہ اگرچہ آدمی بے شمار گناہوں اور بے پناہ مخالفتوں کے بعد تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اس کے سارے گناہ بخش دیتا ہے اور معافی عطا فرماتا ہے اور یہ اس کے لطف ورحمت کے کمال کی وجہ سے ہے۔

اس کائنات میں جو چیز بھی واقع ہوتی ہے اللہ کے عظیم تر نظام مشیت میں بندھی ہوتی ہے، اللہ کے ارادے اور مشیت ہی کے رخ پر اور اس کے وسیع دائرے کے اندر واقعات چلتے ہیں، لہٰذا کسی انسان سے کوئی فعل اللہ کی مشیت کے بغیر سرزد نہیں ہو سکتا، زمین کی تمام قدروں کی مشیت الٰہیہ اپنے دائرے کے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے، کیونکہ تمام قدریں اللہ کی مشیت کی پیدا کردہ ہیں اور انسان اور نوامیس فطرت اللہ کے پیدا کردہ ہیں، اس کائنات میں جو واقعات چلتے ہیں وہ مشیت الٰہیہ کی ریل کے اندر ہی چلتے ہیں جس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے، اس ریل کے اندر ہر انسان آزاد بھی ہے اور بند بھی۔

تذکر اور نصیحت آموزی تو اللہ کی توفیق کے مطابق ہوتی ہے، اللہ جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے، دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں، اللہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے، اگر اللہ جان لے کہ یہ شخص اچھی نیت کا مالک ہے تو اللہ اسے اچھائی کی طرف پھیر دیتا ہے۔

لیکن انسان کو کوئی پتہ نہیں ہے کہ اللہ کیا چاہتا ہے؟ اللہ کی چاہت تو پردہ غیب میں ہے، البتہ اس کو یہ معلوم ہے کہ اللہ کی رضا کیا ہے؟ کس میں ہے؟ اور یہ بات اللہ نے قرآن میں بتادی ہے کہ اللہ کی رضا کس میں ہے؟ جب انسان اللہ کی مرضی کے راستے کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اسے مزید آگے بڑھنے کی توفیق دیتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ ایک مومن کے احساس کے اندر جس چیز کو اچھی طرح بٹھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور یہ کہ اللہ کی مشیت اسے گھیرے ہوئے ہے، تاکہ ایک مخلص بندے کی تمام تر توجہ اللہ کی ذات پر مرکوز رہے اور ایک مسلم پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے رکھے، یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے ذہن نشین کئے بغیر اسلام کسی انسان کے دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا اور جب یہ کیفیت ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور انسانی قلب و نظر اس میں سرشار ہو جائیں اور انسان زندگی کے تمام واقعات اور حادثات کی تعبیر اس تصور کے مطابق کرنے لگے تو وہ صحیح طرح مسلم ہوتا ہے، یہی مقصد ہے اللہ کی مشیت کے بے قید ہونے کا اور اللہ کی مشیت کا یہ اطلاق قرآن میں ہر فیصلے کے ساتھ لایا جاتا ہے، چاہے جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو، چاہے کسی شخص کی ہدایت وضلالت کا فیصلہ ہو۔

رہا وہ تاریخی اور کلامی مجادلہ و مباحثہ جو انسان کے جبر واختیار کے بارے میں چلا، تو وہ پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا، وہ دراصل کلی حقیقت کے ایک جزء کو لیتا ہے اور اس کیوجہ سے فکر انسانی کسی تشفی بخش قول تک کبھی نہیں پہنچ سکا، کیونکہ یہ مباحثہ و مجادلہ قرآن کی صحیح اور سادہ راہوں سے ہٹ کر نہایت ہی پیچیدہ راہوں پر جا نکلا اور جس قدر یہ مباحثہ آگے بڑھا، فکر انسانی کی تگ و تاز کی راہیں تنگ ہوتی رہیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

سید طنطاوی سورۃ المدثر کی آخری آیت پر اختتامی کلمات میں لکھتے ہیں وہی ذات اس بات کی سب سے زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈراجائے اوراس کے عذاب سے خوف رکھاجائے اوروہ ذات تنہا اپنے بندوں کے گناہوں کو بخشنے والی ہے، اللہ تعالیٰ سے اس کے کاموں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیاجاسکتا، جب کہ بندوں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال ہو گا۔

اس آیت کریمہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا اوران سے متاثر ہونا تب ہی ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ خود ارادہ فرمائے اور چاہے کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے اور یہ کہ بندوں کی مشیت (ارادہ) اس وقت تک مؤثر نہیں ہوتی، جب تک وہ اللہ کی مشیت کے موافق نہ ہو اور اللہ کی مشیت کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ میں اس بات کا اہل ہوں کہ مجھ سے ڈراجائے، اس لیے میرے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنایاجائے، پس جس نے مجھ سے ڈرا اور میرے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہرایا تو میں اس بات کا اہل ہوں کہ اسے بخش دوں۔ (التفسیر الوسیط)

بفضل اللہ وبعون وبنصرۃ اللہ آج سورۃ المدثر اختتام پذیر ہوئی، اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ عالی میں قبول ومنظور فرما کر میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ، میرے مشائخ، میرے معاونین مساعدین سب کے لیے صدقہ جاریہ اور نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

حال وارد حدوٹ، مری

۱۵ جون ۲۰۱۹ء ۱۱ شوال المکرم ۱۴۴۰ھ بروز ہفتہ قبیل صلاۃ الظہر

حروف بینی: ۶ اگست ۲۰۱۹ء حال وارد حدوٹ مری

☆☆☆☆

القیامہ

قسم اور جواب قسم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں قسم کیوں کھائی اور کس چیز پر قسم کھائی؟

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ{۱}وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ {۲}اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ{۳}بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ{۴}القیامۃ.

جواب ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ (کہ ہم انسان کو ضرور دوبارہ زندہ کریں گے) کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ جبکہ ہمیں اس پر بھی قدرت ہے کہ اس کی انگلیوں کے پور پور کو ٹھیک ٹھیک بنادیں۔

مشرکین وقوعِ قیامت کا انکار کرتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ مردہ ہڈیوں میں جان کیسے پڑے گی؟ اور ہڈیاں کیسے جمع کی جائیں گی۔

عدی بن ربیعہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے محمد! حَدِّثْنِي عَنْ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَتَى تَكُونُ، وَكَيْفَ أَمْرُهَا وَحَالُهَا؟ فَأَخْبَرَهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ، فَقَالَ: لَوْ عَايَنْتُ ذَلِكَ الْيَوْمَ لَمْ أُصَدِّقْكَ يَا مُحَمَّدُ وَلَمْ أؤمن به، أَو يَجْمَعُ اللهُ الْعِظَامَ؟ مجھے بتا دیجئے قیامت کب ہو گی کیسے ہو گی کیا کیا احوال گزریں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے اسے قیامت کا حال بتادیا وہ سن کر کہنے لگا کہ اگر میں اس دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تب بھی تمہاری تصدیق نہ کروں گا اور تم پر ایمان نہ لاؤں گا مگر اس صورت میں کہ اللہ ہڈیوں کو جمع فرمادے۔ (تفسیر انوار البیان، تفسیر خازن، قرطبی)

مصنف تفسیر خازن علامہ خازن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عدی بن ربیعہ بنی زہرہ کا حلیف تھا، اخنس بن شریق ثقفی کا داماد تھا، نبی کریم ﷺ کا پڑوسی تھا، نبی کریم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اکْفِنِی جَارَیِ السُّوءِ عَدِیَّ بْنَ رَبِیعَۃَ، وَالْأَخْنَسَ بْنَ شَرِیقٍ، اے اللہ! میری میرے برے پڑوسی سے کفایت فرما، یعنی عدی سے، اور اخنس بن شریق سے، اسی عدی بن ربیعہ کا یہاں ذکر ہے، جس نے نبی کریم ﷺ کے پاس آکر وہ شر انگیز گفتگو کی تھی جس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔

اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ابو جہل نے انکار کے طور پر یوں کہا تھا کہ کیا محمد یہ خیال کرتے ہیں کہ ہڈیاں جب گل جائیں گی تو اللہ تعالیٰ ان کو جمع فرمادے گا؟ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی تردید فرمائی اور قیامت کے دن کی اور ایسے نفس کی قسم کھائی جو اپنے اوپر ملامت کرے یعنی گناہ ہو جانے پر نادم ہو اور نیکی کر کے بھی اپنے نفس پر ملامت کرے کہ اس میں اخلاص کی یا فلاں فلاں آداب کی کمی رہ گئی، جواب قسم لتبعثن محذوف ہے یعنی قیامت کے دن کی اور نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم قیامت کے دن ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے۔ (انوار البیان، تفسیر قرطبی)

سورۃ القیامہ کی آیت ۴ میں فرمایا جارہا ہے کہ ہڈیوں کو جمع کر لینا تو بہت معمولی بات ہے، اللہ تعالیٰ تو انسان کی انگلیوں کے ایک ایک پورے کو دوبارہ ٹھیک ٹھیک اسی طرح دوبارہ بنانے پر قادر ہیں، جیسے وہ شروع میں تھے، انگلیوں کے پورے کا خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان پوروں میں جو باریک باریک لکیریں ہوتی ہیں، وہ ہر انسان کی دوسرے سے الگ ہوتی ہیں، اسی وجہ سے دنیا میں دستخط کے بجائے انگوٹھے کے نشان کو استعمال کیا جاتا ہے، ان لکیروں میں اتنا باریک باریک فرق ہوتا ہے کہ اربوں پدموں انسانوں کی انگلیوں کے اس فرق کو یاد رکھ کر پھر دوبارہ ویسی ہی لکیریں بنادینا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہے۔ (آسان ترجمہ)

لَآ اُقْسِمُ: قسم سے پہلے جب اس طرح ' لا ' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لئے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لئے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے اس

کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اس طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔

آپ جس کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں نہیں خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے موقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ (تدبر قرآن)

ہر زبان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں ضابطے ہوتے ہیں عربی کا ضابطہ ہے کہ قسم ہو یا لفظ قسم ہو اس سے پہلے لا کا لفظ آجائے گا، یا ما کا لفظ آجائے تو یہ زائدہ ہوتے ہیں، ان کا معنٰی نہیں ہوتا، لا اقسم، کا یہ معنٰی نہیں ہے کہ میں قسم نہیں اٹھاتا، لا کا معنی نہیں ہوگا، (یہ زائدہ ہے) اور لا اقسم کا معنی ہوگا میں قسم اٹھاتا ہوں بیوم القیامہ، قیامت کے دن کی۔ (ذخیرۃ الجنان)

ابولیث سمرقندی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ مفسرین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ لا اقسم، کا معنی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں انہوں نے لا کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے بعض نے کہا، لا زِینت کے لیے کلام میں زائدہ ہے کلام عرب میں لا زائدہ استعمال ہوتا ہے۔

یہاں قسم سے پہلے حرف لا زائد ہے، جب قسم کسی مخالف کی بات رد کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے تو اس کے شروع میں صرف لا اس شخص کے خیال باطل کی نفی کے لئے زائد استعمال ہوتا ہے اور محاورات عرب میں یہ استعمال معروف و مشہور ہے، ہماری زبان میں بھی بعض اوقات کسی قابل تاکید مضمون کے بیان سے پہلے کہا جاتا ہے، نہیں آگے اپنا مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

لَآ أُقۡسِمُ بِيَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِ: اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ " لا اقسم " میں " لا " زائدہ ہے یا نفی کے معنٰی میں ہے، اکثر مفسرین کا مختار یہ ہے کہ یہ " لا " زائدہ ہے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ

قرآن مجید میں کوئی لفظ زائد اور بے معنیٰ نہیں ہو سکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ بے معنیٰ نہیں ہے، البتہ یہ نفی کے معنی میں نہیں ہے، اس کو کلام میں قسم سے پہلے زِینت کے لیے ذکر کیا جاتا ہے، اور کلام عرب میں اسی طرح ہوتا ہے اور قرآن مجید لغت عرب اور اسلوب عرب پر نازل ہوا ہے اور قرآن مجید میں اس کی بہت نظائر ہیں۔ (تبیان القرآن)

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگرد علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے قرآن کریم میں کھائی جانے والی قسموں سے متعلق ایک مستقل کتاب "التبیان" تحریر فرمائی ہے، جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے، جس میں انہوں نے ان قسموں پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کے چوتھے حصہ میں قرآن کریم میں کھائی جانے والی قسموں کے بارے میں بالاختصار لکھا ہے اور الاتقان کے آغاز میں ہی علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ابن قیم جوزی کی کتاب التبیان کا تذکرہ فرمایا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قسم کھانے سے مقصد تحقیقی خبر کی تاکید ہوتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے کہ {وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ} اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافقین جھوٹے ہیں۔ یہ قسم ہے اگرچہ اس میں گواہی کی خبر دی جارہی ہے، اس لیے کہ جب خبر کی تاکید کی جاتی ہے تو اسی کا نام قسم رکھا جاتا ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے کا مقصد کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے لیے قسم کھاتا ہے تو پھر تو قسم کھانے کا کوئی مقصد ہی نہیں بنتا اس لیے کہ اہل ایمان تو اطلاع دینے، خبر دینے کے ساتھ ہی تصدیق کر لیتے ہیں، جب کہ کافر کے لیے قسم کھانا کوئی فائدہ مند نہیں ہے، کیونکہ کافر قسم کے باوجود مانتا نہیں ہے۔

علامہ جلال الدین سوطی رحمہ اللہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں چونکہ قرآن کریم عرب کی لغت میں نازل ہوا ہے اور عربوں کی عادت قسم کھانے کی تھی، جب وہ کسی کام کو مؤکد اور پکا

کرتے تو قسم کھاتے تھے۔

علامہ ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کا ذکر کمالِ حجت اور اس کی تاکید کے لیے کیا ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے فیصلہ دو چیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے یا تو گواہی لی جاتی ہے یا پھر قسم اٹھوائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں دونوں قسموں کو ذکر فرمادیا تاکہ ان کافروں کے لیے کسی قسم کی حجت باقی ہی نہ رہے، اس لیے تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا {شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ} اللہ، فرشتوں اور علم والوں نے گواہی دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد فرمایا {قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ} فرمادیجیے! قسم ہے میرے رب کی کہ وہ سچ ہے۔ اور جب بعض دیہاتیوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی سنا {وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ} (آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ چیز جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے، آسمان وزمین کے رب کی قسم بے شک وہ حق ہے) تو چیخ اٹھے اور کہنے لگے کہ جلیل کو کس نے غصہ دلایا کہ وہ قسم کھانے پر اتر آیا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قسم عظمت والے نام کے ساتھ ہی کھائی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی سات مقامات پر قرآن کریم میں قسم کھائی ہے

① {قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ} (یونس ۵۳) کہہ دیجیے: ہاں قسم ہے میرے رب کی، یقیناً یہ (عذاب، قیامت کا وعدہ) بالکل سچا ہے۔

② {قُلْ بَلَى وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ} (التغابن ۷) کہہ دیجیے: کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی، تمہیں ضرور دوبارہ اٹھایا جائے گا۔

③ {فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ} (مریم ۶۸) تو آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور انہیں اور شیطانوں کو (قیامت کے دن) جمع کریں گے۔

④ {فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ} (الحجر ۹۲) تو آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور ان سب سے (ان کے اعمال کے بارے میں) پوچھ کر رہیں گے۔

⑤ {فَلا وَرَبِّكَ لا يُؤْمِنُونَ} (النساء ۶۵) تو نہیں، آپ کے رب کی قسم! یہ ایمان والے نہیں بن سکتے (جب تک اپنے جھگڑوں میں آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔

⑥ {فَلا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ} (المعارج ۴۰) پس نہیں (ایسا نہیں ہے) میں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں، (یعنی جس کے قبضے میں سارے طلوع و غروب ہیں)

⑦ {فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ} (الذاریات ۲۳) پس قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی! یہ (وعدہ) یقیناً بالکل سچ ہے۔

ان سات مقامات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی قسم کھائی ہے وہ مخلوق کی قسم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا {وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ} قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ {وَالصَّافَّاتِ} قسم ہے صف باندھ کر کھڑے ہونے والی (فرشتوں) کی۔ {وَالشَّمْسِ} سورج کی قسم۔ {وَاللَّيْلِ} رات کی قسم {وَالضُّحَى} قسم ہے چاشت کے وقت کی {فَلا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ} پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے (تاروں) کی۔

اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ مخلوق کی قسم کیسے اٹھائی جاسکتی ہے جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں یوں دیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے

① یہاں مضاف محذوف ہے یعنی وَرَبِّ التِّينِ وَرَبِّ الشَّمْسِ، انجیر کے رب کی قسم، سورج کے رب کی قسم)

② چونکہ عرب ان چیزوں کی تعظیم کرتے تھے تو قرآن میں ان چیزوں کی قسم کھا کر وہ چیز بتائی گئی جسے وہ جانتے پہچانتے تھے۔

③ یہ قسمیں ان چیزوں کی ہیں جو مقسِم (قسم کھانے والے) کی عظمت اور اس کی بزرگی پر دلالت کرتی ہیں، قسم کھانے والی ذات ان ساری چیزوں سے اوپر ہے اس ذات سے اوپر کوئی چیز نہیں ہے، اس لیے کبھی اس ذات نے اپنی قسم کھائی اور کبھی اپنی تیار کردہ چیزوں کی قسم کھائی جو اس کے پیدا کرنے اور اس کے بنانے پر دلالت کرتی ہیں۔

⑤ ابن ابی اصبع اپنی کتاب اسرار الفواتح میں فرماتے ہیں کہ مصنوعات (تیار کی ہوئی چیزوں) کی قسم کھانے سے صانع (چیزوں کو تیار کرنے والے) کی قسم کھانا لازم آتا ہے، کیونکہ جب مفعول کا ذکر کیا جائے تو فاعل کا ذکر لازمی ہے، ورنہ فاعل کے بغیر مفعول کا وجود محال ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہیں قسم کھاسکتے ہیں مگر مخلوق کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائے۔

حضرات علماء کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کریم میں قسم کھائی ہے {لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ} یہ قسم اس لیے کھائی تاکہ لوگوں کو آگاہ کیا جائے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کے ہاں مرتبہ، مقام اور شان کیا ہے۔

حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَا خَلَقَ اللهُ وَلَا ذَرَأَ وَلَا بَرَأَ نَفْسًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا سَمِعْتُ اللهَ أَقْسَمَ بِحَيَاةِ أَحَدٍ غَيْرِهِ {ابْنُ مَرْدَوَيْهِ} اللہ نے جو مخلوق بھی پیدا کی اس سب میں سب سے زیادہ اللہ کے ہاں محبوب اور بزرگی والی ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے علاوہ کسی کے بارے میں اللہ کی یہ بات نہیں سنی کہ اس نے کسی کی زندگی میں قسم کھائی ہو۔

حضرت ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں قسم یا تو کسی کی فضیلت کے لیے کھائی جاتی ہے یا کسی منفعت کے لیے کھائی جاتی ہے، فضیلت کے لیے جو قسم کھائی گئی اس کی مثال یہ آیت ہے {وَطُورِ سِينِينَ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ} طور سیناء کی قسم اور اس امانت والے شہر کی قسم۔

اور منفعت کے لیے جو قسم کھائی گئی ہے اس کی مثال یہ آیت ہے {وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ} انجیر اور زیتون کی قسم۔ اہل علم و عرفان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کی قسم کھائی ہے، ایک اپنی ذات کی قسم کھائی جیسے مذکورہ آیات ہیں، اللہ نے اپنے فعل کی قسم کھائی جیسے ارشاد فرمایا ہے {وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا} قسم ہے آسمان کی، اور اس کی جس نے اسے بنایا۔ قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اسے بچھایا۔ قسم ہے انسانی جان کی، اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کیے ہوئے کاموں (مفعول) کی قسم کھائی ہے، جیسے ارشاد ہے {وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى} {وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ} اور قسم یا تو ظاہر ہوتی ہے جیسے ان آیات میں دکھائی دیتی ہے یا پھر پوشیدہ ہوتی ہے، پوشیدہ قسم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس پر لام دلالت کرتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے {لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ} پوشیدہ قسم میں دوسری قسم وہ ہے جس پر معنیٰ دلالت کرے جیسے ارشاد فرمایا {وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا} تقدیر عبارت یوں ہے "وَاللّٰهِ" (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی)

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ چند امور کے ساتھ مختلف چیزوں کی قسم کھاتا ہے، اپنی ذات اقدس کی قسم کھاتا ہے، اپنی صفات مقدسہ کی قسم کھاتا ہے، یا ان چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو اس کی ذات یا صفات کو مستلزم ہیں۔ اور اللہ جو اپنی بعض مخلوقات کی قسمیں کھاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں۔ (التبیان فی اقسام القرآن)

پھر قسم یا تو جملہ خبریہ ہوتی ہے اور غالب یہی ہوتی ہے، جیسے ارشاد ہے {فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ} (الذاریات ۲۳) آسمان کے رب کی قسم! بے شک وہ حق ہے۔

یا پھر جملہ طلبیہ ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے {فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ} (الحجر ۹۲) تیرے پروردگار کی قسم! ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے جو کچھ

وہ کرتے رہے۔

اس قسم کے ذریعے سے کبھی مُقسَم عَلَیہ (جس پر قسم کھائی جائے) کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی قسم یا مقسم علیہ دونوں کو ثابت کرنا اور تاکید مطلوب ہوتی ہے، اس غرض کے لیے انہی چیزوں کی قسم کھائی جاسکتی ہے، جو نظروں سے پوشیدہ ہوں، ورنہ ظاہری مخلوقات سورج، چاند، آسمان جیسی چیزوں کو ثابت کرنے کے لیے قسم کھانا بے معنیٰ سی بات ہے، ہاں ان چیزوں کے ساتھ قسم کھائی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں پر قسم کھائی ہے وہ اس کی آیات (نشانیوں) میں شمار ہوں گی، ان کو مقسم بہ (جن کے ساتھ قسم کھائی جائے) بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہر وہ چیز جو مقسم بہ ہے اس کو مقسم علیہ بھی قرار دیا جاسکے مثلاً سورج، چاند، مقسم بہ تو ہیں مقسم علیہ نہیں اور قرآن مجید مقسم علیہ بھی ہے اور مقسم بہ بھی، قرآن میں قسم کا جواب کبھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی محذوف جیسا کہ "لو" کا جواب کبھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی محذوف، جیسے ارشاد ہے كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ (التکاثر ۵) سنو! اگر تم جان لو یقینی علم۔

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ (الرعد ۳۱) اور اگر کوئی قرآن ایسا بھی اترتا ہے جس کے ذریعے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیے جاتے یا اس کی بدولت زمین شق کر دی جاتی۔ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ (الانفال ۵۰) اور اگر تو دیکھے جب کہ فرشتے کافروں کی روحیں قبض کریں گے۔

اس قسم کے مقامات پر لَرَأَيْتَ هولًا عَظِيمًا تو تو بڑا ہولناک منظر دیکھے گا محذوف ہے، یہ اندازِ بیان لوگوں کی عام عادت کے مطابق ہے، جب وہ قسم قسم کی عجیب چیزیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں اگر تم فلاں وقت فلاں جگہ جو کچھ ہوا دیکھتے (اس موقع پر بھی (اگر) کا جواب حذف کر دیا جاتا ہے) اسی انداز پر یہ آیت ہے وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا (البقرہ ۱۶۵) اور اگر دیکھیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے جب کہ دیکھیں گے عذاب کو کہ بے شک قوت

ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس آیت کے ظاہری معنیٰ یہ ہیں اگر تو دیکھے ان لوگوں کو جنہوں نے دنیا میں ظلم کیا ہے جب کہ وہ آخرت میں عذاب کو دیکھیں گے، یہاں جواب لو محذوف ہے، اس کے بعد فرمایا أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا، قسم کے موقع پر حالف (قسم کھانے والا) کسی شے پر قسم کھاتا ہے اور پھر جب دوبارہ اس قسم کو دہراتا ہے تو مقسم علیہ کو دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

کلام عرب میں قسم کا استعمال زیادہ ہوا کرتا تھا، اس لیے اختصار کی غرض سے فعل قسم کی بجائے باء یا اس کے بدلہ میں واؤ ظاہری اسماء کے ساتھ مستعمل ہوتی ہے اور تاء صرف اللہ کے نام کے ساتھ بولی جاتی ہے، فرمایا {وَتَاللّٰهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ} (الانبیاء ۵۷) اللہ کی قسم! میں تمہارے بتوں سے چال چلوں گا۔ اہل عرب سے فرب الکعبہ بھی منقول ہے، لیکن واؤ کا استعمال زیادہ ہے۔

قرآن کریم میں مقسم علیہ کون سی چیزیں ہیں؟ ایمان کی وہ بنیادی باتیں جن کا پہچاننا ضروری ہے، انہی کو مقسم علیہ قرار دیا گیا ہے، مثلاً ① توحید ② حقانیت قرآن ③ صداقت رسول ﷺ ④ قیامت ⑤ انسانی حالت

توحید کی مثال جیسے ارشاد فرمایا {وَالصَّافَّاتِ صَفًّا} فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا {إِنَّ إِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ} قسم ہے صف بنا کر کھڑے ہونے والے فرشتوں کی، پھر ان فرشتوں کی جو روک ٹوک کرتے ہیں، پھر ان فرشتوں کی جو ذکر کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ تمہارا معبود ایک ہے۔

حقانیت قرآن کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا {فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ} اب میں ان جگہوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جہاں ستارے گرتے ہیں۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی زبردست قسم ہے۔ کہ یہ بڑا باوقار قرآن ہے؟

صداقت رسول ﷺ کی مثال، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا {يس وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ} یس۔ حکمت بھرے قرآن کی قسم۔ بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔

{وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى} قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔ (اے مکہ کے باشندو) یہ تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب نہ راستہ بھولے ہیں، نہ بھٹکے ہیں۔

قیامت کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا {١} فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا {٢} فَالْجَارِيَاتِ يُسْرًا {٣} فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا {٤} إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ {٥} وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ {٦} (الذاریات) قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو گرد اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔ پھر ان کی جو (بادلوں کا) بوجھ اٹھاتی ہیں۔ پھر ان کی جو آسانی سے رواں دواں ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کی جو چیزیں تقسیم کرتی ہیں۔ کہ جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ یقینی طور پر سچا ہے۔ اور اعمال کا بدلہ یقیناً مل کر رہے گا۔

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا {١} فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا {٢} وَالنَّاشِرَاتِ نَشْرًا {٣} فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا {٤} فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا {٥} عُذْرًا أَوْ نُذْرًا {٦} إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ {٧} المرسلات) قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو ایک کے بعد ایک بھیجی جاتی ہیں۔ پھر جو آندھی بن کر زور سے چلتی ہیں۔ اور جو (بادلوں کو) خوب اچھی طرح پھیلا دیتی ہیں۔ پھر قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتے ہیں۔ پھر ان ہواؤں کی جو اللہ کی یاد کا القاء کرنے والی ہیں۔ جو یا تو لوگوں کے لیے معافی مانگنے کا سبب بنتی ہیں یا ڈرانے کا۔ یقیناً وہ واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔

انسانی حالت کی مثال جیسے ارشاد ہے وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى {١} وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى {٢} وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى {٣} إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى {٤} (اللیل) قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔ اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ روشن ہو جائے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا کہ حقیقت میں تم لوگوں کی کوششیں الگ الگ قسم کی ہیں۔

انسان کی صفت پر سورۃ العادیات میں قسم کھائی، فرمایا وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا {١} فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا {٢} فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا {٣} فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا {٤} فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا {٥} إِنَّ الْإِنْسَانَ

لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ {٦}(العادیات) قسم ہے ان گھوڑوں کی جو دوڑتے ہیں ہانپتے ہوئے۔ پھر وہ سُم مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔ پھر صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں۔ پھر وہ اس سے گرد اُڑاتے ہوئے جاتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ وہ (دشمن کی) جمعیت کے اندر گھس جاتے ہیں۔ بیشک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

{وَالْعَصْرِ إِنَّ الْأِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ} زمانے کی قسم ہے۔ انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے۔وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ{١}وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ{٢}وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ{٣}لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ {٤}(التین) قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ اور قسم ہے صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی۔ قسم ہے اس امن وامان والے شہر کی۔ ہم نے انسان کو سب سے اچھے سانچے میں پیدا کیا ہے،لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ{١}وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ{٢}وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ{٣}لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ{٤}(البلد) میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اور اے محمد رسول اللہ ﷺ ! آپ اترے ہیں اس شہر میں۔ اور (قسم کھاتا ہوں) باپ کی اور اس کی اولاد کی۔ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

انسانی اعمال کے انجام وجزا کو سورۃ التین اور سورۃ العصر میں بیان فرمایا گیا ہے، کبھی جواب قسم مذکور نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے عام انداز بیان سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جن امور کی قسم کھائی گئی ہے وہ سب ایک دوسرے کو لازم ہیں جب یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ حق ہیں تو پھر قرآن اور قیامت کی صداقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اسی طرح قرآن کی حقانیت سے رسالت نبوی کا ثبوت یقینی ہے، اسی انداز پر قیامت کا معاملہ ہے، جب وعدے ووعید ثابت ہو گئے تو قرآن اور رسالت کا ثابت ہو جانا پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ (التبیان فی اقسام القرآن)

کبھی جواب قسم اس طرح حذف کیا جاتا ہے کہ نیت میں بھی مراد نہیں ہوتا بلکہ مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور یہ کہ مقسم بہ اُن چیزوں میں ہے جن کے ساتھ قسم کھائی جا سکتی ہے اور کبھی جواب

قسم باوجود محذوف ہونے کے مراد ہوتا ہے، اس کی چند صورتیں ہیں

① جواب قسم اس قدر مشہور و معروف ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ گفتگو اور جواب وسوال کی حالت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جواب قسم خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے جیسے کسی سے کہا جائے کُل (کھانا کھالے) وہ جواب دے لَا وَاللّٰہِ (نہیں اللہ کی قسم) یہاں نہیں کھاؤں گا جواب قسم ہے جو بغیر ذکر کیے سمجھ میں آرہا ہے۔

③ سیاق وسباق (پہلے اور بعد والی عبارت) کا قرینہ جواب قسم کے ذکر سے بے نیاز کر دیتا ہے، قرآن میں زیادہ تر وہاں جواب قسم نہیں لایا جاتا، جہاں کہ خود مقسم بہ مفہوم و معنیٰ کو بتلا رہا ہو، حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسے موقع پر مقسم علیہ کا حذف کرنا ہی فصاحت وبلاغت کے زیادہ مناسب ہے، مثلاً کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر قسم کھانا چاہتا ہے وَالَّذِیْ اَرْسَلَ مُحَمَّدًا بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ وَاَیَّدَہٗ بِالْاٰیٰتِ وَالْبَیِّنٰتِ، قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا اور کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ اس کی تائید و مدد کی۔

ایسے موقع پر مقسم علیہ کے ذکر کی ضرورت نہیں، قسم کے الفاظ خود اس کی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں، اسی طرح توحید اور صفات الٰہیہ پر قسم کھانے والا اگر یوں کہے ھُوَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمِ (الحشر ۲۲) تو جواب قسم کے بیان کرنے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے، سورۃ ص میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے، فرمایا {ص وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ} (ص ۱) قسم ہے ذکر والے قرآن کی۔

یہاں مقسم بہ میں قرآن کی عظمت، شرف اور مرتبہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ یہ قرآن نصیحت اور ذکر سے پر ہے، یہ بندوں کو ان کی ضرورتوں کے متعلق راہنمائی اور نصیحت کرتا ہے، قرآن کی صفت ذی الذکر کے بیان سے جواب قسم سے بے نیازی حاصل ہو گئی۔ (التبیان فی اقسام القرآن)

یہاں سورۃ القیامہ میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ {لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ} یہ قسم معاد کو ثابت کر رہی ہے، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔

اُخروی زندگی میں بھی گناہوں کی خواہش

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ {۴} القیامۃ.

جواب ترجمہ: اصل بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ اپنی آگے کی زندگی میں بھی ڈھٹائی سے گناہ کرتا رہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، يَعْنِي الْكَافِرَ يُكَذِّبُ بِمَا أَمَامَهُ مِنَ الْبَعْثِ وَالْحِسَابِ یہاں انسان سے مراد کافر ہے جو آنے والے معاملات یعنی دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب کا انکار کرتا ہے۔ اس کی دلیل، يَسْئَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَه، ہے یعنی وہ سوال کرتا ہے وہ کب واقع ہوگی، وہ یہ بات انکار اور جھٹلانے کے انداز میں کرتا ہے وہ جھٹلانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی وجہ سے گناہ گار بھی ہوتا ہے۔

علامہ قتیبی رحمہ اللہ اور دوسرے علماء نے جو ذکر کیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ فجور جھٹلانا ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ أَنَّ أَعْرَابِيًّا قَصَدَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَشَكَا إِلَيْهِ نَقَبَ إِبِلِهِ وَدَبِرَهَا، وَسَأَلَهُ أَنْ يَحْمِلَهُ عَلَى غَيْرِهَا فَلَمْ يَحْمِلْهُ، ایک بدو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، اس نے آپ کی خدمت میں اونٹ کے نقب (کھجلی، پہلو کا زخم) اور دَبِر (اونٹ کی پیٹھ میں کجاوہ کی وجہ سے زخم ہو جانے) کی شکایت کی اور یہ سوال کیا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیا جائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اونٹ نہ دیا۔

تو اس بدو نے کہا،

أَقْسَمَ بِاللهِ أَبُو حَفْصٍ عُمَرْ ... مَا مَسَّهَا مِنْ نَقَبٍ وَلَا دَبِرْ

ابو حفص عمر نے قسم اٹھادی کہ اونٹ کو کوئی کھجلی نہیں، کوئی پہلو کا زخم نہیں، کوئی کجاوے کے باعث زخم نہیں، اے اللہ اسے بخش دے اگر اس نے جھٹلایا ہے یعنی جو میں نے کہا ہے اس کی اس نے تکذیب کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس کا معنٰی ہے وہ نافرمانی کرنے میں جلدی کرتا ہے اور توبہ میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ ایک روایت میں انہوں نے یہ کہا وہ کہتا ہے میں عنقریب توبہ کرلوں گا اور وہ توبہ نہیں کرتا پس اس نے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولا۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے وہ کہتا ہے، میں عنقریب توبہ کرلوں گا میں عنقریب توبہ کرلوں گا یہاں تک کہ انتہائی بری حالت پر اسے موت آجاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ ہمیشہ برائی کا ہی عزم کیے رکھتا ہے اگرچہ وہ تھوڑی مدت تک زندہ رہتا ہے، ان تمام اقوال کی صورت میں اَمَامَهٗ کی ضمیر کا مرجع انسان ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ ضمیر قیامت کے لیے ہے، معنٰی یہ ہے بلکہ انسان ارادہ رکھتا ہے کہ وہ قیامت سے پہلے حق کا انکار کرے فجور کا اصل معنٰی حق سے اعراض کرنا ہے، یَسئَلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیَامَہ، وہ سوال کرتا ہے قیامت کب برپا ہوگی۔

اس چھوٹے سے فقرے میں منکرین آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کردی گئی ہے، ان لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً ان پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انہیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔

جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی ان کو اس کی کھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی، اس لیے

دراصل ان کی عقل انہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشات نفس اس میں مانع ہیں۔ (تفہیم القرآن)

قیامت کا ہولناک منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ {٦}فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ {٧}وَخَسَفَ الْقَمَرُ {٨}وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ {٩}يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ {١٠}كَلَّا لَا وَزَرَ {١١}اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ {١٢}يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ {١٣}بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ {١٤}وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ {١٥} القيامة.

جواب ترجمہ: پوچھتا ہے کہ: کب آئے گا وہ قیامت کا دن؟ پھر جب آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور چاند اور سورج اکٹھے کر دئے جائیں گے۔ اس وقت انسان کہے گا کہ: کہاں ہے کوئی جگہ جہاں بھاگ کر جاؤں؟ نہیں نہیں! پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ اس دن تو ہر ایک کو تمہارے پروردگار ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا پڑے گا۔ اس دن ہر انسان کو جتلا دیا جائے گا کہ اس نے کیا کچھ آگے بھیجا ہے، اور کیا کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ سے اچھی طرح واقف ہو گا۔ چاہے وہ کتنے بہانے بنائے۔

یہ کافر جو قیامت کے برپا ہونے کو محال خیال کرتے ہیں، بعید سمجھتے ہیں، یہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب قائم ہو گی؟ مگر جب انسانی آنکھیں حیرت میں ڈوب جائیں گی، انسان پر دھشت کا عالم طاری ہو جائے گا، قیامت کی ہولناکی اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، جب چاند کی چاندنی ختم ہو جائے گی، بے نور ہو جائے گا، سورج اور چاند کو اکٹھا کیا جائے گا، تو یہ انسان اس وقت پکار اٹھے گا کہ اللہ کے عذاب سے جائے فرار کہاں ہے؟ میں کہاں بھاگ جاؤں؟ مگر اس کی آرزو پر کوئی جگہ اسے نہ ملے گی،

کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی، کوئی ٹھکانہ، کوئی آشیانہ سر چھپانے تک کو نہ ملے گا، ایک اللہ ہی کی ذات ہو گی جو بروز محشر انسانوں کو ٹھکانہ مہیا کرے گی، اسی کی طرف سب نے لوٹ کر جانا ہے، وہ ہر ایک کو اس چیز کا بدلہ دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا، اس دن انسان کے تمام اعمال اچھے اور برے سامنے کر دیے جائیں گے، جو اعمال اچھے یا برے انسان نے اپنی مستعار زندگی میں اپنے لیے ذخیرہ بنائے تھے وہ بھی سامنے ہوں گے اور جن میں کوتاہی کی تھی وہ بھی چھپ نہ سکیں گے، انسان اپنی ذات کے خلاف ایک واضح حجت ہو گا، انسان اپنی کوتاہ اعمالیوں، بدکرداریوں کو جان لے گا، اپنے جرائم، اپنی کوتاہ اعمالیوں پر ملنے والی سزا سے بچنے کے لیے جس قدر عذر معذرت کرے گا اس سے کوئی معذرت قبول نہیں کی جائے گی۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ: یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے برق بفتح الباو کسر را کے معنی آنکھ خیرہ ہو گی کہ دیکھ نہ سکیں۔ قیامت کے روز سب کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، نگاہ جما کر کسی چیز کو نہ دیکھ سکیں گی۔

وَخَسَفَ الْقَمَرُ: اس کا نور چلا گیا۔ دنیا میں تو اس کا خسوف (چاند گرہن) اس کی روشنی کے صاف ہونے تک ہوتا ہے، جب کہ آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس کی روشنی واپس نہیں آتی۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ: عطاء بن یسار نے کہا: قیامت کے روز ان دونوں کو جمع کیا جائے گا پھر دونوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا تو وہ دونوں بڑی آگ ہو جائیں گے

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا، دونوں کو حجاب میں کر لیا جائے گا اور ان دونوں کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا کیونکہ دونوں کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی گئی، آگ ان دونوں کے لیے عذاب نہ ہو گی کیونکہ وہ دونوں جمادات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کرے گا تاکہ کافروں کو زیادہ شرمندہ کرے اور انہیں حسرت دلائے۔

مسند ابی داؤد میں سے یزید رقاشی رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، سورج اور چاند جہنم میں دو زخمی بیلوں کی طرح ہوں گے۔ ایک قول یہ

کیا گیا ہے اس جمع سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں جمع ہوں گے اور جدا نہ ہوں گے وہ لوگوں کے قریب قریب ہوں گے تو گرمی کی شدت سے انہیں پسینہ آئے گا گویا معنی یہ ہے ان دونوں کی گرمی ان پر جمع کر دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے سورج اور چاند کو جمع کر دیا جائے گا وہاں رات اور دن پے در پے نہیں آئیں گے۔

يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ: ماوردی رحمہ اللہ نے کہا: یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے، ایک احتمال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے کہے گا دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ جہنم سے بچنے کے لیے یہ قول کرے گا۔ انسان کے بارے میں بھی دو قول ہیں، خاص طور پر کافر یہ قول کرے گا جب قیامت کے روز اس کی پیشی کا مرحلہ ہو گا، کیونکہ مومن کو تو اپنے رب کی بشارت پر اعتماد ہو گا، قیامت کے برپا ہونے پر مومن اور کافر دونوں یہ قول کریں گے کیونکہ انہوں نے قیامت کی ہولناکی کو دیکھ لیا ہو گا۔

كَلَّا لَا وَزَرَ: یعنی کوئی جائے فرار نہیں، کلا کا لفظ رد کرنے کے لیے ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انسان کے قول کی حکایت نہیں پھر اس رد کرنے کی وضاحت کی، یعنی جہنم سے بچنے کی کوئی پناہ گاہ نہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے، معنیٰ ہے کوئی قلعہ نہیں، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کوئی پہاڑ نہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کوئی پناہ گاہ نہیں حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کوئی پناہ گاہ اور بچنے کی جگہ نہیں، سب کا معنیٰ اور مفہوم ایک ہی ہے، لغت میں **وزرٌ** سے مراد وہ چیز ہے جس کی پناہ لی جائے جیسے قلعہ، پہاڑ وغیرہ

إِلَى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اس کا معنیٰ ہے تیرے رب کی طرف لوٹنا ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے آخرت میں قرار گاہ وہ ہو گی جہاں اللہ تعالیٰ اسے ٹھہرائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ان کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہے۔

يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا انسان نیک ہو یا بد اسے بتایا جائے گا جو اس نے برا یا اچھا عمل آگے بھیجا اچھی یا بری سنت

پیچھے چھوڑی جس پر بعد میں عمل کیا جاتا رہا۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے پہلے اور آخری عمل کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا، اس نے معصیت میں سے جو چیز آگے بھیجی اور اطاعت میں سے جو پیچھے چھوڑی، ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، بِمَا قَدَّمَ سے مراد اس کے وہ اموال ہیں جو اس نے اپنے لیے خرچ کیے اور آخَّرَ سے مراد وہ مال ہے جو اس نے وارثوں کے لیے پیچھے چھوڑا۔ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا، اس نے جو فرائض آگے بھیجے اور جن فرائض کو مؤخر کیا اس بارے میں اسے آگاہ کیا جائے گا۔ قشیری رحمہ اللہ نے کہا، یہ اطلاع اس وقت دی جائے گی، جب قیامت کے روز اس کے اعمال کو لے جائیں گے یہ بھی جائز ہے کہ اطلاع موت کے وقت ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا، إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلِمَهُ وَنَشَرَهُ، وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ، أَوْ مُصْحَفًا وَرَّثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ، أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ، أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ، أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ (سنن ابن ماجہ، تفسیر قرطبی)

مومن کو اس کی موت کے بعد بھی جو اعمال اور نیکیاں پہنچتی رہتی ہیں وہ ایسا علم ہے جس کی اس نے تعلیم دی اور اسے عام کیا، وہ نیک بچہ جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آیا ایسا قرآن حکیم کا نسخہ ہے جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آیا ایسی مسجد جس کو اس نے بنایا، ایسا مسافر خانہ جسے اس نے تعمیر کروایا، ایسی نہر جو اس نے جاری کی، ایسا صدقہ جو اس نے اپنے مال میں سے صحت اور زندگی میں نکالا تھا، یہ اعمال اسے موت کے بعد بھی پہنچتے رہیں گے۔

ابو نعیم رحمہ اللہ نے اس معنیٰ کی حدیث قتادہ رحمہ اللہ سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے رسول اللہ نے ارشاد فرمایا، (سَبْعٌ يَجْرِي أَجْرُهُنَّ لِلْعَبْدِ بَعْدَ مَوْتِهِ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ: مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا أَوْ أَجْرَى نَهْرًا أَوْ حَفَرَ بِئْرًا أَوْ غَرَسَ نَخْلًا أَوْ بَنَى مَسْجِدًا أَوْ وَرَّثَ

مُصْحَفًا أَوْ تَرَكَ وَلَدًا يَسْتَغْفِرُ لَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ (ابونعیم، قرطبی) سات اعمال ایسے ہیں جس کا اجر بندے کو اس کی موت کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے جب کہ وہ اپنی قبر میں ہوتا ہے جس نے کسی کو علم سکھایا جس نے کوئی نہر جاری کی، کوئی کنواں کھودا، کوئی کھجور لگائی، کوئی مسجد بنائی، مصحف قرآن کسی کو ورثہ کے طور پر دیا ایسا بچہ چھوڑا جو اس کے حق میں مغفرت طلب کرتا ہے۔

حدیث طیبہ کے الفاظ بَعْدَ مَوْتِهِ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ اس کی موت کے بعد جب وہ قبر میں ہوتا ہے یہ اس بارے میں واضح ہے کہ یہ موت کے وقت اطلاع نہیں دی جاتی ان سب کے بارے میں اس وقت اطلاع دی جاتی ہے جب اس کے اعمال کا وزن کیا جارہا ہوتا ہے، اگرچہ قبر میں اسے ان چیزوں کی بشارت دی جاسکتی ہے، اس معنٰی ومفہوم پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے، وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: ۱۳) اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کے کئی بوجھ، اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ۔ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل: ۲۵) اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے تھے جہالت سے، یہ آخرت میں اعمال کا وزن ہونے کے بعد ہوگا۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ (بخاری) جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت جاری کی تو اس کے لیے اپنا اجر اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی ہوگا جب کہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی، جس نے اسلام میں کوئی طریقہ برا شروع کیا تو اس پر اس کا اپنا بوجھ ہوگا اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کا بوجھ ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

حِفظ قرآن، تلاوت و تفسیر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ {۱۶}اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ{۱۷} فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ {۱۸}ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ{۱۹}القيامة.

جواب ترجمہ: آپ قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کریں تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لے لیں، بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور پڑھوا دینا، پھر جب ہم اسے (جبریل کے واسطے سے) پڑھ رہے ہوں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں پھر اس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کو فرمارہے ہیں کہ آپ ﷺ نزول وحی کے وقت اس لیے جلدی جلدی نہ پڑھا کریں کہ کہیں قرآنی آیات آپ ﷺ سے رہ جائیں گی کہیں حفظ نہیں ہو سکیں گی، آپ فکر نہ کریں ہم اس قرآن کو آپ ﷺ کے مبارک سینہ پر جمع کر دیں گے، پھر آپ ﷺ جب چاہیں اپنی زبان مبارک سے اس کو پڑھتے رہیں، اس کی تلاوت کرتے رہیں، جب ہمارے فرستادے جبریل آپ ﷺ کے سامنے پڑھیں تو پھر آپ ﷺ پوری توجہ، انہماک اور توغل کے ساتھ اسے سنیں، اور اس وقت خاموشی اختیار فرمائیں، پھر جس طرح جبریل آپ ﷺ کو پڑھائیں آپ ﷺ اسی طرح پڑھتے جائیں، پھر اس قرآن کے متن کی طرح اس کی تفسیر بھی ہم آپ ﷺ پر واضح کر دیں گے، اس کے معانی، مفاہیم اور مطالب بھی آپ ﷺ کو سمجھا دیں گے اور بتا دیں گے۔

انسان کی دنیا پرستی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کریں، نیز یہ بتائیں کہ یہاں العاجلہ کا کیا مطلب ہے؟

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ {۲۰}وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ{۲۱} القيامة.

جواب خبر دار (اے کافرو) اصل بات یہ ہے کہ تم فوری طور پر حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔ اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، ابو جہل قرآن کی تفسیر اور اس کے بیان پر ایمان نہیں لائے گا ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ نماز نہیں پڑھیں گے اور زکوۃ نہیں دیں گے اس سے مراد کفار مکہ ہیں۔ اے مکہ کے کفار تم دنیاوی زندگی سے محبت کرتے ہو اور آخرت کے لیے عمل کرنے کو ترک کرتے ہو۔

کافروں کو بتایا جارہا ہے کہ تمہارا قیامت وغیرہ سے انکار کرنا ہرگز کسی دلیل صحیح پر مبنی نہیں بلکہ دنیا میں انہماک اس کا سبب ہے دنیا چونکہ نقد اور جلد ملنے والی چیز ہے اسی کو تم چاہتے ہو۔ اور آخرت کو اُدھار سمجھ کر چھوڑتے ہو کہ اس کے ملنے میں ابھی دیر ہے۔ انسان کی طبیعت میں جلد بازی داخل ہے۔ (تفسیر عثمانی) یہاں آیت میں عاجلہ سے مراد دنیا ہے۔

قیامت: مسلمانوں اور کافروں کے چہرے

سوال قیامت کے دن ایمان والوں اور کافروں کے کے چہرے کیسے ہوں گے؟ اس کی وضاحت ان آیات کی روشنی میں فرمائیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ {۲۲} اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ {۲۳} وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ {۲۴} تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ {۲۵} القیامۃ.

جواب ترجمہ: اس دن بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اس دن بدرونق ہوں گے۔ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ ہو گا جو کمر توڑ دینے والا ہے۔

قیامت کے دن اہل سعادت، نیک بخت، اہل ایمان کے چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے پروردگار کی زیارت سے شرف یاب ہو رہے ہوں گے، جب کہ بدبختوں، بدنصیبوں اور کافروں کے چہرے بے رونق اور مصیبت کے مارے ہوئے، لٹکے ہوئے اور اترے ہوئے دکھائی دیں گے۔

موت کی سختی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ {۲۶}وَقِيْلَ مَنْ ۜرَاقٍ {۲۷}وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ {۲۸}وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ {۲۹}اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمَسَاقُ {۳۰}فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى {۳۱}وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى {۳۲}ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى {۳۳}اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى {۳۴}ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى {۳۵}القيامة.

جواب ترجمہ: خبر دار! جب جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی۔ اور (تیمار داروں کی طرف سے) کہا جائے گا کہ: ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور انسان سمجھ جائے گا کہ جدائی کا وقت آگیا۔ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ تو اس دن تمہارے پروردگار ہی کی طرف روانگی ہو گی۔ اس کے باوجود انسان نے نہ مانا، اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ حق کو جھٹلایا اور منہ موڑ لیا۔ پھر اکڑ دکھاتا ہوا اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا۔ بربادی ہے تیری، ہاں بربادی ہے تیری۔ پھر سن لے کہ بربادی ہے تیری، ہاں بربادی ہے تیری!۔

یہ بات عام مشاہدہ میں آئے دن آتی رہتی ہے، جب انسان کا وقت اخیر آتا ہے تو تیمار داری کرنے والے زائرین کہتے ہیں کہ کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے جو اس بیمار کو دم کرے تاکہ اسے شفاء مل جائے؟ جب جانکنی کے عالم میں کوئی شخص ہوتا ہے اسے یقین ہوتا ہے کہ اب اس کا وقت رحلت ہے، اسے اب یہ دنیا چھوڑنا ہے، کیونکہ وہ اب وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے، موت کے وقت اس کی ایک پنڈلی دوسری پنڈلی کے ساتھ جڑ رہی ہوتی ہے۔

مرنے والے کو پتا چل رہا ہوتا ہے کہ اس کی دنیوی زندگی کا آخری مرحلہ کس قدر شدید ہے اور اخروی زندگی کا پہلا مرحلہ کس قدر دشوار ہے، بندگانِ پروردگار بروز محشر اپنے پروردگار ہی کی جانب رواں دواں ہوں گے، کوئی تو جنت کی طرف جائے گا اور کوئی دوزخ کی طرف، مگر کافروں کی حرماں نصیبی کا کیا کہنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لائے، اللہ کی سچی اور آخری کتاب قرآن کریم پر ایمان نہیں لائے، اللہ کے حقوق پائمال کیے، نماز کی ادائیگی نہیں کی، قرآن کریم کو مانا بھی نہیں، جانا

بھی نہیں الٹا اس کی تکذیب کی، اسے جھٹلایا، ایمان سے منہ موڑا، پھر اپنے لوگوں کی سمت متکبر انہ اور متبختر انہ انداز میں چلتے بنے، اللہ انہیں سمجھا رہا ہے کہ تمہاری بربای ہے، تمہاری تباہی ہے، تمہاری ہلاکت ہے۔

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ: علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کلا جھڑکنے کے لیے ہے۔ یعنی یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے کہ کافر روز قیامت پر ایمان لائے۔

پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا اور فرمایا، جب نفس یا روح ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے جس نفس کا ذکر جاری نہیں تھا اس کی خبر دی کیونکہ مخاطب کو اس کا علم تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، **حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ** (ص: ۳۲) یہاں تک کہ وہ حجاب میں چھپ جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان **فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ** (الواقعہ: ۸۳) پس تم کیوں نہیں لوٹا دیتے جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے، کلا کا معنی حقاً ہے یعنی یہ بات ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی جانا ہے، یعنی نفس جب ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے **إِذَا بَلَغَتْ نَفْسُ الْكَافِرِ التَّرَاقِيَ**، جب کافر کا نفس ہنسلی کی ہڈی تک جا پہنچے۔ (تفسیر قرطبی) **تَرَاقِيَ**، تَرْقُوَۃ کی جمع ہے ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جو اونٹ ذبح کرنے کی جگہ جمع ہوتی ہیں یہ سینہ سے اوپر اور حلق کے ابتدائی حصہ میں ہوتی ہیں۔

درید بن صِمہ نے کہا:

وَرُبَّ عَظِيمَةٍ دَافَعْتُ عَنْهُمْ ... وَقَدْ بَلَغَتْ نُفُوسُهُمُ التَّرَاقِيَ

کتنی ہی بڑی مصیبتیں ہیں جن کو تو نے ان سے دور کیا جب کہ ان کے نفوس ہنسلی کی ہڈی کو پہنچے ہوئے تھے۔ جو آدمی موت کے وقت کو پہنچ چکا ہو اس کے لیے کنایہ کے طور پر نفس کے ہنسلی کی ہڈی تک پہنچنے سے تعبیر کرتے ہیں مقصود یہ ہے کہ انہیں موت کے آنے کے وقت سختی کو یاد کرایا جائے۔ (تفسیر قرطبی)

وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ: اصل میں لفظ راق استعمال ہوا ہے جو رقیہ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے جس کے معنی تعویز گنڈے اور جھاڑ پھونک کے ہیں، اور رقی سے بھی، جس کے معنی چڑھنے کے ہیں۔ اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ آخر وقت میں جب مریض کے تیمار دار ہر دوادارو سے مایوس ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ ارے کسی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کو تلاش کرو جو اس کی جان بچالے۔

اور اگر دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ اس وقت فرشتے کہیں گے کہ اس روح کو کسے لے کر جانا ہے؟ ملائکہ عذاب کو یا ملائکہ رحمت کو؟ بالفاظ دیگر اسی وقت یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ مرنے والا کس حیثیت میں عالم آخرت کی طرف جارہا ہے۔ نیک انسان ہو گا تو ملائکہ رحمت اسے لے جائیں گے، اور بد انسان ہو گا تو رحمت کے فرشتے اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے اور عذاب کے فرشتے اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ تفہیم القرآن)

هَلْ لِلْفَتَى مِنْ بَنَاتِ الدَّهْرِ مِنْ وَاقٍ... أَمْ هَلْ لَهُ مِنْ حِمَامِ الْمَوْتِ مِنْ رَاقٍ

کیا زمانے کی بیٹیوں (مصیبتوں) سے کوئی نوجوان بچ سکتا ہے؟ اور کیا موت کے مقررہ وقت سے کوئی تعویذ یا بچانے والا موجود ہے۔

وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ: انسان یقین کرلے گا کہ یہ دنیا، اہل، مال اور اولاد کی جدائی کا وقت ہے یہ اس وقت ہو گا جب وہ فرشتوں کو دیکھ لے گا۔ شاعر نے کہا،

فِرَاقٌ لَيْسَ يُشْبِهُهُ فِرَاقُ... قَدِ انْقَطَعَ الرَّجَاءُ عَنِ التَّلَاقِ

ایسی جدائی جس کی مثل کوئی جدائی نہیں جس میں ملاقات کی امید ختم ہو گئی ہے۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک شدت دوسری شدت کے ساتھ مل چکی ہے یعنی دنیا کے آخر کی شدت، آخرت کے آغاز کی شدت کے ساتھ مل چکی ہے۔ (قرطبی) امام شعبی رحمہ اللہ اور دوسرے علماء نے فرمایا، موت کے وقت شدتِ تکلیف سے انسان کی دونوں پنڈلیاں لپٹ گئیں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، کیا تو نے نہیں دیکھا جب وہ موت

کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اپنے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر مارتا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: یہ انسان کی دو پنڈلیاں ہیں جب انہیں کفن میں لپیٹ دیا جائے۔

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا، کفن کی پنڈلی میت کی پنڈلی کے ساتھ چمٹ گئی۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا، اس کے دونوں پاؤں مر گئے اس کی دونوں پنڈلیاں سوکھ گئیں پس وہ اسے نہیں اٹھاتیں جب کہ وہ ان پر خوب گھومتا تھا۔ نحاس رحمہ اللہ نے کہا، پہلا قول ان میں سے سب سے حسین ہے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، معنی ہے ایک مصیبت دوسری مصیبت سے مل گئی، وہ کہتے ہیں اس پر شدائد پے در پے ہو گئے، ضحاک رحمہ اللہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، اس پر دو شدید امر جمع ہو گئے لوگ اس کے جسم کو تیار کرتے ہیں اور فرشتے اس کی روح کو تیار کرتے ہیں۔

عرب ساق کا لفظ بڑی مصیبت کے لیے استعمال کرتے ہیں اس معنی میں ان کا قول ہے، قَامَتِ الدُّنْيَا عَلَى سَاقٍ، وَقَامَتِ الْحَرْبُ عَلَى سَاقٍ، دنیا بڑی مصیبت پر کھڑی ہے جنگ بڑی مصیبت پر کھڑی ہے شاعر نے کہا: وَقَامَتِ الْحَرْبُ بِنَا عَلَى سَاقٍ جنگ نے ہمیں بڑی مصیبت پر کھڑا کر دیا ہے۔ تفسیر قرطبی)

إِلَى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ: سفر آخرت کی ابتدا یہاں سے ہے۔ گویا اب بندہ اپنے رب کی طرف کھینچنا شروع ہوا، مگر افسوس اپنی غفلت و حماقت سے کوئی سامان سفر کا پہلے سے درست نہ کیا نہ اتنے بڑے سفر کے لیے کوئی توشہ ساتھ لیا۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّى: علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ابو جہل نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ (تفسیر قرطبی) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے جو سورت کے آغاز میں ہے وہ اسم جنس ہے پہلا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے یعنی اس نے رسالت کی تصدیق نہ کی اور نہ اپنے رب سے دعا کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، نہ کتاب اللہ کی تصدیق کی اور نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے نہ اپنے مال کا

صدقہ دیا تاکہ اللہ کے ہاں ذخیرہ ہو جائے اور نہ ہی وہ نمازیں پڑھیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا ایک قول یہ کیا گیا ہے نہ اپنے دل سے ایمان لایا اور نہ اپنے بدن سے عمل کیا۔ (تفسیر قرطبی)

وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى: اس نے قرآن کو جھٹلایا اور ایمان سے روگردانی کی۔

ثُمَّ ذَهَبَ إِلٰى أَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى: پھر وہ اس پر فخر کرتے ہوئے تکبر کے انداز میں اپنے گھر چلا گیا یہ مجاہد رحمہ اللہ اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، اس سے مراد ابو جہل ہے۔ یتمطی مطا سے مشتق ہے جس کا معنی پشت ہے معنی ہے وہ اپنی پشت کو دہرا کرتا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے، اس کی اصل یتمطط ہے یعنی سستی کا اظہار کرنا اور بوجھل ہونا ہے وہ حق کی طرف دعوت دینے والے سے بوجھل ہوتے ہیں۔ اس کی ایک طاء کو یاء سے بدل دیا کیونکہ ایک ہی جنس کے حرف ہونا ناپسندیدہ تھا۔ تمطی یہ پرواہ نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ تمدد سے بھی یہی مراد ہے گویا وہ تکبر کی وجہ سے اپنی پشت کو پھیلاتا ہے اور اسے دہرا کرتا ہے۔ مطیطہ حوض کے نیچے گاڑھے پانی کو کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے **إِذَا مَشَتْ أُمَّتِي الْمُطَيْطَاءَ وَخَدَمَتْهُمْ فَارِسُ وَالرُّومُ كَانَ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ**، جب میری امت کمریں دہری کر کے چلے گی اور ایرانی اور رومی اس کے خدمت گزار ہو جائیں تو اس کی آپس میں جنگ شروع ہو جائے گی۔ مطیطاء سے مراد تکبر کرنا اور چلتے وقت ہاتھوں کو پھیلانا ہے۔ (قرطبی)

أَوْلٰى لَكَ فَأَوْلٰى: دھمکی کے بعد دھمکی ہے۔ وعید کے بعد وعید ہے۔ یہ چار چیزوں پر چار وعیدیں ہیں جس طرح روایت کی گئی ہے یہ ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے رب سے جاہل تھا یعنی اس نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق نہ کی میرے سامنے کھڑا نہ ہوا کہ نماز پڑھتا بلکہ اس نے میرے رسول کی تکذیب کی اور میرے سامنے نماز پڑھنے سے روگردانی کی۔

تصدیق کو چھوڑنا ایک خصلت ہے، جھٹلانا ایک خصلت ہے، نماز چھوڑنا ایک خصلت ہے، اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرنا ایک خصلت ہے، چار چیزوں کو چھوڑنے کی وجہ سے چار وعیدیں آئیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہا جائے کہ ثم ذھب الی اھلہ یتمطی، پانچویں خصلت ہے کیونکہ یہ خصلت جھٹلانے اور اعراض کرنے سے پہلے بھی موجود تھی تو اس کے بارے میں خبر دی۔ (قرطبی)

ایک روایت میں ہے کہ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ذَاتَ يَوْمٍ، فَاسْتَقْبَلَهُ أَبُو جَهْلٍ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، مِمَّا يَلِي بَابَ بَنِي مَخْزُومٍ، فَأَخَذَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ، فَهَزَّهُ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ قَالَ: (أَوْلَى لَكَ فَأَوْلَى) فَقَالَ لَهُ أَبُو جَهْلٍ: أَتُهَدِّدُنِي؟ فو اللّٰهِ إِنِّي لَأَعَزُّ أَهْلِ الْوَادِي وَأَكْرَمُهُ. وَنَزَلَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كما قَالَ لِأَبِي جَهْلٍ

رسول کریم ﷺ ایک روز مسجد سے نکلے تو مسجد کے دروازے پر آپ ﷺ کو ابو جہل ملا جو بنی مخزوم کے دروازے کے ساتھ تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک یا دو دفعہ جھٹکا دیا پھر فرمایا، اولی لک فاولی۔ ابو جہل نے آپ سے کہا کیا تو مجھے دھمکاتا ہے؟ اللہ کی قسم میں اس وادی کے مکینوں میں سے سب سے زیادہ معزز و محترم ہوں۔ رسول اللہ نے جس طرح ابو جہل سے فرمایا تھا اس اسلوب میں آیت نازل ہوئی۔ یہ دھمکی کے کلمات ہیں۔

شاعر نے کہا:

فَأَوْلَى ثُمَّ أَوْلَى ثُمَّ أَوْلَى ... وَهَلْ لِلدَّرِّ يُحْلَبُ مِنْ مَرَدِّ

ہلاکت ہو، ہلاکت ہو پھر ہلاکت ہو کیا دودھ کو بار بار دوہا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ناممکن ہے کہ گمراہی کے راستے پر چلنے والا انجام خیر پائے، جیسے الٹی طرف سے دودھ نہیں نکل سکتا، ویسے ہی غلط رویے کا انجام خیر نہیں ہو سکتا۔

ابو جہل متکبر انسان تھا، جب بدر کا دن آیا تو وہ مسلمانوں کے قریب ہو کر کہنے لگا کہ آج کے بعد اللہ کی عبادت کبھی بھی نہ کی جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا، اور وہ برے طریقے سے قتل ہوا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی ہے تیرے لیے ہلاکت ہے اسی بارے میں خنساء کا شعر ہے:

هَمَمْتُ بِنَفْسِي كُلَّ الْهُمُومِ ...فَأَوْلَى لِنَفْسِي أَوْلَى لَهَا

سَأَحْمِلُ نَفْسِي عَلَى آلَةٍ ...فَإِمَّا عَلَيْهَا وَإِمَّا لَهَا

میں نے اپنے بارے میں ہر قسم کا ارادہ کیا میرے نفس کے لیے ہلاکت ہے اس کے لیے ہلاکت ہے میں اپنے نفس کو ایسی حالت پر مجبور کروں گی، وہ حالت اس کے خلاف ہو گی یا اس کے حق میں ہو گی۔

الآلۃ کا معنی حالت ہے اور الآلۃ کا معنی چارپائی بھی ہے جس پر میت کو اٹھایا جاتا ہے اس تاویل کی بنا پر یہ کہا جائے گا کہ ان کلمات میں سے ہے جن میں قلب کا قاعدہ جاری ہوا گویا کہا گیا، اویل پھر حرف علت کو موخر کیا گیا معنی ہے تیرے لیے زندہ ہونے کی صورت میں ہلاکت ہے، تیرے لیے مردہ ہونے کی صورت میں ہلاکت ہے جس روز تو جہنم میں داخل ہو یہ جانے کے وقت ہلاکت ہے اور تیرے لیے اس روز ہلاکت ہے جس روز تو جہنم میں داخل ہو، یہ تکرار اسی طرح ہے جس طرح کسی نے کہا، لَكَ الْوَيْلَاتُ إِنَّكَ مُرْجِلِي، تیرے لیے پے درپے ہلاکتیں ہوں تو مجھے آزاد چھوڑنے والا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے اصمعی نے کہا کلام عرب میں اولی کا لفظ ہلاکت کے قریب ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے گویا وہ کہتا ہے تو ہلاکت کے قریب ہو گیا۔ یہ ولی سے ماخوذ ہے جس کا معنی قرب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ۔ توبہ ۱۲۳) اے ایمان والو۔ ان کفار سے تم جنگ کرو جو تمہارے قریب رہتے ہیں۔

تخلیق انسانی کے مراحل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى {۳۶}اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى {۳۷}ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى {۳۸}فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى {۳۹}اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ

عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى {۴۰} القیامہ

جواب ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ اس منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو (ماں کے رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اسے بنایا، اور اسے ٹھیک ٹھاک کیا، نیز اسی سے مرد اور عورت کی دو صنفیں بنائیں۔ کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو پھر سے زندہ کر دے؟

قرآن مجید کے مخاطبین ایمان لانے کو تیار نہ تھے اور جب انہیں قیامت اور وہاں کے حساب کتاب اور جنت اور جہنم کے داخلے کی باتیں بتائی جاتی تھیں تو ان سب کو جھٹلا دیتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ دنیا میں رہیں گے مزے اڑاتے رہیں گے۔

دنیا میں آئے، وقت پورا کیا، چلے گئے، موت کے بعد پوچھ گچھ جزا سزا کچھ نہیں ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کیا انسان یوں سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ یہ استفہام انکاری ہے اور مطلب یہ ہے کہ انسان کا اپنے بارے میں یہ سوچ لینا کہ میں یوں ہی بلا حساب کتاب چھوڑ دیا جاؤں گا غلط ہے۔ (انوار البیان)

عربی زبان میں ابل سدی اس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو، جدھر چاہے چرتا پھرے، کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اسی معنٰی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اسی طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ، کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے (المؤمنون۔۱۱۵)

ان دونوں مقامات پر زندگی بعد موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم با اختیار، اس کے افعال میں اخلاقی حسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے اس طرح تم بھی ہو؟

جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھائے جانے کی معقول وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے صرف اپنی جبلت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بری سنت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔

لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے کیونکہ اس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے کی کوئی حاجت ہو، لیکن تم حیات بعد موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود اندازہ لگاتی ہے؟

جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی اچانک کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس کو نلوہ (Scot free) چھوٹ جانا چاہیے اور اس ظلم کا بدلہ اسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اسے بھی کسی بھنگے یا ٹڈے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اٹھ کر اپنے ان کرتوتوں کی جوابدہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں

انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟

جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی ہو اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا ہو کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟ (تفہیم القرآن)

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَى: انسان حشر کا کیسے انکار کرتا ہے اور اس طرح دوبارہ جی اٹھنے کو ناممکن قرار دیتا ہے کیا وہ منی کی ایک بوند نہ تھا جو رحم میں ٹپکائی جاتی ہے پھر نطفہ ہونے کے چالیس روز بعد خون کا لوتھڑا ہوا پھر اتنے ہی دنوں میں بوٹی بنا پھر ہڈیاں بنیں پھر ان کو گوشت پہنایا۔

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى: نطفہ سے جمے ہوئے خون کی شکل میں آیا۔ پھر اللہ نے اس کی پیدائش کے سب مراتب پورے کر کے انسان بنا دیا اور تمام ظاہری اعضاء اور باطنی قوتیں ٹھیک کر دیں۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْأُنْثَى: ایک نطفہ بے جان سے انسان عاقل بن گیا، پھر اسی نطفہ سے عورت اور مرد دو قسم کے آدمی پیدا کئے جن میں سے ہر ایک قسم کی ظاہری و باطنی خصوصیات جداگانہ ہیں، کیا وہ قادر مطلق جس نے اولاً سب کو ایسی حکمت و قدرت سے بنایا، اس پر قادر نہیں کہ دوبارہ زندہ کر دے؟ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ فَبَلٰى پاک ہے تیری ذات اے خدا کیوں نہیں تو بیشک قادر ہے۔

أَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى: کیا وہ ذات پاک جس نے پانی کے ایک قطرہ سے اس انسان کو پیدا کیا ہے وہ ان اجسام کے بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر قادر نہیں۔ رسول اللہ سے یہ روایت مروی ہے کہ أَنَّهُ كَانَ إِذَا قَرَأَهَا قَالَ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ، بَلٰى جب آپ اس آیت کی تلاوت کرتے تو زبان سے یہ کلمات پڑھتے، سبحانک اللھم بلی اے اللہ۔ تو ہر عیب سے پاک ہے کیوں نہیں تو ایسا کرنے پر قادر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا، جو سبح اسم ربک الاعلی۔ کی قرأت کرے وہ امام ہو یا کوئی اور تو وہ یہ کہے سبحان ربی الاعلی، اور جو سورۃ القیامہ کی تلاوت کرے وہ امام ہو یا کوئی اور تو وہ سبحانک اللھم بلی، کہے۔ (قرطبی)

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج سورۃ القیامہ کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرما کر توشہ آخرت بنادے، اور ہم سب کی نجات کا ذریعہ بنادے، آمین ثم آمین

خادم اسلام: محمود الرشید حدوٹی عباسی

حال وارد حدوٹ مری

۳۰ جون ۲۰۱۹ء بروز اتوار بوقت پونے دس بجے شب

حروف بینی: ۷ اگست ۲۰۱۹ء بروز بدھ، حال وارد حدوٹ مری

☆☆☆☆

الانسان

اے انسان ذرا اپنے فرائض پہچان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ﴿۴﴾ الإنسان.

جواب ترجمہ: انسان پر کبھی ایسا وقت آیا ہے کہ نہیں جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا؟ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا کہ اسے آزمائیں۔ پھر اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا کہ وہ یا تو شکر گزار ہو، یا ناشکرا بن جائے۔ ہم نے ہی کافروں کے لیے زنجیریں، گلے کے طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔

کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سب سے عمدہ، افضل اور بہترین سانچوں میں ڈھال کر جس مخلوق کو پیدا کیا گیا ہے وہ انسان ہے جس کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کو انسانوں میں سے منتخب کرکے ان کے سروں پر نبوت کا تاج سجایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا ہے کہ انسان کو اپنی پیدائش اور وجود پر غور کرنا چاہیے کیونکہ ہر انسان پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب اس دنیا میں اس کا نام ونشان نہ تھا اور کوئی قابل ذکر چیز بھی نہ تھا۔ پھر اللہ نے اس کو پیدا کرکے عظمت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ اللہ ہی نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کرکے سننے اور دیکھنے کی طاقتوں سے نوازا ہے کہ اس کو آزمایا جاسکے کہ وہ اپنے حواس سے کام لے کر ایمان اور شکر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا وہ دیکھتے بھالتے اللہ سے کفر و انکار اور ناشکری کرتا ہے۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

مخلوط نطفہ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی پیدائش مرد اور عورت کے الگ الگ نطفوں سے نہیں ہوئی بلکہ عورت کا بیضہ (Ovum) اور مرد کا نطفہ (Sperm) جب یہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو اس وقت ماں کے رحم میں وہ چیز بننا شروع ہو جاتی ہے جو مختلف فطری مرحلوں سے گزر کر آخر کار ایک جیتے جاگتے انسان یا جاندار کی صورت شکل اختیار کر لیتی ہے۔ (بصیرت قرآن)

اس انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں یا کائنات میں قدم رکھنے والا ہر انسان ہے ؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ روایات نقل کی گئی ہیں کہ یہاں انسان سے مراد کوئی خاص انسان نہیں ہے بلکہ اس سے مراد " جنس انسانی " ہے یعنی آج تک جتنے انسان آئے ہیں یا آئندہ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور پیدائش کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ ہم سب کچھ دے کر انسان کو آزمانا اور جانچنا چاہتے ہیں کہ وہ یہ سب کچھ پا کر بہک جاتا ہے یا اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کر کے جنت کی ابدی راحتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں اللہ کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو بھی کفر و شرک اور ناشکری کا طریقہ اپنائے گا اس کو انتہائی سخت سزا دی جائے گی۔ اللہ نے ایسے ناشکرے لوگوں کے لئے ایسی زنجیریں تیار کر رکھی ہیں جن میں باندھ کر ان کو گھسیٹا جائے گا۔ ان کی گردنوں میں طوق ڈال کر اور اس کو مضبوط باندھ کر ان کو جہنم کی بھڑکتی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ (بصیرت قرآن)

نیکوکاروں کی مے نوشی

سوال جنت میں نیکوکار لوگوں کے لیے کیا کیا نعمتیں ہوں گی؟ اور وہ ان نعمتوں تک کیسے پہنچیں گے ؟ ان آیات کی روشنی میں تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا {۵} عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا {۶} يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا {۷}

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا {۸}اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا {۹}اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا {۱۰} الإنسان.

جواب ترجمہ: بیشک نیک لوگ ایسے جام سے مشروبات پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہو گی۔ یہ مشروبات ایک ایسے چشمے کے ہوں گے جو اللہ کے (نیک) بندوں کے پینے کے لیے مخصوص ہے، وہ اسے (جہاں چاہیں گے) آسانی سے بہا کر لے جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی منتیں پوری کرتے ہیں، اور اس دن کا خوف دل میں رکھتے ہیں جس کے برے اثرات ہر طرف پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کوئی شکریہ۔ ہمیں تو اپنے پروردگار کی طرف سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جس میں چہرے بری طرح بگڑے ہوئے ہوں گے۔

قرآن کریم میں ابرار ان لوگوں کو کہا گیا جو اطاعت گزار اور اہل اخلاص ہوں گے، یہ وہ خوش قسمت اور خوش نصیب لوگ ہوں گے جو اللہ کے حقوق کی باقاعدگی سے ادائیگی کرتے ہیں، ان لوگوں کو بروز محشر ایسے پیالے میں شراب پلائی جائے گی جس میں کئی اقسام اور انواع کی خوشبو ملی ہوئی ہو گی، اسے ماء کافور کہا جاتا ہے، یہ وہ شراب ہو گی جس میں کافور کی آمیزش ہو گی، یہ ایسا چشمہ ہو گا جس سے بندگان خدا پئیں گے، اسے استعمال کریں گے، یہ بڑی سہولت سے اسے حاصل کریں گے، اس لیے کہ یہ لوگ جب دنیا میں تھے تو ان نذروں کو پورا کرتے تھے جو انہوں نے اپنے اوپر لازم کر رکھی تھیں۔

یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے عذاب سے ڈرتے تھے، جس کا ضرر اور نقصان بہت زیادہ ہو گا، اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہو گا، سوائے ان لوگوں کے جن پر اللہ رحم کرے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے

جو مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، یہ صرف اللہ کی محبت کی خاطر ایسا کرتے تھے ورنہ ان کا دلی میلان بھی انہی چیزوں کی طرف تھا اور ان کی اپنی ضروریات بھی تھیں۔

سب کچھ کرنے کے باوجود یہ لوگ لوگوں سے یوں نہیں کہتے تھے کہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو بلکہ یہ ایک ہی مقصد مد نظر رکھتے تھے کہ ہم سے اللہ راضی ہو جائے، اللہ ہمیں اس کار خیر کا بہترین بدلہ دے دے، ہم کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں، کسی توصیف وستائش کے خواہش مند نہیں، ہم تو اس دن کی ہولناکی سے خوف زدہ ہیں جس میں چہرے بڑی بری طرح بگڑے ہوئے ہوں گے۔

جنتیوں کو ملنے والی نعمتیں

سوال قیامت کے دن نیکوکاروں کا بدلہ کیا ہو گا؟ ان آیات کی روشنی میں بتایئے۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا {۱۱}وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا {۱۲}مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا {۱۳}وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا {۱۴}وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا {۱۵}قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا {۱۶}وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا {۱۷}عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا {۱۸}وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا {۱۹}وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا {۲۰}عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا {۲۱}اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا {۲۲} الإنسان.

جواب ترجمہ: اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو اس دن کے برے اثرات سے بچالے گا، اور ان کو شادابی اور سرور سے نوازے گا۔ اور انہوں نے جو صبر سے کام لیا تھا، اس کے بدلے میں انہیں

جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔ وہ ان باغوں میں آرام دہ اونچی نشستوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، جہاں نہ دھوپ کی تپش دیکھیں گے اور نہ کڑاکے کی سردی۔ اور حالت یہ ہو گی کہ ان باغوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے، اور ان کے پھل مکمل طور سے ان کے آگے رام کر دیے جائیں گے۔ اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور وہ پیالے گردش میں لائے جائیں گے جو شیشے کے ہوں گے۔ شیشے بھی چاندی کے جنہیں بھرنے والوں نے توازن کے ساتھ بھرا ہو گا۔ اور وہاں ان کو ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملا ہوا ہو گا۔ وہاں کے ایسے چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہے۔ ان کے سامنے (خدمت کے لیے) ایسے لڑکے گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ جب تم انہیں دیکھو گے تو یہ محسوس کرو گے کہ وہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) جب تم وہ جگہ دیکھو گے تو تمہیں نعمتوں کا ایک جہان اور ایک بڑی سلطنت نظر آئے گی۔ ان کے اوپر باریک ریشم کا سبز لباس اور دبیز ریشم کے کپڑے ہوں گے، اور انہیں چاندی کے کنگنوں سے آراستہ کیا جائے گا، اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ (اور فرمائے گا کہ) یہ ہے تمہارا انعام اور تم نے (دنیا میں) جو محنت کی تھی اس کی پوری قدر دانی کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں فرمایا کہ نیکوکار لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس دن کی سختی اور ہولناکی سے بچائے گا، انہیں حسن و جمال عطا فرمائے گا، ان کے چہروں پر نور ہو گا، ان کے دل مسرور ہوں گے۔ یہ لوگ مزین تختوں پر جلوہ افروز ہوں گے، سورج کی حدت و حرارت وہاں نہیں ہو گی اور نہ ہی سخت شدت کی سردی ہو گی۔

ان نیکوکاروں کے قریب سایہ دار جنتی درخت ہوں گے جو ان پر سایہ فگن ہوں گے، ان سایہ دار پھلدار درختوں کے پھل ان کے لیے آسان بنائے جائیں گے، جنتی خدام چاندی کے برتنوں میں کھانے لے کر ان کے گرد گھومیں گے، شراب جن کپوں میں نوش کریں گے وہ شیشے کے ساختہ ہوں گے۔

ان نیکوکاروں کو جنت میں ایسے گلاسوں میں سونٹھ کی آمیزش والی شراب پلائی جائے گی، جنت کے جس چشمے سے یہ نیکوکار پئیں گے اس کا نام سلسبیل ہے۔ ان جنتیوں، ان نیکوکاروں کے ارد گرد ایسے بچے ہمیشہ خدمت کے لیے گھومتے رہیں گے جن کے چہرے موتیوں کی طرح چمکدار ہوں گے۔

نیکوکار جنتی جنت میں جس مکان کو دیکھیں گے وہاں جنت کی ایسی نعمتیں دیکھیں گے جن کی تعریف ناقابل بیان ہے، ایسی بادشاہی وسلطنت ہوگی جس کی وسعت کا عالم ایسا ہوگا جس کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی۔ ان نیکوکار جنتیوں کو ایسا لباس پہنایا جائے گا جس کا اندرون باریک سبز ریشم کا ہوگا جب کہ اس کا ظاہر موٹی ریشم کا ہوگا، انہیں زیورات سے مزین کیا جائے گا، چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، ان ساری نعمتوں کے ساتھ ساتھ اللہ ان نیکوکاروں کو ایسی شراب پلائیں گے جس میں کوئی گندگی اور کوئی میل کچیل نہیں ہوگی۔

نعمت ہائے جنت کے بعد نعمت عظمیٰ کا ذکر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا {۲۳} فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا {۲۴} وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا {۲۵} وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا {۲۶} الانسان

جواب ترجمہ: بلاشبہ ہم نے آپ پر قرآن اتارا تھوڑا تھوڑا کرکے، سو آپ پروردگار کے حکم پر جمے رہیے اور ان میں سے کسی فاسق کافر کی بات نہ مانیے، اور صبح شام اپنے رب کا نام ذکر کیجیے، اور کچھ رات کو بھی اس کے آگے سجدے کیا کرو، اور رات کے لمبے وقت میں اس کی تسبیح کرو۔

اہل جنت کے انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اس انعام عظیم کا تذکرہ فرمایا جو دنیا میں رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا جس کے ذریعے آخرت میں انعامات ملیں گے، یہ انعام قرآن کریم کی تنزیل ہے

تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کو کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اول سے آخر تک بیک وقت پورا نازل نہیں فرمایا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا۔ اس میں آپ کے لیے بھی آسانی ہو گئی اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بھی، تھوڑا تھوڑا کر کے یاد بھی ہو گیا اور جیسے جیسے نازل ہوتا رہا آپ مخاطبین کو پہنچاتے رہے چونکہ قرآن کے پہنچانے پر دشمن تکلیف پہنچاتے تھے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (کہ اپنے رب کے حکم کی ادائیگی میں صبر کے ساتھ لگے رہیے) (تفسیر انوار البیان)

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا: (اور ان لوگوں میں سے کسی فاسق یا کافر کی بات نہ مانیے) یہ لوگ آپ کو تبلیغ سے روکتے ہیں آپ ان کی فرمانبرداری نہ کریں اور تبلیغ کے کام میں لگے رہیں۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا: اس میں یہ بتایا کہ کار دعوت کی مشغولی کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی عبادت میں بھی مشغول رہیں نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص عابد و ذاکر ہو گا۔ تبلیغی کاموں میں اس کی معاونت ہوتی رہے گی اور کام آگے بڑھتا رہے گا۔

دنیا مطلوب اور ہولناک دن نظر انداز

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا {۲۷} الانسان

جواب ترجمہ: یہ لوگ تو (دنیا کی) فوری چیزوں سے محبت کرتے ہیں اور اپنے آگے جو بھاری دن آنے والا، اسے نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔

جو لوگ دین اسلام قبول نہیں کرتے تھے ان لوگوں کا حق سے منہ موڑنا اس لیے ہے کہ انہیں عاجلہ (جلدی والی چیز) یعنی دنیا محبوب اور مطلوب ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اسلام قبول کیا تو دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے نہ جائیداد رہے گی نہ گھر در اور عہدہ بھی جاتا رہے گا، لیکن وہ یہ نہیں

دیکھتے کہ موت کے بعد جو حق قبول نہ کرنے کی سزا ملے گی وہ بہت بڑی ہو گی اور ہمیشہ رہے گی کبھی نہ ٹلے گی یہ ہمیشہ والی سزا جس دن سامنے آئے گی اس دن کی مصیبت کا خیال نہیں کرتے۔

اسی کو فرمایا: وَ يَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا، یہ لوگ اپنے سامنے بڑے بھاری دن کو چھوڑے ہوئے ہیں، در حقیقت دنیا امتحان کی جگہ اور دنیا و آخرت دونوں سوتنیں ہیں، ایک سے محبت کی تو دوسری گئی اور عجیب بات یہ ہے کہ جن کے پاس ذرا سی بھی دنیا نہیں ہے، نہ مال ہے، نہ جاہ، نہ پیسہ، نہ کوڑی، نہ عہدہ، نہ منصب، نہ جاہ، نہ عزت، وہ بھی کفر سے چپکے ہوئے ہیں (انوار البیان)

سورۃ الانسان میں نصیحت آموز باتیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا {۲۸} اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا {۲۹} وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۳۰} يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا {۳۱} الإنسان.

جواب ترجمہ: ہم نے ہی انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں، اور ہم جب چاہیں ان کے بدلے ان جیسے دوسرے پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نصیحت کی بات ہے۔ اب جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ اور تم چاہو گے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور یہ جو ظالم لوگ ہیں ان کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ہی نے انہیں پیدا کیا، ان کی پیدائش کو مضبوط کیا، اور جب ہم چاہیں تو انہیں ہلاکت کی وادی میں اتار دیں اور ان کی جگہ دوسرے ایسے لوگوں کو لے آئیں جو اطاعت گزار

ہوں، اپنے رب کے احکامات کو مانیں اور ان پر عمل کریں۔

وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ: اس میں اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا بیان ہے کہ گوشت اور ہڈی اور کھال سے جو اعضاء بنے ہوئے ہیں یہ رات دن حرکت میں رہتے ہیں اٹھنے بیٹھنے میں مڑتے ہیں، کام کاج میں رگڑے جاتے ہیں لیکن نرم اور نازک ہوتے ہوئے نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں جبکہ لوہے کی مشینیں بھی گھس جاتی ہیں اور بار بار پرزے بدلنے پڑتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے کہ انسانی اعضاء بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کام کرتے رہتے ہیں۔ (انوار البیان)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تم سے ہر شخص کے جوڑوں کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے سو سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور الحمد للہ کہنا صدقہ ہے اور لا اِلٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے اور اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے اور نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے اور دو رکعتیں چاشت کی پڑھ لی جائیں تو وہ اس سب کے بدلہ کا کام دے جاتی ہیں۔

وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، وہ فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو ہم انہیں ہلاک کر دیتے اور ان کی جگہ زیادہ اطاعت شعار لوگوں کو لے آتے انہیں سے یہ بھی مروی ہے ہم ان کے محاسن کو قبیح ترین صورتوں میں بدل دیتے۔

إِنَّ هٰذِهِ تَذْكِرَةٌ: ھذہ سے مراد سورت ہے تذکرہ سے مراد نصیحت ہے، یعنی اس سورت میں دنیا والوں کے لیے نصیحت کا سامان ہے۔

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا: سبیلا سے مراد ایسا راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رضا کی طلب تک پہنچا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے سبیلا سے مراد وسیلہ ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی سمت اور جنت کی طرف جانے والا راستہ ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ: مطلب یہ ہے کہ تم طاعت، استقامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والا راستہ نہیں چاہ سکتے مگر جب اللہ تعالیٰ چاہے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے ہر کام اس کے قبضہ

قدرت میں ہے لوگوں کے قبضہ قدرت میں نہیں کسی کی مشیت نافذ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی آگے ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت مقدم ہوتی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے حالات کو خوب جانتا ہے، وہ اپنی مخلوق کی تدبیروں اور کاموں کی حکمت بہتر جانتا ہے۔

يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ: وہ ذات اپنے بندوں میں سے جسے چاہتی ہے اپنی رحمت اور اپنی رضا میں داخل کر دیتی ہے، اور یہ لوگ اہل ایمان ہیں۔

وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: اہل ایمان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو کفر پر اڑے رہے، ڈٹے رہے، اللہ اور رسول اللہ کی تعلیمات کو تسلیم نہیں کیا، ان ظالموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کو پھلانگا تھا، اپنی مرضی اختیار کی تھی۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج سورۃ الانسان کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم اور احسان عظیم کے ساتھ قبول ومنظور فرمائیں۔

خادم اسلام: محمود الرشید حدوٹی عباسی

حال وارد حدوٹ تحصیل مری

یکم جولائی ۲۰۱۹ھ بروز پیر بوقت سوا چار بجے قبیل صلاۃ الفجر

حروف بینی: ۷ اگست ۲۰۱۹ء بروز بدھ، شب ۳ بجے، حدوٹ، مری

☆☆☆☆

المرسلات

فرشتوں اور ہواؤں کی قسمیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کس چیز کی قسم کھائی اور جواب قسم کیا ہے؟

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۚ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ المرسلات.

جواب ترجمہ: قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو ایک کے بعد ایک بھیجی جاتی ہیں۔ پھر جو آندھی بن کر زور سے چلتی ہیں۔ اور جو (بادلوں کو) خوب اچھی طرح پھیلا دیتی ہیں۔ پھر قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتے ہیں۔ پھر نصیحت کی باتیں نازل کرتے ہیں۔ جو یا تو لوگوں کے لیے معافی مانگنے کا سبب بنتی ہیں یا ڈرانے کا۔ یقیناً وہ واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔

ان آیات میں کس چیز کا بیان کیا گیا ہے، اس میں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے مختلف اقوال نقل فرمائے ہیں، بعض بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ وغیرہ سے تو مروی ہے کہ مذکورہ بالا قسمیں ان اوصاف والے فرشتوں کی کھائی ہیں، بعض کہتے ہیں پہلے کی چار قسمیں تو ہواؤں کی ہیں اور پانچویں قسم فرشتوں کی ہے، بعض نے توقف کیا ہے کہ والمرسلات سے مراد یا تو فرشتے ہیں یا ہوائیں ہیں، ہاں (والعاصفات) میں کہا ہے کہ اس سے مراد تو ہوائیں ہی ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

بعض عاصفات میں یہ فرماتے ہیں اور (ناشرات) میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے، یہ بھی مروی ہے کہ ناشرات سے مراد بارش ہے، بہ ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرسلات سے مراد ہوائیں ہیں، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ (الحجر: ۲۲) اور وہ ہوائیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی

ہیں، ہم نے بھیجی ہیں، پھر آسمان سے پانی ہم نے اتارا ہے، پھر اس سے تمہیں سیر اب ہم نے کیا ہے، اور تمہارے بس میں یہ نہیں ہے کہ تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھ سکو۔

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۴۶)الروم) اور اس (اللہ کی قدرت) کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے جو (بارش کی) خوشخبری لے کر آتی ہیں، اور اس لیے بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا کچھ مزہ چکھائے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے پانی میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو، اور شکر ادا کرو۔

اپنی رحمت سے پیشتر اس کی خوشخبری دینے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ چلاتا ہے، (عاصفات) سے بھی مراد ہوائیں ہیں، وہ نرم ہلکی اور بھینی بھینی ہوائیں تھیں یہ ذرا تیز جھونکوں والی اور آواز والی ہوائیں ہیں۔ ناشرات سے مراد بھی ہوائیں ہیں جو بادلوں کو آسمان میں ہر چار سو پھیلا دیتی ہیں اور جدھر اللہ کا حکم ہوتا ہے انہیں لے جاتی ہیں۔

(فارقات) اور (ملقیات) سے مراد البتہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسولوں پر وحی لے کر آتے ہیں جس سے حق و باطل حلال و حرام میں، ضلالت و ہدایت میں امتیاز اور فرق ہو جاتا ہے تاکہ جس دن تم سب کے سب اول آخر والے اپنی اپنی قبروں سے دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے اور اپنے کرتوت کا پھل پاؤ گے نیکی کی جزا اور بدی کی سزا پاؤ گے، صور پھونک دیا جائے گا اور ایک چٹیل میدان میں تم سب جمع کر دئے جاؤ گے یہ وعدہ یقیناً حق ہے اور ہو کر رہنے والا اور لازمی طور پر آنے والا ہے، اس دن ستارے بے نور ہو کر گر جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ جائیں گے یہاں تک کہ نام نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہاں ان ہواؤں کی قسمیں کھائی ہیں جو لگاتار اور مسلسل چلتی ہیں، اسی طرح ایسی سخت ہواؤں کا ذکر فرمایا جو ہلاک کر ڈالتی ہیں۔ اللہ نے یہاں ان فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جو

بادلوں کو ہانک کر جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں اور ان فرشتوں کا ذکر فرمایا جو اللہ کی طرف سے اترتے ہیں اور حق و باطل کے درمیان فرق کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کا ذکر کیا جو اللہ کی طرف سے وحی لے کر اس کے انبیاء کی طرف تشریف لاتے ہیں، جو اللہ کی طرف سے اس کی مخلوق کو ڈراتے ہیں تاکہ ان کے لیے اتمام حجت ہو جائے۔

پھر ہواؤں اور فرشتوں کی قسمیں کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ جواب قسم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس چیز کا تم سے قیامت کے بارے میں وعدہ کیا جاتا ہے اور جو وہاں حساب کتاب ہو گا اور اس کے بعد جو بدلہ تمہیں ملنے والا ہے وہ لا محالہ مل کر رہے گا۔

قیامت کی ہولناکی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ{۸}وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ{۹}وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ{۱۰}وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ {۱۱} لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ{۱۲}لِیَوْمِ الْفَصْلِ{۱۳}وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ {۱۴}وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ{۱۵}المرسلات.

جواب ترجمہ: چنانچہ (وہ واقعہ اس وقت ہو گا) جب ستارے بجھا دیے جائیں گے۔ اور جب آسمان کو چیر دیا جائے گا۔ اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دئے جائیں گے۔ اور جب پیغمبروں کے جمع ہونے کا وقت آجائے گا۔ (کوئی پوچھے کہ) اس معاملے کو کس دن کے لیے ملتوی کیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ) فیصلے کے دن کے لیے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلے کا دن کیا چیز ہے؟ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور ہواؤں کی قسمیں کھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ قیامت کا واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا، یہاں اس ہولناک منظر کی ایک جھلک اللہ بیان فرمارہے ہیں کہ اس دن ستارے

بے نور ہو کر گر جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ جائیں گے یہاں تک کہ نام نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ذکر فرمایا کہ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (طٰہٰ :۱۰۵) اور وہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، سو آپ فرما دیجئے کہ میرا رب ان کو بالکل اڑا دیگا۔

سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (الکھف :۴۷) اور (اس دن کا دھیان رکھو) جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ وہ کھلی پڑی ہے اور ہم ان سب کو گھیر کر اکٹھا کر دیں گے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

{وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ} اور رسولوں کو جمع کیا جائے گا اس وقت مقررہ پر انہیں لایا جائے گا۔ جس طرح قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے {يَوْمَ يَجْمَعُ اللهُ الرُّسُلَ} (الْمَائِدَةِ:۱۰۹) اس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے شہادتیں لے گا۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کا ایک وقت مقرر فرمایا ہوا ہے جس میں تمام پیغمبر جمع ہو کر اپنی اپنی امت کے بارے میں گواہی دیں گے، یہاں وہی وقت مراد ہے۔ (آسان ترجمہ)

لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ: یہ کافروں کا وہی سوال ہے جو وہ اکثر کیا کرتے تھے کہ اگر عذاب وثواب ہونا ہے تو ابھی کیوں نہیں ہو جاتا، دیر کیا ہے؟ (ایضاً)

لِيَوْمِ الْفَصْلِ: یعنی جانتے ہو؟ ان امور کو کس دن کے لیے اٹھا رکھا ہے؟ اس دن کے لیے جس میں ہر بات کا بالکل اور دوٹوک فیصلہ ہو گا۔ بیشک اللہ چاہتا تو ابھی ہاتھوں ہاتھ ہر چیز کا فیصلہ کر دیتا۔ لیکن اس کی حکمت مقتضی نہیں ہوئی کہ ایسا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس روز لوگوں کے درمیان جنت میں بھیجنے یا جہنم میں بھیجنے کا فیصلہ فرمائے گا، حدیث طیبہ میں ہے إِذَا حُشِرَ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَامُوا أَرْبَعِينَ عَامًا عَلَى رُؤُوسِهِمُ الشَّمْسُ شَاخِصَةً أَبْصَارُهُمْ إِلَى السَّمَاءِ يَنْتَظِرُونَ الْفَصْلَ، جب قیامت کے روز لوگوں کو جمع کیا جائے گا وہ چالیس سال تک اسی طرح کھڑے رہیں گے کہ ان کے سروں پر سورج ہو گا ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوں گی وہ فیصلہ کے انتظار میں ہوں گے۔ (قرطبی)

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ: فعل تعجب اظہار تعجب کے لیے ہے یہ تعجب بالائے تعجب یوم الفصل کی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یوم الفصل عظیم الشان چیز ہے تم کو اس کی حقیقت معلوم نہیں، نہ اس کی مثل کوئی دن تم نے دیکھا۔ (تفسیر مظہری)

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ: جو اللہ تعالیٰ اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور یوم قیامت کو جھٹلائے اس کے لیے عذاب ہے اور رسوائی ہے یہ وعید ہے اس سورت میں ہر آیت میں جھٹلانے والوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کے حساب سے ان کے درمیان عذاب کو تقسیم کر دیا، کیونکہ ایک شے کو جھٹلانے والے کے لیے ایک عذاب ہے جو دوسری چیز کے جھٹلانے والے کے عذاب سے مختلف ہے کیونکہ بعض چیزوں کی تکذیب جرم میں دوسری شے کی تکذیب سے بڑھ کر ہوتی ہیں کیونکہ وہ تکذیب میں بہت ہی قبیح اور اللہ تعالیٰ کا رد کرنے میں بڑھ جاتی ہیں تو ہلاکت اسی حساب سے ان پر تقسیم کی جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، جَزَاءً وِفَاقاً. (النبأ: ٢٦) موافق جزا۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ وَيْلٌ: وَادٍ فِي جَهَنَّمَ فِيهِ أَلْوَانُ الْعَذَابِ ویل جہنم میں ایک وادی ہے اس میں کئی قسم کے عذاب ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا، إِذَا خَبَتْ جَهَنَّمُ أُخِذَ مِنْ جَمْرِهِ فَأُلْقِيَ عَلَيْهَا فَيَأْكُلُ بَعْضُهَا بَعْضًا، جب جہنم ٹھنڈی ہو جائے گی تو اس کا ایک انگارہ لیا جائے گا اسے اس جہنم پر پھینکا جائے گا تو اس کا بعض بعض کو کھا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، عُرِضَتْ عَلَيَّ جَهَنَّمُ فَلَمْ أَرَ فِيهَا وَادِيًا أَعْظَمَ مِنَ الْوَيْلِ مجھ پر جہنم پیش کی گئی تو میں نے ویل سے بڑھ کر کوئی وادی نہیں پائی۔ ایک روایت یہ کی گئی ہے کہ أَنَّهُ مَجْمَعُ مَا يَسِيلُ مِنْ قَيْحِ أَهْلِ النَّارِ وَصَدِيدِهِمْ، یہ جہنمیوں کی پیپ کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بندے جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بری جگہیں وہ ہوتی ہیں جہاں مرداروں اور حماموں کے پانیوں میں سے گندگیاں جمع ہوتی ہیں۔ یہ ذکر کیا گیا ہے وہ وادی ایسی ہے جہاں کفار اور مشرکوں کی پیپ جمع ہو جاتی ہے تاکہ دانش مند جان لیں اس سے بڑھ کر کوئی چیز گندی نہیں، اس سے زیادہ کوئی چیز بدبودار نہیں، اس سے بڑھ کر کوئی چیز کڑوی نہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز سیاہ نہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کی صفت اس عذاب سے بیان کی جس کو یہ وادی متضمن ہے کہ وہاں جہنم میں سب سے بڑی وادی ہے اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس وعید کا ذکر کیا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

مجرموں کی ہلاکت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ {۱۶} ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ {۱۷} كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ {۱۸} وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۱۹} المرسلات

جواب ترجمہ: کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے بعد والوں کو بھی چلتا کر دیں گے۔ ایسا ہی سلوک ہم مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک گزشتہ امتوں میں سے جن کفار کو ہلاک کیا گیا اس کی خبر دی جا رہی ہے پھر ہم بعد والوں کو پہلوں کے ساتھ ملا دیں گے جس طرح ہم نے پہلے لوگوں

کے ساتھ کیا ہم قریش کے مشرکوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے یا تو تلوار کا وار کر کے یا ہلاک کر کے۔

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ: مراد اس سے یہ ہے کہ رسولوں کے اوقات کے مختلف ہونے کے ساتھ اس نے مختلف قوموں کو یکے بعد دیگرے ہلاک کیا۔

كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ: یعنی اس ہلاکت کی طرح ہم ہر مشرک کے ساتھ کریں گے، ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنیٰ ہے دنیا میں ان کی ہلاکت کی ہولناکی بیان کی جارہی ہے۔ تاکہ عبرت دلائی جائے ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ آخرت میں ان کے عذاب کی خبر دی جارہی ہے۔ (تفسیر قرطبی)

انسانی پیدائش

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ یہاں ماء مھین، قرار مکین، قدر معلوم اور فقدرنا کا کیا معنیٰ ہے؟

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ {۲۰}فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ {۲۱}اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ {۲۲} فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ {۲۳}وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۲۴}المرسلات.

جواب ترجمہ: کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط قرار کی جگہ میں رکھا۔ مقررہ وقت تک۔ پھر ہم نے توازن پیدا کیا، چنانچہ اچھا توازن پیدا کرنے والے ہم ہیں۔ بڑی خرابی ہوگی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

یہ منکرین قیامت کے اس شبہ کا جواب ہے جو مرکھپ اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے متعلق وہ ظاہر کرتے۔ ان کو براہ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے حقیر پانی کی ایک بوند سے تم کو پیدا کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا تو جب تم خود اپنے وجود کے اندر علانیہ مشاہدہ کرتے ہو کہ تمہارے خالق نے حقیر پانی کی ایک بوند کو انسان بنا کے کھڑا کر دیا تو تمہارے مرکھپ جانے کے بعد اگر وہ تمہیں از سر نو

پیدا کرنا چاہے تو یہ کام اس کے لئے کیوں ناممکن یا مشکل ہو جائے گا۔ پہلی بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار!(تفسیر تدبر قرآن)

فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ: اس سے مراد ماں کا پیٹ ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کا مطلب رحمِ مادر (ماں کا پیٹ) قرار دیتے ہیں۔ **(إِلَىٰ قَدَرٍ مَعْلُومٍ)** مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ قدر معلوم سے مراد اس وقت تک ہے جب تک اس کی تصویر بنادیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ولادت تک کا وقت ہے۔

فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ: جس نے فعل کو مشدد پڑھا ہے وہ قادرون کو تقدیر سے مشتق مانتا ہے یعنی ہم نے شقی اور سعید کو مقدم کیا ہم کتنے اچھے مقدر کرنے والے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے اسے لمبا اور چھوٹا مقدر کیا۔(قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے ہم اس کے مالک ہوتے تو ہم کتنے اچھے مالک ہوتے۔ دونوں کلمات نے مختلف معانی دیے یعنی ہم نے ولادت اور نطفہ کے احوال کو مقدر کیا جب وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ مکمل انسان بن جاتا ہے، یا بدبخت اور سعادت مند بن جاتا ہے یا لمبا اور چھوٹا ہو جاتا ہے، یہ سب تشدید کے طریقہ پر ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے، دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا۔(تفسیر قرطبی)

ماء مھین سے مراد کمزور پانی ہے، جسے منی کہا جاتا ہے، قرار مکین کا معنیٰ رحم مادر ہے، قدر معلوم کا معنیٰ ولادت کا وقت ہے، فقدرنا کا معنیٰ ہم نے اسے پیدا کیا، ہم نے اس کی شکل وصورت بنائی، ہم اسے باہر لائے۔

زمین، پہاڑ، پانی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا {۲۵}اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا {۲۶}وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا {۲۷}وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۲۸} المرسلات

جواب ترجمہ: کیا ہم نے زمین کو ایسا نہیں بنایا کہ وہ سمیٹ کر رکھنے والی ہے۔ زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی؟ اور ہم نے اس میں گڑھے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ پیدا کیے، اور تمہیں میٹھے پانی سے سیراب کرنے کا انتظام کیا۔ بڑی خرابی ہوگی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو جمع کرنے والی، زندوں کو روئے زمین پر اور مردوں کو اس کے بطن میں۔ (قرطبی)

یہ اس امر پر دلالت ہے کہ میت کو چھپانا، اسے دفن کرنا، اس کے بالوں کو دفن کرنا اور وہ تمام چیزیں جن کو وہ اپنے جسم سے الگ کرتا ہے دفن کرنا اور اس میں چھپانا واجب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، قُصُّوا أَظَافِرَكُمْ وَادْفِنُوا قُلَامَاتِكُمْ، اپنے ناخن کاٹو اور کٹے ہوئے ناخن زمین میں دفن کر دو۔ امام شعبی رحمہ اللہ ایک جنازہ میں نکلے آپ نے ایک قبرستان دیکھا فرمایا، یہ مردوں کو جمع کرنے والے برتن ہیں، پھر گھروں کی طرف دیکھا اور فرمایا، یہ زندوں کو جمع کرنے والے برتن ہیں۔ (قرطبی)

مستنبطہ مسائل: ایک کفن چور کے بارے میں ربیع سے پوچھا گیا، کہا اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، ان سے پوچھا گیا، آپ نے یہ بات کیوں کی؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو جمع کرنے والا نہیں بنایا۔ زمین محفوظ جگہ ہے۔

لوگ بقیع غرقد کو کفتہ کہتے ہیں کیونکہ یہ قبرستان ہے جو مردوں کو جمع کرتا ہے۔ زمین زندوں کو ان کے گھروں میں جمع کرتی ہے اور مردوں کو ان کی قبروں میں جمع کرتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے لوگ روئے زمین پر قرار پذیر ہوتے ہیں پھر زمین پر پہلو کے بل لیٹتے ہیں ان میں سے کچھ اس کے ساتھ مل

جاتے ہیں، ایک قول یہ کیا گیا: یہ زندوں کے برتن ہیں یعنی جو انسانی فضلات نکلتے ہیں زمین میں دفن کر دیے جاتے ہیں لوگوں کا اس کے اوپر ہونا اس میں ملانے کا کوئی تصور نہیں۔

احیاء اور اموات کا مرجع ارض ہے یعنی زمین دو قسموں پر منقسم ہے زندہ جو فصل اگاتی ہے، مردہ جو کوئی چیز نہیں اگاتی۔ فراء نے کہ، احیاء اور امواتا اس وجہ سے منصوب ہے کہ یہ کفات کے مفعول بہ ہیں معنی یہ ہو گا کہ کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردہ جمع کرنے والا نہیں بنایا جب تو انہیں تنوین دے گا تو تو انہیں نصب دے گا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (۱۴) يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ یا بھوک والے دن یتیم کو کھانا کھلائے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ الارض سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی زمین میں سے کچھ اس طرح اور کچھ اس طرح۔ اخفش نے کہا، کفاتا یہ کافتہ کی جمع ہے، الارض سے مراد جمع ہے اس وجہ سے جمع کے ساتھ اس کی لغت بیان کی جاتی ہے، خلیل نے کہا، تکفیت کا معنی کسی شے کو الٹ دینا، ظاہر کو باطن بنا دینا، اور باطن کو ظاہر بنا دینا، یہ جملہ بولا جاتا ہے، اِنکَفَتِ القَومُ اِلَی مَنَازِلِھم، لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ کفات کا معنی یہ ہو گا وہ زمین کے اوپر تصرف کرتے ہیں اور اس کی طرف پلٹ آتے ہیں اور انہیں اس میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ (قرطبی)

وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ: ھا ضمیر کا مرجع زمین ہے، رواسی سے مراد پہاڑ ہیں، رواسی سے مراد ثبت ہیں، شامخات سے مراد لمبے ہیں اس معنی میں کہا جاتا ہے، شمخ بانفہ، جب وہ تکبر کرتے ہوئے اپنے ناک کو اوپر اٹھائے۔

وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا: اور ہم نے تمہارے لیے پانی بنا دیا ہے فرات سے مراد میٹھا پانی ہے جس کو پیا جاتا ہے اور اس سے کھیتی سیراب کی جاتی ہے، یعنی ہم نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور میٹھا پانی نازل کیا یہ امور دوبارہ اٹھائے جانے سے زیادہ عجیب ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، فِي

الْأَرْضِ مِنَ الْجَنَّةِ الْفُرَاتُ وَالدِّجْلَةُ وَنَهَرُ الْأُرْدُنِّ، زمین میں جنت سے فرات، دجلہ اور نہر اردن ہے۔ صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے، سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ وَالنِّيلُ وَالْفُرَاتُ كُلٌّ مِنْ أَنْهَارِ الجنة، سیحون، جیحون، نیل اور فرات سب جنت کے دریا ہیں۔ مسلم، قرطبی)

جہنم کے شعلے سیاہ اونٹ اور دہکتا تانبا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ {۲۹} اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ {۳۰} لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ {۳۱} اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ {۳۲} كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ {۳۳} وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۳۴} المرسلات.

جواب ترجمہ: (ان سے کہا جائے گا کہ) چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اس سائبان کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ جس میں نہ تو (ٹھنڈک والا) سایہ ہے، اور نہ آگ کی لپیٹ سے بچا سکتا ہے۔ وہ آگ تو محل جیسے بڑے بڑے شعلے پھینکے گی۔ ایسا لگے گا جیسے وہ زرد رنگ کے اونٹ ہوں۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

جو کفار قیامت، جزا سزا اور جنت دوزخ کو جھٹلاتے تھے ان سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ لو جسے سچا نہ مانتے تھے وہ سزا اور وہ دوزخ یہ موجود ہے اس میں جاؤ، اس کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اونچے ہو ہو کر ان میں تین پھانکیں کھل جاتی ہیں، تین حصے ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی دھواں بھی اوپر کو چڑھتا ہے جس سے نیچے کی طرف چھاؤں پڑتی ہے اور سایہ معلوم ہوتا ہے لیکن فی الواقع نہ تو وہ سایہ ہے نہ آگ کی حرارت کو کم کرتا ہے یہ جہنم اتنی تیز تند سخت اور بہ کثرت آگ والی ہے کہ اس کی چنگاریاں جو اڑتی ہیں وہ بھی مثل قلعہ کے اور تناؤ درخت کے مضبوط لمبے چوڑے تنے کے ہیں، دیکھنے والے کو یہ لگتا ہے کہ گویا وہ سیاہ رنگ اونٹ ہیں یا کشتیوں کے رسے ہیں یا تانبے کے ٹکڑے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ كُنَّا نَعْمِدُ إِلَى الْخَشَبَةِ ثَلَاثَةَ أَذْرُعٍ وَفَوْقَ ذَلِكَ، فَنَرْفَعُهُ لِلشِّتَاءِ، فَنُسَمِّيهِ الْقَصَرَ (تفسیر ابن کثیر) ہم جاڑے کے موسم میں تین تین ہاتھ کی یا کچھ زیادہ لمبی لکڑیاں لے کر انہیں بلند کر لیتے اسے ہم قصر کہا کرتے تھے۔ کشتی کی رسیاں جب اکٹھی ہو جاتی ہیں تو خاصی اونچی قد آدم کے برابر ہو جاتی ہیں، اسی کو یہاں مراد لیا گیا ہے، ان جھٹلانے والوں پر حسرت وافسوس ہے۔

قیامت کے مختلف احوال

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ {۳۵}وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ {۳۶}وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۳۷}المرسلات

جواب ترجمہ: یہ ایسا دن ہے جس میں یہ لوگ بول نہیں سکیں گے۔ اور نہ انہیں اس بات کی اجازت ہو گی کہ وہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کی بے بسی کا ذکر فرما رہے ہیں کہ بروز محشر یہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ انہیں عذر و معذرت کرنے کی اجازت ملے گی کیونکہ ان پر حجت قائم ہو چکی اور ظالموں پر اللہ کی بات ثابت ہو گئی اب انہیں بولنے کی اجازت نہیں، یہ یاد رہے کہ قرآن کریم میں ان کا بولنا مکرنا چھپانا عذر کرنا بھی بیان ہوا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ حجت قائم ہونے سے پہلے عذر معذرت وغیرہ پیش کریں گے جب سب توڑ دیا جائے گا اور دلیلیں پیش ہو جائیں گی تو اب بول چال عذر معذرت ختم ہو جائے گی، غرض میدان حشر کے مختلف مواقع اور لوگوں کے مختلف مواقع اور لوگوں کی مختلف حالتیں ہیں کسی وقت یہ کسی وقت وہ، اسی لئے یہاں ہر کلام کے خاتمہ پر جھٹلانے والوں کی خرابی کی خبر دے دی جاتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

عبد اللہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا مجھے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں بتایئے یعنی هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ، یہ وہ دن ہے جس میں بات بھی نہ کر سکیں گے اور نہ انہیں عذر کرنے کی اجازت ہو گی۔ تو فرمایا کہ یہ قیامت کا وہ دن ہے جس میں مختلف حالات ہوں گے کسی حال میں وہ نہیں بول سکیں گے۔ اور کسی حالت میں وہ بولیں گے اور کسی حال میں کہ وہ عذر پیش کریں گے میں تم کو کوئی بات نہیں بتاؤں گا مگر وہ بات جو ہم کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی پھر فرمایا

إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَنزِلُ الْجَبَّارُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَكُلُّ أُمَّةٍ جَاثِيَةٍ فِي ثَلَاثَةِ حُجُبٍ مَسِيرَةُ كُلِّ حِجَابٍ خَمْسُونَ أَلْفَ سَنَةٍ حِجَابٌ مِّن نُورٍ وَحِجَابٌ مِّن ظُلْمَةٍ وَّحِجَابٌ مِّن مَّاءٍ لَا يَرَى لِذَلِكَ فَيَأْمُرُ بِذَلِكَ الْمَاءَ فَيَعُودُ فِي تِلْكَ الظُّلْمَةِ وَلَا تَسْمَعُ نَفْسٌ ذَلِكَ الْقَوْلَ إِلَّا ذَهَبَتْ فَعِنْدَ ذَلِكَ لَا يَنطِقُونَ

جب قیامت کا دن ہو گا، تو جبار مطلق بادل کے سائے میں نازل ہوں گے۔ اور ہر امت تین پردوں میں دوزانو بیٹھے گی۔ ہر پردے کا فاصلہ پچاس ہزار سال کا ہو گا، ایک پردہ نور کا ہے اور ایک پردہ ظلمت کا اور ایک پردہ پانی ہو گا، اس وجہ سے کوئی دکھائی نہیں دے گا، تو اس وجہ سے وہ پانی کو حکم دے گا تو وہ اس اندھیرے میں لوٹ جائے گا، کوئی نفس اس بات کو نہیں سن سکے گا مگر یہ کہ وہ ہٹ جائے گا اسی لیے اس وقت وہ نہیں بول سکیں گے۔ (ابن مردویہ، در منثور)

نافع بن ازرق رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کے بارے میں پوچھا هٰذَا يَوْمَ لَا يَنطِقُونَ} و (فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا) پھر تو پاؤں کی آہٹ کے سوا کچھ نہیں سنے گا۔ أَقْبَلَ بَعْضُهم عَلَى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُونَ، اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھے گا (هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَه) سو وہ کہے گا لو میرا اعمال نامہ پڑھ لو، یہ سب کیا ہے؟ فرمایا، افسوس ہے تجھ پر کیا مجھ سے پہلے کسی سے اس بارے میں سوال کیا؟

نافع بن ازرق رحمہ اللہ نے کہا نہیں، فرمایا بلاشبہ اگر تو سوال کرتا تو ہلاک ہو جاتا، کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ اور ایک دن تیرے رب کے نزدیک ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو نافع نے کہا کیوں نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ ان دنوں میں سے ہر دن کی مقدار کے لیے مختلف احوال میں سے ایک حالت اور ایک رنگ ہے۔ (حاکم، در منثور)

منکرین انبیاء علیہم السلام کا حشر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْأَوَّلِيْنَ {٣٨} فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ {٣٩} وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {٤٠} المرسلات.

جواب ترجمہ: یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمہیں اور پچھلے لوگوں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اب اگر تمہارے پاس کوئی داؤ ہے تو مجھ پر وہ داؤ چلا لو۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں کہا جائے گا، یہ وہ دن ہے جس میں مخلوقات کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور حق پرست باطل پرست سے ممتاز ہو جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا جَمَعَ الَّذِينَ كَذَّبُوا مُحَمَّدًا وَالَّذِينَ كَذَّبُوا النَّبِيِّينَ مِنْ قَبْلِهِ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والوں اور آپ سے قبل کے انبیاء کو جھٹلانے والوں کو جمع کرے گا۔

(فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ) اگر تمہارے پاس ہلاکت سے خلاصی کی کوئی صورت ہے تو اپنے لیے کوئی حیلہ کرو اور مجھ سے قوت میں مقابلہ کر لو تم ہرگز اس کو نہ پاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے، اگر تم جنگ پر قادر ہو تو مجھ سے جنگ کرو، تم دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کیا کرتے تھے اور مجھ سے جنگ کیا کرتے تھے آج تم مجھ سے جنگ کرو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے تم دنیا میں نافرمانی کیا کرتے تھے آج تم اس سے عاجز آچکے ہو اور اپنا دفاع کرنے سے بھی عاجز آچکے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ نبی کریم ﷺ کے قول کی حکایت ہے تو یہ حضرت ہود علیہ السلام کے قول کی طرح ہو گا تم میرے ساتھ خفیہ تدبیر کرلو پھر تم مجھے مہلت نہ دینا۔

مومن عرش وجنت کے سایہ میں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ {۴۱}وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ {۴۲}كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ{۴۳}إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ{۴۴}وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۴۵} المرسلات

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے تقوی اختیار کیا، وہ بیشک سایوں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔ اور اپنے من پسند میوؤں کے درمیان۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) مزے سے کھاؤ، اور پیو ان اعمال کی بدولت جو تم کیا کرتے تھے۔ ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

یہاں اس چیز کے بارے میں خبر دی ہے جس کی طرف متقی لوٹیں گے، ظلل سے مراد درختوں اور محلات کے سائے ہیں یہ اس سایہ کی جگہ ہوں گے جو تین شاخوں والا ہو گا، سورۃ یاسین میں ہے، هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِؤُوْنَ وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں ہوں گی پلنگوں پر ٹیک لگائے ہوئے۔ ان کے لیے وہ پھل ہوں گے جس کی تمنا کریں گے۔

جنت میں وہ سائے میں ہوں گے۔ کھاؤ پیو یعنی متقین کو آخرت میں یہ کہا جائیگا جب کہ مشرکین کو کہا جائے گا اگر تم کوئی حیلہ کرسکتے ہو تو حیلہ کرو۔ (قرطبی)

وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ: اس سے لذّت اٹھاتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اہل جنت کو ان کے حسب مرضی نعمتیں ملیں گی بخلاف دنیا کے کہ یہاں آدمی کو جو میسر آتا ہے اسی پر راضی ہونا پڑتا ہے

اور اہل جنت سے کہا جائے گا۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: یہ ان کو خوش خبری دی جائے گی کہ اب چین سے کھاؤ پیو، تمہارا یہ کھانا پینا راس آنے والا اور ہر غل و غش سے پاک ہو گا، یہ تمہارے ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے دنیا میں کئے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ ناشکروں نے دنیا میں جو کھایا پیا وہ ان کے لئے آخرت میں راس آنے والا نہیں بنے گا بلکہ وہ ان کے لئے تباہی کا سبب ہو گا اس لئے کہ انہوں نے اس کھانے پینے کا حق نہیں ادا کیا لیکن تمہارا یہاں کھانا پینا راس آنے والا بنے گا اس لئے کہ تم اپنے حقوق و فرائض سے سبکدوش ہو کر آئے ہو۔ هَنِيئًا کے معنی راس آنے اور ساز گار ہونے کے ہیں۔ یہ مفعول سے حال پڑا ہوا ہے جو فعل سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ (تدبر قرآن)

إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ: محسنین سے مراد بھی متقی ہی ہیں۔ یوں احسان میں تقویٰ سے زیادہ خصوصیت ہے کیونکہ احسان کا معنی ہے اللہ کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اگر عبادت کرنے والے کو خدا نظر نہیں آتا۔ تو خدا بہر حال اس کو دیکھتا ہے حضرت جبریل علیہ السلام کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے احسان کا یہی معنیٰ بیان فرمایا تھا۔ (بخاری و مسلم)

مگر احسان کا یہ معنی آیت میں مراد نہیں ہے ورنہ اعلیٰ کی تشبیہ ادنی سے لازم آئے گی (اور آیت کا مطلب یہ نکلے گا کہ ہم متقیوں کی طرح محسنوں کو بھی ثواب دیتے ہیں) آیت میں مرتبہ احسان حاصل کرنے کی (در پردہ) ترغیب ہے۔

کافروں کے لیے عارضی لذت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ {۴۶} وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ {۴۷} المرسلات

جواب ترجمہ: (اے کافرو) کچھ وقت کھالو، اور مزے اڑالو۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔

یوں گویا ہم آخرت کے میدان میں دنیا کی فلم دیکھ رہے ہیں اور یہ جھلک ہمیں صرف دو فقروں میں دکھائی جاتی ہے۔ گویا ہم اپنی آنکھوں سے یہ جھلکیاں دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ دنیا وآخرت میں طویل عرصے ہیں، آخرت میں یہ خطاب متقین کو تھا، جبکہ دنیا میں یہ مجرمین کے لئے ہے اور زبان حال سے یہ کہا جارہا ہے کہ دیکھو کس قدر فرق ہو گا دونوں کے حالات میں۔ کہ ایک گروہ اس مختصر زمانے میں خوب کھاپی رہا ہے اور طویل زمانوں کے لئے پھر محروم ہو گا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کلام کو متقین کے متعلق کلام سے قبل کلام کی طرف پھیرا جائیگا، یہ کلام وعید اور دھمکی ہے یہ المکذبین سے حال ہے مطلب یہ ہو گا کہ جس وقت انہیں یہ کہا جائیگا اس وقت ان کے لیے ہلاکت ثابت ہو گی کیونکہ تم مجرم ہو یعنی کافر ہو تم ایسا عمل (شرک وکفر) کرنے والے ہو جو تمہیں آخرت میں نقصان پہنچائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

کافر کس بات پر ایمان لائیں گے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ {۴۸} وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۴۹} فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ {۵۰} المرسلات

جواب ترجمہ: اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے آگے جھک جاؤ، تو یہ جھکتے نہیں ہیں۔ بڑی خرابی ہو گی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ اب اس کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟

امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۔ اور جب ان سے کہا جاتا تھا کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہ کرتے تھے۔ یہ آیت قبیلہ بنو ثقیف کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر در منثور) مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آیت وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا

یَرْکَعُونَ سے نماز پڑھنا مراد ہے یعنی جب ان سے نماز پڑھنے کو کہا جاتا تھا تو وہ نماز نہ پڑھتے تھے۔(عبد بن حمید، ابن جریر، در منثور)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ سے مراد ہے کہ تم پر لازم ہے اچھی طرح رکوع کرنا کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک درجہ ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھتا ہے اور رکوع نہیں کرتا گویا کہ وہ بدکنے والا اونٹ ہے تو فرمایا اگر یہ شخص اسی حالت میں مر گیا تو یہ اسلام میں کسی طریقے پر نہیں مرے گا(عبد بن حمید)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھتا ہے اور رکوع نہیں کرتا اور دوسرا آدمی اس کی چادر کو کھینچ رہا ہے۔ ان کو دیکھ کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہنس پڑے لوگوں نے پوچھا اے ابن مسعود! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ فرمایا مجھے دو آدمیوں نے ہنسا دیا۔ ان میں سے ایک کی طرف تو اللہ تعالیٰ رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور دوسرے کی اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرمائیں گے۔ (در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بات انہیں آخرت میں کہی جائے گی جب انہیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی تو وہ اس کی طاقت نہ رکھیں گے قتادہ نے کہا، یہ دنیا میں ہو گا۔ ابن عربی نے کہا، یہ آیت اس امر پر حجت ہے کہ رکوع واجب ہے اور نماز میں یہ رکن ہے اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ انہیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی تاکہ دنیا میں لوگوں کا جو حال تھا وہ عیاں ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا کرتا تھا وہ سجدہ کر سکے گا، جو ریاکاری کے طور پر سجدہ کیا کرتا تھا تو اس کی پشت سیدھی ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب انہیں کہا جائے گا حق کے لیے جھکو تو وہ نہ جھک سکیں گے یہ نماز اور دوسرے امور میں عام ہے نماز کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ توحید کے بعد وہ شرائع کی اصل ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ نماز ایمان کے بغیر درست نہیں۔(قرطبی)

کافر دیکھ رہے ہیں اور انہیں اس خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا اور ڈرایا جا رہا ہے۔ اگر یہ اس انداز کلام سے متأثر نہیں ہوتے جس سے پہاڑ بھی ہل جاتے ہیں اور جمادات کے اندر بھونچال برپا ہو جاتا

ہے، تو اس کے بعد ان پر کوئی کلام کارگر نہیں ہو سکتا، گویا یہ لوگ نہایت شقی، بدبخت اور برے انجام تک پہنچنے والے ہیں اور ان کی قسمت میں ہلاکت لکھی ہوئی ہے اور ان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہے۔

یہ پوری سورت اپنے مضامین، اپنے انداز تعبیر، اپنے الفاظ کے ترنم، اپنے خوفناک مشاہد و مناظر اور اپنے چبھنے والے تیز اشارات کی وجہ سے اس قدر مؤثر ہے کہ کوئی دل اس کے مقابلے میں اپنی جگہ ٹھہر نہیں سکتا، کوئی وجود متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، سخت سے سخت دل بھی پگھل جاتا ہے لیکن ان لوگوں پر اگر یہ سورت بھی کارگر نہیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ! سبحان اللہ، کیا کلام ہے یہ قرآن! کس قدر مضبوط گرفت ہے اس کی۔ کس قدر قوت ہے اس میں۔ (فی ظلال القرآن)

الحمدللہ، رات کے اس دو تہائی حصہ گزرنے کے بعد آج سورۃ المرسلات کی تفسیر مکمل ہو گئی ہے، اسی کے ساتھ معارف الفرقان کی چودھویں جلد اختتام پذیر ہوئی ہے، انتیسواں پارہ مکمل ہو چکا ہے، اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ ان شاء اللہ پندرہ جلدوں میں قرآن کریم کی تفسیر مکمل ہو جائے گی، اس سے پہلے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ معارف الفرقان کتنی جلدوں میں مکمل ہو گی، ہر جلد کے بعد یہی سمجھتا تھا کہ اب اگلی جلد پر مکمل ہو جائے گی، مگر مضامین کا سلسلہ پھیلتا رہا اور جلدیں آگے بڑھتی رہیں، میری بھی شبانہ روز کی مصروفیات میں کامل یکسوئی اور دلجمعی سے یہ صدقہ جاریہ کا کام آگے بڑھتا رہا، جس پر میں اپنے اللہ کی بارگاہ میں کلمات تشکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے یہ عظیم الشان کام کرنے کی توفیق دی، اللہ سے آئندہ بھی امید ہے کہ وہ مالک الملک میری دستگیری اور یاوری فرمائے گا۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی عباسی

حال وارد حدوٹ، مری

۲ جولائی ۲۰۱۹ء بروز منگل، بوقت ایک بجے شب

حروف بینی: ۷ اگست ۲۰۱۹ء بروز بدھ، بوقت ۴ بجے صبح صادق